

مولانا برکت اللہ بھوپالی

از: سید عابد علی وجدی الحسینی

تاریخِ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں
اِک معرکۂ دار و رسن ہم نے کیا ہے

انقلابی سوانح

مولانا برکت اللہ بھوپالی

تالیف

سیّد عابد علی وجدی الحسینی

(شہر قاضی بھوپال)

مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال

MAULANA BARKAT ULLAH BHOPALI :
SYED ABID ALI WAJDI-UL-HUSAINI

سنہ اشاعت : ۱۹۸۶ء

پہلا ایڈیشن : ایک ہزار
قیمت : اٹھائیس روپے

سرورق عمل : شہناز عمرانی

سلسلۂ مطبوعات مدھیہ پردیش اردو اکادیمی : ۴۱

سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکادیمی نے ایچ۔ ایس۔ آفسٹ ورکس دلّی میں چھپوا کر
دفتر مدھیہ پردیش اردو اکادیمی ڈی ۴/۱ پروفیسرز کالونی بھوپال سے شائع کیا۔

پیش لفظ

اردو ہندوستان کی زبانوں میں ایک بہت اہم اور طاقت ور زبان ہے جو اپنے لب و لہجے کی تونگری اور شیرینی کے باعث ہر دلعزیز اور مقبولِ عام ہے اس زبان کی اپنی ایک تہذیب اور اپنی ایک عظیم الشان روایت اس ملک کے طول و عرض میں رہی ہے۔

ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح مرکزی اور ریاستی حکومتیں اردو کی ترقی اور ترویج کے لیے بھی کوشاں ہیں اور اپنے اپنے دائرۂ کار اور وسائل کے مطابق عمل کر رہی ہیں۔ اس زبان کی ہمہ گیر ترقی کے لیے اُن ریاستوں میں جہاں اردو بولنے اور پڑھنے والوں کی معقول تعداد ہے، اردو اکیڈمیاں قائم کی گئیں۔ مدھیہ پردیش بھی اُن ریاستوں میں شامل ہے جہاں باقاعدہ ریاستی اردو اکادمیاں برسرِ عمل ہیں۔

اردو زبان و ادب کی ہمہ جہتی ترقی کے علاوہ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے مقاصد میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس صوبے کے ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور دیگر مصنفوں کی کتابیں بہ اہتمام شائع ہو کر منظرِ عام پر آئیں۔ اس امر کے لیے اکادمی مصنفوں کی دو طرح معاونت کرتی ہے۔ اوّل یہ کہ وہ ادیب جو اپنی تصانیف کی خود اشاعت کرنا چاہتے ہیں، انھیں معقول مالی تعاون دیتی ہے، دوسرے یہ کہ اکادمی کتابوں کی اشاعت کا خود بھی منصوبہ رکھتی ہے جس کے تحت صوبے کے بعض مصنفوں کی کتابیں اکادمی کی طرف سے شائع کی جاتی ہیں۔ ان دونوں امور کا فیصلہ ماہرین پر مشتمل کمیٹی کی رائے کے مطابق کیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب اکادمی کے اپنے اشاعتی منصوبے کا ایک حصہ ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اردو حلقوں میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

فضل تابش

سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکادمی

فہرست

باسمہٖ تعالیٰ

دیباچہ

حامداً و مصلیاً و مسلماً

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی تاریخ چاند، سورج اور ستاروں، سیّاروں، سمندروں اور پہاڑوں سے تو زیادہ قدیم اور پرانی نہیں ہے لیکن کتابِ کائنات کا ہر صفحہ انسانی تاریخ کی قدامت پر گواہی دے رہا ہے۔ کائنات کی تاریخ خدا کے قانونِ جبر کی زنجیروں میں جکڑ بند ہونے کی بنا پر ایک محدود و مختصر تاریخ ہے لیکن انسانی تاریخ انسان کے خود اختیارانہ انقلابی کارناموں کی وجہ سے تغیّر پذیر رنگا رنگ احوال و واقعات اور نوع بہ نوع حادثات کا آئینہ خانہ ہے چونکہ خالقِ فطرت نے اس آسمانی شہزادہ (انسان) کے لئے اس ارضی محفل کو رنگ برنگ کی آیاتِ کائنات اور طرح طرح کی مخلوقات سے آراستہ کر کے اپنی تخلیقی قدرت کا جلوہ گاہ بنایا اور پھر خدا کے اس خلیفہ نے اپنی تسخیری صلاحیتوں سے اس خاموش دنیا کو پُر شور دنیا اور اپنی غیر معمولی ہنگامہ آرائیوں کا ایک زبردست جولان گاہ اور میدان بنا دیا۔ اس لئے انسان کی ان عملی کارروائیوں سے کرۂ ارضی میں ایک ہلچل پیدا اور ایک زلزلہ برپا ہو گیا۔ چنانچہ اس نے زمین کے چپّہ چپّہ پر اپنے اعمال کے نقش و نگار ثبت کر دیئے اس طرح بنی نوع انسان کا قافلہ جب آگے بڑھتا چلا گیا تو ہر قبیلہ اور ہر قوم نے اپنے اوپر گزرے ہوئے واقعات اور شادی و غمی اور فتح و شکست کے غیر معمولی حالات کو لوحِ

حافظہ میں ابتداءً محفوظ رکھا پھر وہ واقعات و حالات صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوئے۔ عوام کے ذہن کے خزانے کی یادداشتیں نسلاً بعد نسلٍ قلمی مخطوطات وتحریرات کے ذریعہ باقی رہیں اور آثار مضبوطہ اور مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے تصویری نقوش کی صورت میں جو چیزیں دستیاب ہوئیں وہ آثارِ قدیمہ اور قصوں، کہانیوں، لوک گیتوں کی صورت میں جو باتیں ہم تک پہونچیں وہ آثارِ منقولہ کہلاتی ہیں۔ بہر حال علمِ تاریخ صفحۂ عالم پر اسی دن جلوہ پرداز ہوئی جبکہ انسان کی قوتِ حافظہ نے اپنے آباؤ اجداد کے احوال و واقعات کو یادداشتوں کی صورت میں آنے والی نسلوں تک پہونچایا۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ سب سے پہلے جو علم ایجاد انسانی کے طور پر ظہور میں آیا وہ علمِ تاریخ ہے تاریخ کے اس اولیت کے علاوہ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دیگر علوم و فنون جو منصہ ایجاد پر جلوہ گر ہوئے ان کا تعلق مخصوص طبقات تک محدود رہا لیکن جو علم ہر طبقۂ انسانی کے لیے متاعِ مشترک بن کر نمودار ہوا وہ علم تاریخ ہے جب علمِ تاریخ سب سے اولین علم ٹھہرا اور اس کا تعلق تمام انسانوں کے ساتھ یکساں رہا تو اس کا نقطۂ آغاز کیا تھا؟ جب پچھلی تواریخ کی روشنی میں اس سوال کے جواب پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ قبیلوں، قوموں اور خاندانوں کے پچھلے کارناموں کو اس لئے محفوظ کرنے کی سعی و کوشش کی گئی کہ اس کے ذریعہ اپنے خاندان، قوم یا قبیلے کی عظمت و برتری کا لوگوں کے دلوں پر سکہ بٹھایا جائے کیونکہ یہ پچھلے واقعات وحالات اپنے قبیلے یا خاندان یا قوم کے تفوق و برتری یا اظہارِ فخر و غرور کے لیے نقل کیے گئے اس لئے ان واقعات کے اندر مبالغہ آرائی کی رنگ آمیزی شامل ہوتی چلی گئی جس کی وجہ سے کچھ عرصہ بعد حقیقت و اصلیت کا چہرہ افسانوی گرد و غبار میں گم ہوگیا بقول اقبالؔ ؎ حقیقت خرافات میں کھو گئی۔

اسلام سے پہلے دنیا کی قدیمی تاریخی (بابلی، اشوری، مصری) قوموں

کی تاریخ کو دیکھا جائے تو اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے اس لئے کتاب حکمت میں تاریخ کو پچھلی قوموں نے اساطیر الاولین پچھلوں کی کہانیوں سے تعبیر کیا ہے جو بات جاہلیت قدیمہ نے کہی تھی وہی بات جاہلیت جدیدہ کے عظیم محقق و مؤرخ کی زبان سے نکلی چنانچہ مشہور انگریز مورخ ایچ جی ویلز نے لکھا ہے کہ دو سو چار سو سال پہلے تک انسانی تاریخ محض قصے کہانیوں اور قیاس آرائیوں تک محدود تھی اور مہذب و متمدن دنیا میں عموماً یہی یقین تھا اور یہی بات پڑھائی اور سکھائی جاتی تھی کہ انسانی زندگی کا آغاز چار ہزار چار سو سال قبل مسیح ہوا۔ (شارٹ ہسٹری آف ورلڈ ص۲)

یہ امر ایچ جی پر موقوف نہیں ہے بلکہ ایڈورڈ ڈنال، پلنسر، فلپ، ہول اور اسی نوع کے انگریز و امریکی مورخین بھی اس کے ہم نوا ہیں۔ لیکن کیا یہ امر واقعی ہے کہ تاریخ انسانی کا ذخیرہ دو سو چار سو سال تک محدود ہے اور جو کچھ ہمارے پاس دو ڈھائی ہزار سال تاریخی ذخیرہ قدیم مورخین نے ہمارے ورثہ میں چھوڑا ہے وہ فرضی و مصنوعی و جعلی ہے اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے اس لیے کہ خوش قسمتی سے عالم انسانیت کے پاس چودہ سو سالہ ایک عظیم مستند صحیفہ اور ناقابل تغیر و تبدل معتبر دستاویز موجود ہے جس کے اندر ایک شوشہ کا آج تک فرق نہیں ہوا یہ صحیفہ گرامی خدا کی کتاب ہے جس کے نزول نے تاریخ عالم کے دھارے کو بدل دیا اور وہ دنیا جو شکوک و شبہات کی اندھیری رات میں بھٹک رہی تھی اس کو دن کی روشنی میں لاکر کھڑا کر دیا، تاریخ کی نامعلوم شب تار کی ظلمت چھٹ گئی اور افق عالم پر ایک نئی سحر نمودار ہوئی۔

تاریخ انسانیت میں قرآن حکیم ہی وہ پہلی کتاب ہے جس کا نقطۂ آغاز اقرأ کی تعلیم سے ہوا اور جس نے تعلیم کی اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ قلم کی اہمیت کو عَلَّمَ بِالْقَلَمِ سے بیان کیا۔ قرآن حکیم جہاں بے شمار علوم کا منبع و

سرچشمہ بنا وہاں اس نے عرب بائدہ وعاربہ عاد و ثمود، قوم لوط و مدین، بنی اسرائیل قدیم اقوام کا ذکر کر کے علم تاریخ کی طرف اہل نظر کی توجہات کو موڑ دیا۔ قرآن نے تاریخ کو تذکیر بایام اللہ سے تعبیر کیا ہے جو حکمتِ ولی اللہی کے مطابق قرآن کے مقاصدِ پنجگانہ میں سے ایک مقصد ہے اگرچہ قرآن نہ تاریخ کی کتاب ہے نہ سائنس وحکمت کی بیاض لیکن دعوتِ الٰہی نے ان سارے علوم کو اپنے مقاصدِ عالیہ معرفتِ الٰہیہ کے ثبوت وشہادت کے سلسلہ میں پیش کیا اور فکرِ انسانی کو علوم وفنون کی ان وادیوں کی سیر کرنے کی دعوت دے کر حقیقت وصداقت کے پایۂ تخت کی دہلیز تک پہونچا دیا۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ۝ فرما دیجئے کہ زمین پر چلو پھرو دیکھو غور کرو کہ مجرموں کا انجام کیسا ہوا۔ اس حکمِ قرآنی نے نہ صرف تاریخ نگاری کی طرف توجہ دلائی بلکہ تاریخ کے مقصدِ اصلی کو بھی واشگاف کر دیا۔ قرآن کے نازل ہونے سے پہلے تاریخ جو اساطیر الاولین کی حیثیت رکھتی تھی خدا کی کتاب نے اس کے اندر حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر پیدا کیا۔ بائیبل عہدِ عتیق میں انسانی تاریخ کی ابتدائی احوال میلادِ آدم کتاب التکوین میں اور بنی اسرائیل کے حالات کتاب الخروج میں مذکور ہیں لیکن جو رطب ویابس واقعات مبالغہ آمیز حکایات موجود ہیں وہ تحقیق وتنقیح کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ روایت ودرایت دونوں کے اصول پر بہت سے واقعات کی صحت وواقعیت کو مشکوک بنا دیتی ہے اس لئے یوروپ کے مؤرخوں کو دو سو چار سو سال پہلے کی تاریخ فرضی روایتوں اور قیاس آرائیوں کا مجموعہ نظر آئی لیکن قرآنِ حکیم نے جب میلادِ آدم، طوفانِ نوح اور بعد کی قوموں کا ذکر کیا تو اس کے بیانات کے بین السطور میں حقیقت کی تجلیاں چمک رہی تھیں۔ یہ تاریخ انسانی کا اولین باب جس کے اندر ابتدائی قوموں نے اجتماعیت پسندی کو اختیار کر کے تہذیب و

تمدن کی داغ بیل ڈالی اور مل جل کر رہنے کا ابتدائی نظام حکومت کے ذریعہ قائم کیا ہماری نظروں سے مخفی تھا۔ سامی نسل کے ابتدائی قبیلے جنہوں نے سب سے پہلے مدنیت وحضارت کی بنیادیں ڈالیں ان قوموں کی تاریخ پر سے سب سے پہلے پردہ قرآن نے اٹھایا اس طرح صحیفۂ تاریخ کے ابتدائی گم شدہ اوراق کی نشاندہی کر کے میلادِ آدم سے تا ایں دم کی تاریخ مرتب کرنے کی طرف گویا اشارہ کیا۔ چنانچہ مسلمان مؤرخین علامہ واقدی، ابن ہشام ابن سعد، ابو عبیدہ، امام ابو جعفر طبری، ابن عساکر، ابن ندیم، البلاذری ابن اثیر ابن کثیر جیسے عظیم مصنفین نے اپنی توجہات کا رخ اس طرف مبذول کیا اس لئے ابن سعد کی طبقات ہو یا مسعودی کی مروج الذہب والمعارف۔ علامہ ابن اثیر اور ابن کثیر کی تواریخ ہوں یہاں تک کہ فلسفۂ تاریخ کے باوا آدم علامہ ابن خلدون ان سب کے ذہن وحیِ الٰہی کے ذریعہ قرآنی قصوں میں قوموں کے اجمالی احوال وواقعات کے جو اشارے ہیں ان کی تجلیات سے روشن اور جلوہ تاب تھے یعنی قرآن نے پہلی قوموں کے متعلق جو کچھ تذکرے یا ذکر اذکار کئے تھے ان اسلامی مؤرخوں نے ان سے متاثر ہو کر تاریخ کو حقیقت نگاری وعبرت انگیزی کے سانچہ میں ڈھالا۔ علامہ مسعودی جس کو مغربی مؤرخوں نے مصنفینِ عرب کا ہیلینی قرار دیا ہے اس نے آثارِ قدیمہ کے ذریعہ پچھلی قوموں اور گذرے ہوئے قبیلوں کی کھوج اور تلاش کا کام تیسری صدی ہجری (یعنی آٹھویں نویں صدی عیسوی) میں مکمل کر لیا جس کو مستشرقین انیسویں صدی میں شروع کر سکے۔ یہاں تک کہ مسعودی نے پچھلی قوموں کے احوال وواقعات کی تلاش وجستجو میں حجاز ویمن، صنعا، عراق، ایران تک کو چھان مارا۔ حتیٰ کہ وہ ہندوستان پہونچ گیا۔ (تاریخ کا مطالعہ ص ۱۵) یہ ضرور ہے کہ ان مسلمان مؤرخین کی تواریخ کا ماخذ اسرائیلیات اور دوسری قوموں کے سنے سنائے واقعات وحکایات ہیں لیکن ان روایات وحکایات کو انھوں نے جوں کا توں قبول نہیں

کیا بلکہ پورے مواد کو تنقید و تنقیح کی چھلنی میں چھان کر ٹھیک کر لیا ہے۔ علامہ ابن ندیم نے تصریح کی ہے کہ مامون الرشید کے تاریخی عہد میں یونان و روم کے علمی دفینے اور قدیم مصنفین کے تحقیقی خزینے جو گرجوں اور کلیساؤں کے تہ خانوں میں پڑے سڑ رہے تھے مامون نے ان کو سونے کے بھاؤ خرید کر کے علم و تحقیق کے بازار میں لاکر پھیلا دیا چنانچہ عہدِ عباسی کے اربابِ تحقیق نے ان علوم و فنون کو چھان پھٹک کر اور نوک پلک سنوار کر نیا روپ دیا۔ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عروس البلاد بغداد کے ان اہلِ علم و فن میں وہ نو وارد بھی تھے جو یونانیوں کی عقلی بلند پروازیوں سے مرعوب ہو گئے اور بقول اہلِ مغرب ارسطو کے قلی بن گئے لیکن ان میں اربابِ تحقیق و تنقیح ابو البرکات بغدادی، امام فخر الدین رازی، حجۃ الاسلام غزالی، شیخ الاشراق شہاب الدین مقتول نے یونانیوں، مصریوں، رومیوں اور دیگر قوموں کے علوم و افکار کی غلطیوں کے تار و پود بکھیر کر رکھ دئے اور ان قدیم علوم و فنون کو صحیح شکل و صورت عطا کی۔

عہدِ اموی میں امیرِ معاویہؓ نے جس تاریخی ذوق کو پیدا کیا تھا اور پھر ان کے پوتے خالد بن یزید نے جس سائنسی مذاق کا ثبوت بہم پہونچایا اس کے اثرات اس عہد کے مورخوں پر پڑنا لازمی تھا چنانچہ ابن عساکر کی تاریخ دمشق جس کی بیس جلدوں میں سے صرف چار جلدیں ابھی تک چھپی ہیں (جو تاریخی معیار پر پوری اترتی ہیں) اس حقیقت کی گواہ ہیں۔ بنوامیہ کی وہ تاریخ جس کو عباسی عہد کے مورخوں نے مسخ کر کے پیش کیا ہے تاریخ دمشق کے مطالعہ سے اصلی حقائق و واقعات برافگندہ نقاب ہوتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عہدِ عباسی میں اہلِ اسلام کی ذاتی تصنیفات اور یونانی تالیفات کے تراجم کے انبار لگ گئے اور ہر محقق مصنف نے عہدِ اول کی تاریخ کو موضوع بنا کر تنقید و تنقیح کا حق ادا کیا۔ علامہ ابن ندیم نے جو تیسری صدی

ہجری کے مصنف ہیں جب اپنی کتاب "الفہرست" ترتیب دی تو اسلامی تواریخ کا ایک عظیم ذخیرہ ان کے پیش نظر تھا۔ بہرحال مورخین اسلام کا ایک سنہری سلسلہ ہے جس کی کڑیاں پہلی صدی ہجری سے آج تک تسلسل کے ساتھ قائم رہیں۔ ابنِ قیتبہ، ابنِ جبیر، ابن الفقیہہ، المقریزی، المقدسی، السیوطی، ابن الجوزی، ابن عبدالحکیم، ابن خلکان الدینوری، ان اسلامی مورخوں نے تاریخ عالم کو خصوصیت سے اپنا موضوع بنایا اس لیے یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ ایچ۔ جی۔ ویلز کے زعم کے مطابق محض قیاسی اور سماعی روایات وحکایات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ حقائق و معلومات کا ایسا بیش بہا خزانہ ہے جس کو روایت کے ساتھ درایت کی کسوٹی پر رکھ کر آج بھی پرکھا جاسکتا ہے۔

چونکہ ایچ۔ جی ویلز اور ان کے ہمنوا فرنگی و امریکی مورخوں کا دائرۂ نظر بائبل عہدِ عتیق و جدید تک رہا جن کے اندر بہت سے قصص و واقعات اصول درایت پر پورے طور پر پورے نہ اترنے کی وجہ سے نگاہِ تحقیق میں شکوک و شبہات پیدا کر دیتے ہیں اس لئے ان مورخوں نے کل انسانی تاریخ کو دو سو چار سو برس تک کے دائرہ میں محدود کر دیا لیکن وہ اگر نگاہوں کے دائرہ کو وسعت دیتے اور کتابِ حکیم اور اس سے پیدا شدہ فن تاریخ کے انقلابی اقدامات کو دیکھتے اور مسلمان اربابِ تاریخ کی محنت و جانفشانی پر نظر ڈالتے تو ان کو اپنی تحقیقات پر نظر ثانی کرنا پڑتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایچ۔ جی۔ ویلز کے نظریۂ تاریخ کو تسلیم کر لیا جائے کہ تاریخ صرف دو سو چار سو برس کے احوال پر محدود ہے تو علمِ انسانی کا دامن اپنے آباء و اجداد کی معلومات سے خالی نظر آئے گا اور عالمِ انسانیت کو اپنے پچھلے بزرگوں کے واقعات و حالات کا بہت تھوڑا سا حصہ ہاتھ لگے گا۔ تاریخ کے باوا آدم، ہیروڈوٹس یونانی سے لیکر قوموں کی تاریخ کا جو عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے اس سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ایسے ہی

آثارِ قدیمہ کے ذریعہ جو انسانیت کی تاریخ ترتیب دی جارہی ہے یہ کارِ بیکار ان ہوگا۔ بابل و مصر قدیم کا چھ ہزار سالہ ریکارڈ جو حفریات نے فراہم کیا ہے بے قیمت بن جائے گا۔

بہر حال قرآنِ حکیم اور سیرتِ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فنِ تاریخ میں جو انقلاب برپا کیا ہمارے نزدیک وہ حسبِ ذیل امور ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے اسلام نے تاریخ کو جو اس سے پہلے قوموں قبیلوں کے سرداروں، سپہ سالاروں اور بادشاہوں کے احوال و واقعات کا نام تھا اسکو اس تنگ دائرہ سے نکال کر عوامی دائرہ تک پہونچایا۔ چنانچہ اسلامی تاریخ میں خلفاء اسلام یا شاہانِ اسلام سے زیادہ تاریخی ذخیرہ علماء و فضلاء اطباء و صوفیاء کا ہے۔

۲۔ اربابِ حدیث (محدثین) کی طرح مسلم اربابِ تاریخ اور اہلِ سیَر نے ہر واقعہ کو روایت کے سنہری سلسلہ سے قائم کر کے اس کو محفوظ کرنے کی سعی و کوشش کی۔

۳۔ پھر روایت کی تحقیق و تنقیح کے لئے اصول درایت کو منضبط کیا تاکہ نقل کو عقلی معیار پر جانچ کر اصلیت و واقعیت کو پرکھا جا سکے۔

۴۔ ایک مستقل فن اسماء الرجال کے نام سے ایجاد کر کے پانچ لاکھ راویوں کے حالات کو جمع کر کے عظیم کارنامہ انجام دیا۔

۵۔ تاریخ اسلام میں یہی علم اسماء الرجال اہلِ علم و اربابِ فضل کے احوال کے فراہم کرنے کا سبب بنا جس کی بناء پر تاریخ کی دوسری شاخ سوانح عمری (بایوگرافی) اسلامی تاریخ کا مستقل باب بنی۔ چنانچہ عہدِ رسالت و خلافت سے لے کر آج تک ملتِ اسلامیہ نے ایسی عظیم شخصیات پیدا کیں جو آسمانِ تاریخ پر چاند ستارے بن کر چمک رہی ہیں کسی دور میں امتِ مسلمہ اربابِ فضل و کمال کے پیدا کرنے سے بانجھ نہیں رہی اس کی کوکھ سے ہر زمانے میں ہر علم و فن کے

کامل وفاضل اشخاص پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اس امت کو بلکہ پوری انسانیت کو اپنی روشنیوں سے منور کیا اس چودہ سو سالہ حیاتِ ملی میں کوئی بھی زمانہ ان علم وفن کے خدمت گاروں سے خالی نہیں رہا اور آج تک اس کا تسلسل نہیں ٹوٹا۔ ہر ملت اور ہر قوم کی قومی وملی زندگی ان صاحبانِ کمال افراد کے ذریعہ پروان چڑھتی اور ترقیاتی میدانوں میں قافلۂ حیات کو آگے بڑھاتی ہے۔ ان گرامی قدر شخصیتوں سے جو انسانیت کا درد اپنے سینے میں لے کر اپنے علم وفن کے ذریعہ انسانیت کی خدمت کے لیے کمربستہ رہتے ہیں، ہر قوم وملت ان کے کارناموں سے سربلند اور سرخ رو ہوتی ہے۔ یہی بابرکت شخصیتیں قوم وملت کی آبرو ہیں جب تک کسی قوم یا ملت میں ایسے عظیم افراد موجود رہیں گے اور انکی قدردانی کی جاتی رہے گی وہ قوم یا ملت زندہ وپائندہ رہے گی۔ چنانچہ اسلام کے ایک ہزار سالہ دورِ ارتقاء کو چھوڑ کر سترہویں صدی میں جب ملتِ اسلامیہ اقبال کی سربلندیوں کی چوٹی سے اتر کر ادبار کی پستیوں میں گرنے لگی تب بھی ملت اسلامیہ میں ایسے مردانِ کار پیدا ہوتے رہے جنہوں نے علم وفن اور خدمتِ خلق کے میدانوں کو طے کیا۔ علامہ جمال الدین افغانی، مفتی عبدہ مصری، علامہ عبدالرحمٰن، کواکبی مغربی، امام عبدالوہاب نجدی، حکیم الہند شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید اور اس آخری دور میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، امام قاسم العلوم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی ان اساطین علم وعمل کی ایک طویل فہرست ہے جس کی اس مقدمہ میں گنجائش نہیں۔ اب یہاں پہونچ کر اپنی کتاب "بھوپال تحریکاتِ آزادی کے آئینہ میں" کے اس اقتباس کو نقل کرتے ہیں جو درحقیقت اس کتاب کے لیے لکھا گیا تھا اور اس کتاب کا دوسرا باب تھا۔

اب جبکہ ماضی کی تاریخ نے ورق اُلٹ دیا ہے ضروری ہے کہ ہم اپنے ملک کی صبح مستقبل کے لیے عہدِ ماضی کی روشنیوں سے فائدہ اٹھائیں، ملک و قوم کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ اپنے آباء واجداد اور اپنے اسلاف کے کارناموں سے ناواقف ہو اور اغیار کی تواریخ کو حرزِ جاں بنائے اس کو فخر و امتیاز کا سرمایہ قرار دے۔

ریاستِ بھوپال ہندوستانی ریاستوں میں ایک نوخیز ریاست ہے جو اٹھارہویں صدی ۱۷۰۹ء کے آغاز میں صفحۂ تاریخ پر ابھری اور بیسویں صدی کے نصفِ اوّل ۱۹۴۹ء میں اپنے انفرادی وجود کو متحدہ ہند (انڈین یونین) کے اجتماعی وجود میں ضم کر دیا۔ اس ریاست نے انیسویں صدی کے آغاز میں علم و ادب کی ترقی کی طرف قدم بڑھایا اور بیسویں صدی میں مطلعِ ہند پر اخترِ تاباں بن کر چمکی، اس دو ڈھائی صدی میں بڑے بڑے باکمال اہلِ علم و فضل، اربابِ شعر و ادب اس خطۂ پاک سے اُٹھے اور اپنی علمی و ادبی روشنیوں سے بھوپال کو درخشاں بناتے رہے اسی طرح بے شمار اربابِ نظم و سیاست یہاں پیدا ہوئے اور انہوں نے یہاں کے ملکی و سیاسی افق کو روشن کیا۔ نمود و شہرت کے میدانوں کو پامال کیا اور ملک و ملت کی راہ میں خود کو شہادت کی قربان گاہ پر پیش کیا لیکن اس طرح پردۂ گمنامی میں اپنے آپ کو روپوش کیا کہ ان کے کاموں کا جائزہ لینا تو کیا کاموں کی فہرست مرتب کرنا دشوار ہو رہا ہے۔ آج بھوپال کے اصلی معماروں سے فرزندانِ بھوپال بیگانہ و نابلد ہیں کہ ان کے اذکار و یاد آوری کے لیے بیرونی حوالہ جات درکار ہو رہے ہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگ مولوی جمال الدین مدارالمہام، مولوی نظام الدین، دیوان چھوٹے خاں، دیوان بجے رام، دیوان خوشوقت رائے اور نواب صدیق الحسن خاں کے نام سے بھی ناواقف اور ان کی تعمیری و علمی اور انتظامی اور سیاسی خدمات سے یکسر ناآشنا ہیں۔

بھوپال کی علمی و ادبی سرگرمیاں تاریخ ہند کے صفحات پر گاہے بگاہے نظر آجاتی ہیں لیکن یہاں کی سیاسی کارروائیاں پردۂ عدم میں روپوش ہو کر لوحِ حافظہ سے

بھی اُتر چکی ہیں، خوش قسمتی سے ماضی قریب کے اندر ریاستِ بھوپال میں ایک ایسی بین الاقوامی شخصیت نے جنم لیا جس کی جاں فروشانہ ملکی وملّی قربانیاں آزادیٔ ہند کے لیے سیاسی کارروائیاں تاریخِ ہند کا سنہرا باب ہے لیکن اہلِ ملک کی محسن فراموشی وناقدری نے ان کی گرامی قدریاد کو بھی صفحۂ دماغ سے محو کر دیا ہے۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی کی ہندوستان کی آزادی وحریت کیلیے مسلسل سرگرمیاں اور بالآخر ملک وملّت کی راہ میں جلاوطنی کے عالم میں وطن سے کوسوں دُور امریکہ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہنا ایسی عظیم الشان قربانی اور دلدوز کہانی ہے جس کی تاریخ میں بہت کم نظیر ومثال ملتی ہے۔ ان گمشدہ واقعات کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت عرصۂ دراز سے محسوس کی جارہی تھی لیکن برطانوی حکومت کے قہرمان پالیسی نے ان سیاسی کوائف وحالات کو قعرِ گمنامی میں ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔

راقم الحروف جبکہ تعلیمی دور سے گذرکر ۴۱-۱۹۴۰ء میں مولانا عبید اللہ سندھی کی صحبتِ بابرکت میں حضرت شیخ الہند کی تحریکِ جہاد (ریشمی رومال) اور مولانا برکت اللہ کے انقلابی کارناموں سے واقفیت حاصل کر رہا تھا، اس وقت ان کی شخصیت اور ان کے حریت پرور کارناموں سے پہلی بار کان آشنا ہوئے۔ کابل و برلن کے سیاسی واقعات سے یک گونہ روشناسی ہوئی لیکن مولانا مرحوم کے عمومی حالات، سیاسی کوائف وواقعات دائرۂ معلومات سے باہر رہے۔

ملک کے آزاد ہونے کے بعد سب سے پہلے ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے مولانا برکت اللہ بھوپالی کے کارناموں کی عظمت کو محسوس فرمایا اور وزارتِ تعلیمات کی طرف سے شائع ہونے والی کتابوں میں ان کی سوانح کو شامل کیا۔ اس سلسلہ میں قدیم بھوپال کے بابائے

سیاست مولانا سعید اللہ خاں رزمی کے ذریعہ اس کی ترتیب و تدوین کا پیغام راقم الحروف کو ملا۔ پھر دوبارہ اس کی یاد دہانی مولانا طرزی مشرقی سے کرائی گئی۔ بہرحال اس حقیر ہیچمداں نے اس فرض کی ادائیگی کو اپنے لیے قابلِ افتخار و اعزاز سمجھا اور اس کے ضروری نوٹ تیار کر لیے۔ مولانا آزاد مرحوم کی ہدایات کا منتظر رہا جب انجمن ترقی اردو ہند کے سالانہ اجلاس ۱۹۵۷ء میں دہلی حاضری ہوئی اور مولانا مرحوم سے اس سلسلہ میں ملاقات کے لیے سعی کی گئی لیکن ظاہر شاہ والیٔ افغانستان کی میزبانی کے فرائض کی انجام دہی کی وجہ سے مولانا سے شرف ملاقات کا موقع دستیاب نہ ہو سکا مگر اس کتابچہ کے لیے خصوصی ہدایات دیئے جانے کی خوشخبری ملی جس سے دل کے اندر عرصۂ دراز کی خوابیدہ تمنائیں جاگ اٹھیں اور ناشگفتہ آرزوؤں کی کلیاں چٹکنے لگیں۔ اس بات کی توقع ہو گئی کہ ایک دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا مگر قضا و قدر کی جانب سے کچھ اور فیصلہ ہو چکا تھا انجمن مذکور کے عام اجلاس میں مولانا آزاد کی زیارت آخری زیارت اور اس خطیبِ وقت کی اردو کے لیے آخری تقریر تھی جس کے بعد حریت و آزادی علم و ادب کا یہ آفتاب عالمتاب غروب ہو گیا۔ جس عظیم شخصیت نے نصف صدی تک اپنی علمی و ادبی و سیاسی شعاعوں سے ظلمت کدۂ ہند کو منور کر رکھا تھا جس کی رعد آسا خطابت و زلزلہ افگن تحریر و انشاء نے پوری دنیا میں ایک غلغلہ برپا کر رکھا تھا۔ اس حادثۂ ناگہانی سے راقم السطور کے حوصلے افسردہ اور ولولے پژمردہ ہو گئے اور وہ ابتدائی نوٹ جوں کے توں پڑے رہے۔ اس اثناء میں ہمارے مخلص دوست ایم عرفان مرحوم نے اس موضوع کو اپنایا اور اپنی عادت کے مطابق اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا لیکن اس انقلابی سوانح کے بعض گوشے سامنے آئے اور بعض تشنۂ تکمیل رہے۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی نے بقول خود دوبار پورے عرصۂ گیتی کا چکر لگایا اور دنیا کے بڑے بڑے مراکز

میں رہ کر اپنے مشن کو جاری رکھا، ہزاروں صعوبتوں اور دشواریوں کے باوجود ان سنگلاخ میدانوں کو طے کرتے رہے بالآخر اسی میدان میں جان دی۔

تاریخ آزادیٔ ہند کے سلسلہ میں یہ ایک ایسا غیر معمولی کارنامہ ہے جو بار بار یاددہانی کا مستحق ہے۔

اب جبکہ ہم آزاد فضا، حریت وجمہوریت کی تازہ آب وہوا میں سانس لے رہے ہیں شمعِ آزادی کے اس پروانہ کی زندگی اور اس سلسلہ میں انکی جاں سوز مساعی وخدمات پر پردہ پڑا رہنا سخت ناحق کوشی وناسپاسی ہوگی۔ اس لیے اس کتابچہ کو اہلِ ملک کی خدمات میں پیش کرنے کی عزت حاصل کی جارہی ہے۔

اس کتاب کی تالیف میں جن بزرگانِ محترم مرحومین سے استفادہ کا موقع ملا ان میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی، علامہ محوی صدیقی، ملا رموزی، میجر عبدالسلام بھوپالی وغیرہم ہیں لیکن خصوصیت سے بندہ کے رفیق وکرم فرما دمخلص جو بندہ سے مخلصانہ ارادت رکھتے تھے وہ منشی رفیق احمد بھوپالی ہیں، بھائی رفیق مرحوم مولانا برکت اللہ کے ساتھ کابل، تاشقند اور ماسکو میں حقِ خدمت ورفاقت ادا کرچکے ہیں۔ ۱۹۲۰ء کی پہلی تحریکِ ہجرت میں شامل ہوکر مولانا مرحوم کی معیت میں قیمتی اوقات گذار چکے ہیں اور ان کے سیاسی مضامین ومسودات کے رازدار امین رہے ہیں اس کتاب کے بہت سے واقعات میں مرحوم مغفور سے کافی مدد ملی ہے۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی کی سوانح ایک ایسے مردِ آہن کی سوانح ہے جس نے اپنے طول طویل مجاہدانہ زندگی میں دنیا کی سب سے زبردست جابر وقاہر طاقت برطانوی سامراج سے تحریر وتقریر، زبان وبیان، تیغ وسنان غرض ہر میدان میں ٹکر لی اور ہر محاذ پر اس ظالم طاقت کا مقابلہ

کیا مگر شکست پر شکست کھانے پر کبھی نہ تو دل برداشتہ ہوئے، نہ دشمن کے آگے ہتھیار ڈالے، وہ ایک ناقابلِ شکست عزم وارادہ، ناقابلِ تسخیر جرأت وولولہ، نہ مضمحل ہونے والا ہمت وحوصلہ، نہ ہار ماننے والی شخصیت تھی، وہ عمر بھر اپنے اعلیٰ نصب العین کے لیے جانفروشانہ مساعی کے ساتھ گرمجوشی سے مصروف رہے، وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے، غربت کے ماحول میں آنکھیں کھولیں، اپنی غیر معمولی ذہانت وفطانت اور اپنے مشفق اساتذہ کی محبّت وشفقت سے اس وقت کے مروجہ علوم وفنون سے سیراب ہوئے لیکن ان کی فطرت علوم وفنون کے ان چشموں سے سیراب نہ ہوسکی اور علم کے نئے دریاؤں سے فیضیاب ہونے کے لیے ان کی موجوں میں اپنی کشتیِ حیات ڈال دی۔ ریاست کے ماحول کی تنگنائیوں سے نکل کر بیرونی دنیا کی فراخنائیوں کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ جذبۂ دعوت نے کفرستانِ فرنگ میں (لندن) تبلیغی مہم کے لیے کمربستہ کیا۔ پھر فرنگی ڈپلومیسی کے رموز آشکارا ہونے پر سیاست نے ان کے دامن کو اپنی طرف اس طرح کھینچا کہ وہ عمر بھر اس سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ مغرب کی باطل فرعونی سیاست نے ان کو حق وصداقت کے عصائے موسوی کو ہاتھ میں لے کر مقابلہ کرنے کی دعوت دی لیکن پھر سیاست نے اپنا گھیرا ڈال دیا۔ نئی دنیا (امریکہ) پہونچ کر پرانی دنیا کے کٹھن مسئلے ایشیا خصوصاً ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ ان کی زندگی کا مطمحِ نظر بن گیا جس صحافتی زندگی کا آغاز لندن کے قیام سے ہوا تھا، امریکہ میں اس سے کام لے کر اپنے اس مشن کو تیز تر کر دیا لیکن جس سامراجی طاقت نے ان کو انگلستان چھوڑنے پر مجبور کیا تھا، وہ امریکہ میں اس مہم جوئی کے لیے کس طرح روادار ہوسکتی تھی، اس لیے امریکہ کو بادلِ ناخواستہ الوداع کہنا پڑا مگر ان کی خوش قسمتی نے ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے لیے نیا باب کھولا، وہ ایشیا کی نئی ابھرتی ہوئی طاقت جاپان میں السنۂ

مشرقیہ کے پروفیسر بن گئے اور اپنے رسالے "اسلامک فریٹرنیٹی" کے ذریعہ وہاں بھی اپنا مشن جاری رکھا۔ مشرقِ اقصیٰ میں دعوتِ اسلامی و سیاسی کا اس قدر بلند آہنگی سے صور پھونکا کہ اسی بیرونی سامراج کے اشارے پر جاپان کو بھی خیر باد کہنا پڑا۔ اس وقت جنگِ عظیم ۱۴ء کے شعلوں نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اس لیے ترک و جرمن اتحاد کے سائے میں انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے منصوبے بنائے ارضِ کابل کو مرکز بنا کر آزادیٔ ہند کی مہم کو سر کرنا چاہا اس سے پہلے حضرت شیخ الہند کی تحریکِ جہاد کے مولانا برکت اللہ قائد بن چکے تھے اس لیے کابل میں ہندوستان کی پہلی حکومت قائم ہوئی جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ اور خود مولانا وزیرِ اعظم اور مولانا عبیداللہ سندھی وزیرِ خارجہ بنے۔ اس عبوری حکومت نے اپنے وفود مختلف ممالک میں بھیجے لیکن ہندوستان کی بدقسمتی آڑے آ گئی اور اتحادیوں کی فتح نے سارے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا اس منصوبہ کے درہم برہم ہونے پر انقلابِ روس ۱۷ء امید کی شعاع بن کر نمودار ہوا۔ مولانا نے سرزمینِ روس کو اپنی انقلابی سرگرمیوں کا مرکز بنایا جہاں سے اشتراکی نظام کا سورج طلوع ہوا تھا اور جو نوآبادیاتی نظام کے خلاف چیلنج بن کر اُبھرا تھا لیکن روس کے بین الاقوامی خیالی انقلاب کا خواب حقیقت کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ جو توقعات اس کے ذریعے عالمی انقلاب کے لیے بندھی تھیں، وہ کچے دھاگے کی طرح بکھر کر رہ گئیں، اس لیے انہوں نے پھر مغربی ممالک برلن و پیرس کو اپنا مستقر بنانا چاہا، آخر میں نئی دنیا کی طرف مراجعت فرمائی اور یہ نئی دنیا اس پرانی دنیا کے مسافر کی آخری منزل بنی۔ اس باعزیمت انقلابی نے اپنے اس قول کو پورا کر دکھایا کہ جب تک سرزمینِ ہند پر آزادی کا سورج نہ چمکے گا برکت اللہ کے وہاں قدم نہ پڑیں گے۔

مولانا کی حیاتِ جہاد کی یہ ایک اجمالی داستان ہے لیکن اس کی تفصیل دنیا کے سارے بڑا عظموں کی سیّاحت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ مولانا نے پرانی دنیا اور نئی دنیا کے ایک ایک گوشہ کو پامال کر ڈالا جہاں ان کو اپنے مقصد کی کامیابی کی کوئی کرن نظر آئی، وہاں جا پہونچے۔ اس مجاہدانہ دوڑ دھوپ کے راستوں میں مصائب کے لق و دق صحراؤں، امتحانات کے پُر خطر جنگلوں اور جاں فروشی کے پُر شور دریاؤں سے واسطہ پڑا لیکن وہ مردانہ وار ان کو طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔

زندگی کے اس خشک ریگستان میں ان کو بہت کم سبزہ زاروں اور نخلستانوں میں آرام طلبی کے مواقع میسّر آئے، ایک اعلیٰ نصب العین کے حصول کے لیے دنیا کی اس امتحان گاہ سے کسی ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کئے بغیر مردانہ وار گذر جانا ہی مردِ مومن کا شعار ہے۔ چونکہ یہ عالمِ ویراں آزمائش کا میدان ہے عیش و راحت کی بہشت نہیں۔

یہ انقلابی سوانح ایسے موقع پر منظرِ اشاعت پر جلوہ گر ہو رہی ہے جبکہ ہمارا ملک فرقہ پرستی، علاقائی تعصّبات اور لسانی جھگڑوں کے شعلوں کے لپیٹ میں آکر ہر محبِّ وطن، انسانیت دوست فرد کو غمگین و ملول بنائے ہوئے ہے، اس وقت جبکہ تمام ہندوستان خاص کر ہندوستانی مسلمانوں کا قافلہ ایک ایسے بے آب و گیاہ بیاباں میں پھنس گیا ہے جہاں آگے بڑھنے کا راستہ مفقود اور نشانِ منزل گم ہے۔ اس وقت ہندوستانی مسلمان ایک ایسے امتحانی و آزمائشی دور سے گذر رہے ہیں جہاں شاندار ماضی کی یادوں سے زیادہ صبحِ مستقبل کے لیے کٹھن محنتوں اور سخت مشقتوں اور مسلسل جہاد کی ضرورت ہے۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی کے احوالِ زندگی ہم کو مایوسیوں کے

اندھیروں میں صبحِ صادق کا اُجالا بن کر سامنے آتے اور ہر قسم کی پریشانیوں سے بلند و بالا ہو کر اعلیٰ نصب العین کی خاطر جان جوکھم میں ڈالنے کا سبق دیتے ہیں۔ یہ سوانح جہاں نوجوانوں کے لیے درسِ حیات و درسِ عمل ہے وہاں بوڑھوں کے لیے پیغامِ بصیرت بھی، کاش کہ ہم ان کی زندگی سے قومی و ملّی بقا و ارتقار کا سچا سبق حاصل کر سکیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

۲۸ / جون ۱۹۸۶ء

وحیدی الحسینی

ریاست کا سیاسی اجمالی خاکہ

ریاست بھوپال جیسا کہ لکھا گیا اس تاریخی دور کی یادگار ہے جبکہ مرکزی حکومت شہ زور طاقتوں کے منہ میں لگام دینے کے قابل نہ رہی تھی اس وقت صوبہ مالوہ کے پرخطر علاقہ میں سردار دوست محمد خاں نے آزادانہ فضا میں ایک گوشہ عافیت بنام ریاست قائم کیا راعی ورعایا آزادی کے ماحول میں سانس لیتے رہے۔
شروع ہی سے ریاست کا حق پسند وحریت خواہ علمار سے رابطہ رہا جو برطانوی سامراج کے خلاف میدان عمل میں سرگرم تھے اس لیے ریاست بھوپال ولی اللہی انقلابی تحریک کا مرکز بن گئی پھر جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانی ریاستوں کو معاہداتی زنجیروں میں جکڑ بند کیا تو عوام کے دلوں کے اندر ہی اندر برطانوی سامراج کے اکھاڑ پھینکنے کے جذبات پرورش پاتے رہے چنانچہ ۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھوپال کے حریت پسند طبقہ نے بھرپور حصّہ لیا پھر بغاوت کے ان بجھے ہوئے شعلوں کو ہوا دے کر نواب صدیق الحسن خاں نے تحریک جہاد کا ڈول ڈالا جو ان کی نوابی کی معزولی کا باعث بنا اسی دور میں جبکہ ہندوستان پر برطانوی سامراج کی گرفت سخت اور مضبوط ہوگئی تو ریاست نے ایک ایسی بین الاقوامی شخصیت کو جنم دیا جس نے برطانوی سامراج کے مرکز لندن پہنچ کر آزادیٔ ہند کی جدوجہد کا آغاز کیا جبکہ سرسید مرحوم مسلمانوں کو برطانیہ کی وفاداری کا درس دے رہے تھے اور ہماری قومی جماعت کانگریس مسٹر ہیوم کے پڑھائے ہوئے حقوق طلبی کے سبق کو دہرا رہی تھی۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی نے

امریکہ پہنچ کر تحریک آزادی کی باقاعدہ داغ بیل ڈالی اور غدر پارٹی کے بانیوں کے ساتھ شریک ہو کر اس نئی دنیا میں پرانی دنیا کے محکوم ممالک کی آزادی کا صور پھونکا اور پھر ترکیہ وافغانستان کے ذریعہ آزادی کے منصوبہ کو بروئے کار لانے کی تدبیریں اختیار کیں۔ اتحادیوں کی فتح ۱۹۱۴ء کے بعد سوویت روس کے ذریعہ اس مسئلہ کو بین الاقوامی مسئلہ بنایا اور اس کے لیے پوری دنیا کا دو بار "چکر" لگا کر آزادی کی راہ میں ۱۹۲۷ء میں امریکہ میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی۔

مولانا مرحوم کی یہ طویل و مسلسل انفرادی جدوجہد آزادی بڑی سے بڑی جماعتی کارروائیوں پر بھاری ہو جاتی ہے اس لیے ایک مستقل کتاب میں اس کو پیش کیا جا رہا ہے۔ ہماری کتاب کا یہ تاریخی باب اس فراموش کردہ داستان حریت کا ایک عظیم مرقع ہے جن سے تاریخ آزادی ہند کے صفحات خالی ہیں۔

علمائے اسلام کا انقلابی کردار

انسان جو اس محفلِ عالم میں خدا کا نائب اور خلیفہ بن کر آیا قدرت نے اسکی فطرت میں اجتماعیت پسندی کے جوہر کو ودیعت کیا ہے جو اس خاکدانِ ارضی میں ابنائے جنس کے درمیان رہ کر چمکتا ہے۔

اگرچہ آپس میں مل جل کر رہنے کی جبلت بعض حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے لیکن وہ بے شعوری کی پیداوار ہونے کی بنا پر درخورِ اعتنا نہیں ہے کامل فہم وشعور اور مکمل عقل و دانش کے ساتھ اجتماعیت و مدنیت کے سانچے میں زندگی کو ڈھالنا فطرت انسانی کی خصوصیت ہے بقول فلاسفہ "انسان مدنی الطبع ہے مگر یہ حقیقت بھی ملحوظ خاطر رہے چونکہ طبیعت میں خود غرضی کا مادہ ہے اس لیے انسانوں کے باہمی اغراض و مفادات کا ایک دوسرے سے ٹکرانا اور ہر طاقتور کا کمزور کو دبانا، چالاک ہوشیار لوگوں کا کم عقل، بے وقوف انسانوں کو اپنے جال میں پھانس کر غرض براری کرنا برابر دیکھنے میں آتا رہتا ہے اس لیے فرد کے حقوق کے ساتھ حیات اجتماعی کے حدود کا تعین ضروری ہوا یہ فطرت انسانی کی پکار تھی جس کو مذہب کی زبان میں میثاقِ ربّانی اور عصری سیاست کی اصطلاح میں معاہدۂ عمرانی کہا جاتا ہے ان قواعد وضوابط کے مطابق زندگی گزارنا جس کے اندر فرد کے تقاضے بنی نوع کے تقاضوں سے نہ ٹکرا سکیں اور ہر شخص ان حدود کے دائرہ میں اپنی زندگی کی ضروریات کی تکمیل کر سکے ان حقوق و فرائض کی حفاظت اور ان کی حدبندی ریاست کی تشکیل کا باعث بنی اس لیے ریاست

یا مملکت انسان کی آئینی وقانونی زندگی کا دوسرا نام ہے۔

حیاتِ بشری کے ابتدائی دور میں یہ دائرہ بے حد مختصر تھا ہر گھر کا سربراہ چھوٹوں بڑوں کے حقوق کی نگرانی کرتا تھا پھر جب معاشرہ نے اپنے حلقہ اثر کو وسیع کیا تو قبائلی زندگی نے سر نکالا اور ایک شخص یا چودھری پورے قبیلے کا ذمہ دار بنا اور خاندانوں کے حدود کی دیکھ بھال کرنا اس کا فرض قرار پایا پھر جب مختلف قبیلوں سے مل کر اجتماعیت نے وسیع بال وپر نکالے اور قومیت ابتدائی شکل میں معاشرہ کی سطح پر ابھری تو ریاست کا ابتدائی ڈھانچہ نمودار ہوا اور پھر آگے چل کر بادشاہت مسندِ حکومت پر جلوہ افروز ہوئی اس کے بعد جب بادشاہت نے اپنے ہاتھ پاؤں نکالے تو اس کے بطن سے شہنشاہیت نے جنم لیا جس نے اپنے اقتدار وسلطنت کا تخت قوموں کے درمیان بچھایا۔ جوں جوں اقتدار واختیار کا دائرہ وسیع ہوتا گیا خودسری وخود پرستی، غرور ونخوت پرستی کے جراثیم ارباب اقتدار کے دماغوں میں کلبلانے لگے خدا کی مخلوق کو اپنے تحکم، زور زبردستی کے شکنجہ میں کسنے اور عام لوگوں کی پیشانیوں کو ملوکیت کے آستانے پر جھکانے کے لیے نت نئے طریقہ اختیار کیے جاتے رہے جو ریاست ابتداءً آپس کے میل ملاپ ایک دوسرے سے محبت ومودت کے تعلقات کی خوشگواری کے لیے انسانی معاشرہ میں جلوہ گر ہوئی تھی رفتہ رفتہ استحصال وغلامی، تحکم پسندی، ناجائز نفع اندوزی کا نشان بنتی گئی۔

ان اربابِ اقتدار نے اپنے دائرۂ اختیار کو وسیع سے وسیع تر کیا اور تفوق وبرتری اور اپنی بڑائی کا سودا دماغوں میں ایسا پکایا کہ وہ دیوتا (مظہر خدا) بلکہ خود خدا بن بیٹھے۔ دنیا کی سب سے پرانی نسل سامی اقوام کے اندر عربِ بائدہ میں عاد وثمود وہ پہلی قومیں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے کوس لمن الملکی بجایا اور اپنی شان وشوکت، جاہ وحشمت، زور وطاقت کے بل بوتہ پر اپنے علاقوں سے باہر نکل کر دوسری قوموں کو بزور شمشیر زیر کیا اور اپنی شہنشاہیت کا ڈنکا

دور دراز علاقوں تک بچایا جیسا کہ مشہور ہے کہ ان کے بادشاہ شدّاد نے جنت تک بنا ڈالی جو آج تک باغ ارم کے نام سے ضرب المثل ہے ان کی اصلاح و ہدایت کے لیے خداوند قدوس نے اپنے برگزیدہ بندوں مقدس پیغمبروں کو مبعوث فرمایا جنھوں نے خدا اور بندہ کے رشتہ کو واضح کیا اور خدا کی شانِ کبریائی اور اس کی بڑائی اور مخلوق کی بے کسی و بے چارگی اور اس کی عجز و نارسائی کو کھلے طور پر بتایا کہ بندہ کتنا ہی ترقی کر جائے وہ خدا نہیں بن سکتا اور انسان کسی حال میں بھی کلی طور پر مالک و مختار نہیں ہے بابل و مصر کی شہنشاہتیں تاریخِ انسانی میں وہ درخشاں منارے ہیں جہاں سے تہذیب انسانی نے سب سے پہلے روشنی حاصل کی۔

دنیا کی قدیم شہنشاہتیں اپنی نمرودیت و فرعونیت کے ہاتھوں خدا کے قہر کا شکار ہو کر پیوند زمیں ہو گئیں شام کے نمارده ہوں یا مصر کے فراعنہ، ایران کے اکاسرہ یا روم کے قیاصرہ انسانی تاریخ میں عروج و زوال کی نشانیاں بن کر انسانوں کو درسِ عبرت دے رہی ہیں اس لیے تاریخ انسانیت اچھے برے نیک و عادل، ظالم و جابر بادشاہوں، راجوں مہاراجوں اور عوام کے باہمی خوشگوار اور ناگوار احوال و وقائع کے مجموعہ کا نام بن کر رہ گئی ہے عادل و انصاف پسند بادشاہوں کے عہد میں خوشحالی و فارغ البالی اور امن و امان کے سایہ میں حیاتِ انسانی نے ترقی کی طرف قدم بڑھائے اور ظالم و جابر اور سرکش فرمانرواؤں کے دور میں انسانیت مظلومیت و محکومیت کا شکار ہوئی اور محکومی و فقر و محتاجی عوام کے حصہ میں آئی اس کے خلاف حق پسندوں نے انقلاب و اصلاح کے ذریعہ صورتِ حال میں خوشگوار تبدیلی لانے کی کوشش کی اور بسا اوقات معاشرہ انسانی کو خون کے دریا کو تیر کر ساحلِ نجات تک پہنچنا پڑا جس کے اندر کافی وقت لگ گیا اس لیے ہماری دنیا حق و باطل، عدل و انصاف اور ظلم و ستم کی معرکہ آرائیوں کی ایک رزم گاہ ہے اور تاریخ ان واقعات کا

دھندلا آئینہ۔

جہاں ایک طرف میدانِ زندگی میں طاقت پرستوں کے شان و شکوہ، جاہ و حشم اور کرّ و فر کے ہنگامے ہیں وہاں دوسری طرف حق پسندوں کی قربانیاں جاں فروشیاں اور صداقت کے لیے ولولہ انگیز فداکاریاں آئینۂ تاریخ میں جھلکتی نظر آتی ہیں تاریخ انسانی کے چوکھٹے میں دنیا کے جلیل القدر پیغمبر، عظیم الشان حکیم و مصلح، قوموں کے مذہبی رہنما اور ملّی پیشوا اور راہِ حق کے شہدا اپنی زبانِ حال سے ارتقائے انسانی کی دلچسپ داستاں کو کبھی بلند آہنگی سے اور کبھی دھیمی آوازمیں سناتے ہوئے نظر آتے ہیں ان حق پرستوں، حق پسندوں کے مجاہدانہ واقعات پژمردہ دلوں میں نیا ولولۂ حیات اور خوابیدہ جذبات میں نیا حوصلۂ زندگی اور مایوسی و ناامیدی کی اندھیری فضاؤں میں شعاعِ امید و یقین کو بکھیر دیتے ہیں اور اس حقیقت عالیہ کا اعلان کرتے ہیں کہ زندگی کی سچی قدریں کبھی نہیں مرتیں اور حیاتِ انسانی کا قافلہ پیچھے کی طرف نہیں پلٹتا اور نہ تاریخ کا تسلسل کبھی ٹوٹتا ہے اور انسانی کارواں ترقی کی طرف مستقل اور مسلسل رواں دواں ہے اس وقت تاریخ انسانی ہمارا موضوعِ سخن نہیں ہے بلکہ اسلام کے سچے پرستاروں اور حق پسند نام لیواؤں کا عموماً اور اسلامی ہند کے عالموں، صوفیوں کی انسانی خدمات کی طرف خصوصاً اجمالی اشارہ کرنا مقصود ہے جنھوں نے حکومت کے اندر اور باہر رہ کر عوامی خدمت اور ان کے دکھ درد کے دور کرنے کی سعی و محنت کو اپنا نصب العین بنایا کیونکہ اسلام نے انسانی زندگی کو ایک وحدت کی حیثیت دی ہے جس کا ایک سرا موجودہ دنیا اور دوسرا سرا عالمِ آخرت ہے اسی تخم دنیوی سے اخروی زندگی کا سرسبز و شاداب شجر نمودار ہوگا انسانی اعمال کی جو کھیتی یہاں لگائی جائے گی وہ آخرت میں کاٹی جائے گی اس لیے ہمارے نزدیک شجرِ حیات کی جملہ پنجگانہ شاخیں اعتقادیات، عبادات، اخلاق معاشرت و معیشت ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں

پیغمبرِ اسلام کی مدنی زندگی میں جب اسلامی معاشرہ ظہور میں آیا تو اس کے نتیجہ میں اسلامی ریاست وجود میں آ گئی۔ اسلام میں ریاست یعنی State کو بھی خداوندی نیابت کی حیثیت سے قائم کرنے کا حکم دیا ہے جس کا نام حکومت یا مملکت کے بجائے خلافت رکھا گیا۔ اس ریاست کے اندر فرد و جمعیت کی آزادی کے حدود کو قائم کر کے احکام الٰہی کے دائرہ میں انسانیت کے انفرادی و اجتماعی حقوق کا تحفظ کیا گیا ہے اصل اقتدار کلی اختیار کا مالک خود خالق کائنات کو قرار دے کر اس کے احکام کی روشنی میں زندگی گزارنے کا فطری طریقہ بتایا گیا۔ انسانی فطرت کے فعلی و انفعالی ہر طرح کے جذبات کی پوری طرح رعایت کی گئی ہے۔ اسلام میں نہ تو فرد کو مکمل آزادی دے کر انسانی معاشرہ کو انارکی و آوارگی کے جنگل میں ڈھکیل دیا گیا ہے اور نہ اجتماعیت کو کلی اختیارات دے کر فرد کو آزاد ضمیر اور آزاد عمل پر ہر طرح کی پابندی عائد کر دی ہے اور نہ حکومت کی زنجیروں میں جکڑ بند کر کے اس کے شرفِ حریت کو خاک میں ملا دیا ہے اس لیے خلافت اسلامی انسان کی اجتماعی و انفرادی اور ظاہری و باطنی زندگی کی ترقیات کی ضامن ہو کر عرصۂ عالم میں جلوہ گر ہوئی خلافتِ راشدہ ایک مثالی ریاست (ideal State) بن کر قیامت تک کے لیے نمونہ کا کام دیتی رہے گی۔ اسلام نے جو عرب کے ریگستان (سادہ ماحول) سے نکل کر عجم کے مرغزاروں میں قدم رکھا دنیا کی عظیم شہنشاہتیں روم و ایران اس کے قدموں تلے آ گئیں دولت و ثروت نے اپنے دہانے مسلمانوں کے لیے کھول دئے۔ مفتوحہ علاقوں کے مصنوعی زرنگار تہذیب و تمدن نے عام نگاہوں میں چکا چوند پیدا کر دی۔ خلافت راشدہ کی سادگی و سچائی، پرہیزگاری و تقویٰ شعاری رخصت ہونے لگی یہاں تک کہ کچھ عرصہ بعد خلافت نے ملوکیت کا جامہ پہن لیا اس وقت امت کے دینی سربراہوں، مذہبی رہنماؤں نے خلافت کی برکات کو قائم رکھنے کے لیے خلفائے اسلام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور کچھ مصلحوں، عالموں نے

اسلامی معاشرہ کی اصلاح کو اپنی سعی وکوشش کا محور بنایا یہ دونوں مقدس گروہ امت کے قیام وبقا اور ارتقاء ونشوونما کے لیے دوش بدوش اپنی ملی فرائض کی ادائگی میں سرگرم وکمر بستہ رہے اسلام اصلاً اصلاح وہدایت کا داعی ہے لیکن اپنے مخالف منھ زور سرکش طاقتوں سے نمٹنے کے لیے جہاد و معرکہ آرائی کی بھی دعوت دیتا ہے اس لیے فطرت انسانی کے گوناگوں پہلوؤں کے اعتبار سے وہ مجموعۂ خیر وخوبی ہے وہ اصلاح کا داعی اور انقلاب کا حامی ہے ہر مزاج کے انسان کے لیے اس کے دائرۂ تعلیمات میں وسعت وگنجائش موجود ہے۔ بہ الفاظ دیگر قدرت نے انسانوں کو مختلف مزاج اور مختلف طبائع دے کر اس دنیا میں پیدا کیا ہے۔ کچھ انسان قدرت کی طرف سے انقلابی فطرت لے کر پیدا ہوتے ہیں جو معاشرہ یا حکومت کی غلط کارروائیوں کو برداشت نہیں کر سکتے اپنی فطرت اور مزاج کے دباؤ سے مردانہ وار میدانِ مقابلہ میں کود کر ان غلط کارروائیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیتے اور تن من دھن کی بازی لگا دیتے ہیں اور جب تک بزور وقوت ان کو ملیا میٹ نہ کر دیں چین سے نہیں بیٹھتے یہ مجاہدینِ حق اور انقلابی افراد کا گروہ ہے اور کچھ لوگ جو مصلحانہ مزاج رکھتے ہیں وہ اپنی نرم مزاجی اور اعتدال پسندی کی بنا پر اصلاحی طریقہ کو پسند کرتے اور معاشرہ یا حکومت میں پھیلی ہوئی خرابیوں کو آہستہ روی کے ساتھ دور کرنے میں لگے رہتے اور دیر سویر اپنے مقصد میں کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں یہ دونوں نرم گرم افراد تاریخ انسانی کے صفحات میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔

پیغمبر اسلام کی عظیم شخصیت چونکہ جامع شخصیت تھی اس لیے وہ جلال وجمال اور پھر حسنِ اعتدال کا حیرت انگیز اور عجیب وغریب معجزنما مرقع ہے جو ہمہ جہتی اعتبار سے کامل ومکمل ہے۔

چنانچہ پیغمبر اسلام کی شان تربیت نے اپنے ساتھیوں کو ان کی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے درجۂ تکمیل تک پہنچایا جن کے اندر جو محاسن وکمالات اور خوبیاں تھیں کمالِ تربیت سے سنوار کر اور نکھار کر نمونہ کے کامل ومکمل انسان

بنا دیا خلیفۂ اول صدیقِ اکبر پیکر رحم و مہر تھے تو خلیفۂ ثانی فاروق اعظم مظہر غضب و قہر تھے۔ حضرت حسنین جو سبطِ رسول اور جگر جگر گوشۂ رسول ہیں ہر دو صفاتِ عالیہ جلال و جمال کے مجسمہ تھے۔ امام حسن نے اپنی صلح پسندی، نرم خوئی سے امت کے اندر خانہ جنگی کے برپا ہونے والے فتنے کے دروازے کو بند کر دیا اور امام حسین نے اپنی انقلابی فطرت کے اعتبار کے لحاظ سے معرکۂ کربلا میں مٹھی بھر افراد کے ساتھ ہنگامۂ کارزار کو گرم کیا اور اپنے خونِ شہادت سے تاریخ اسلام کو درخشاں و رنگین بنا دیا پھر یہ ہی دونوں رنگ اکابر امت کی سیرتوں میں جھلکتے ہوئے اور چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں کچھ اہلِ علم و فضل نے معاشرت کی اصلاح کو اپنی زندگی کا مقصد اور مطمح نظر بنایا اور حکومت کے مقابلہ میں معرکہ آرائی کو پسند نہیں کیا اور کچھ اربابِ عزیمت نے جب حکومت جادۂ مستقیم سے منحرف ہو گئی اور حکومت بجائے خدمت کے اندھی اقتدار پرستی کی راہ پر چل کھڑی ہوئی اسلام کا نصب العین جو سرداری براہ خدمت گزاری تھا ختم ہو گیا جیسے کہ پیغمبر اسلام نے فرمایا سید القوم خادمھم قوم کا سردار قوم کا خدمت گزار ہوتا ہے تو ان اربابِ حوصلہ و ہمت نے حکومت کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ اہلِ بیت کرام میں امام زین العابدین، امام باقر، امام جعفر صادق کا رویہ حکومت کے ساتھ صلح پسندانہ رہا جبکہ امام زید شہید اور امام یحیٰی شہید نے حکومت وقت سے ٹکرا کر اپنے جدّ امجد امام حسین کی سنت پر عمل کر کے جام شہادت نوش کیا امام التابعین امام حسن بصری اور سید التابعین حضرت سعید ابن المسیّب اور حضرت سعید ابن جبیر وغیر خلافت امویہ کے خلاف عمر بھر نبرد آزما رہے لیکن امام زہری اور امام شعبی وغیرہ اربابِ حکومت سے ربط و ضبط رکھتے ہوئے فریضۂ اصلاح میں مشغول رہے ائمۂ اعلام میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد ابن حنبل اور امام سفیان ثوری حکومت سے باہر رہ کر مجاہدین کی صف میں شامل رہے امام اعظم ابوحنیفہ پر ان محدثین عظام نے جو اپنے علمی و دینی مشاغل بنا پر حکومت کی موافقت و مخالفت سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے

یہ الزام لگایا تھا کان ابوحنیفة یری السیف علی الامة یعنی ابوحنیفہ امت میں خانہ جنگی کی رائے رکھتے تھے جس کی کل حقیقت اتنی ہے کہ امام ہمام نے اموی وعباسی خلافت کے ظالم وفاسق اور بدکردار امرا کی حمایت نہیں کی بلکہ اپنے مجاہدانہ مزاج کی وجہ سے ان کے خلاف ضرورتاً تلوار اٹھانے کی اجازت دے دی انھوں نے حکومت کے مجبور کرنے پر بھی منصبِ قضا کو قبول نہیں کیا اور اس کی پاداش میں قید خانہ میں رہ کر داعیٔ اجل کو لبیک کہا امام مالک نے ایک مسئلہ میں حکومت کے خلاف فتویٰ دے کر دُرّہ کھانا منظور کیا جو ان کی عظیم شخصیت کے مرقع کے حسین نقش ونگار بن گئے امام احمد ابن حنبل کے معرکۂ امتحان میں ثبات قدمی تاریخ اسلام کا روشن عنوان ہے پھر امام اعظم کے شاگردوں قاضی القضاۃ امام ابویوسف اور امام محمد وغیرہ نے دائرۂ حکومت میں شامل ہوکر انسانی معاشرہ کو عدل وانصاف سے بھر دیا اور اسلامی قانون (فقہ) کی زندگی کے جملہ گوشوں پر ہمہ گیری وہمہ جہتی کو اپنے تاریخی فیصلوں سے ثابت کر دیا بہرحال تاریخ اسلامی کے اوراق ان انقلابی واصلاحی روشن ودرخشاں کارناموں سے پرنور ومعمور ہیں جن کی تفصیل اپنے موقع پر کی جائے گی۔

آمدم برسرِ مطلب جب اسلامی اقتدار کا پرچم ہمارے ملک ہندوستان جنت نشان پر لہرایا تو ان علمائے کرام اور صوفیائے عظام کی دونوں جماعتیں یہاں بھی میدان عمل میں سرگرم دتگ وتاز نظر آتے ہیں۔ مشائخ چشت جنھوں نے اپنے روحانی کمالات اور اخلاقی قدروں سے اس ملک کے باشندوں کے دلوں کو جیت لیا وہ اقتدار وحکومت کے دائرہ سے باہر رہ کر عوام کی خدمت اور اسلام کی اشاعت میں لگے رہے۔ سلسلۂ چشتیہ کے امام خواجۂ خواجگان حضرت معین الدین چشتی نے ۵۶۲ھ جبکہ صوبۂ پنجاب کے علاوہ مسلم حکومت کا جھنڈا ان علاقوں میں نہیں لہرایا تھا اپنی دعوت کا مرکز ریگستانِ راجپوتانہ کے ایک دور افتادہ مقام دارالخیر اجمیر کو بنایا پھر جب قطب الدین ایبک نے جو شہاب الدین

غوری کا غلام تھا اپنا دار الخلافہ دہلی کو بنایا اور غوری کا یہ غلام اسلام کی بدولت ہندوستان کا شہنشاہ بنا اور پھر اس کا غلام شمس الدین التمش دہلی کا بادشاہ ہوا تب بھی خواجہ صاحب اپنے مرکز اجمیر سے نہیں ہٹے اور مسلم حکومت سے تعلق قائم کرنے کے بجائے ہندوستانی عوام ہی سے اپنا رابطہ رکھا۔

مشہور واقعہ ہے کہ جب دار السلطنت دہلی مسلمانوں کا پایۂ تخت بنا اور قطب الدین اور شمس الدین یکے بعد دیگرے تختِ دہلی پر بیٹھے تو چونکہ دونوں بادشاہ خواجہ صاحب کے خلیفہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کی وجہ سے آپ کے بے حد معتقد اور حضرت کی زیارت کے ازحد مشتاق تھے دہلی تشریف آوری کی بارہا ان بادشاہوں نے دعوتیں دیں لیکن خواجہ صاحب قطب بن کر اپنے مستقر پر جمے رہے اتفاقاً ایک غریب آدمی کی زمین حاکم اجمیر نے جو مسلمان تھا دبالی اور اس بیچارے کی دادرسی نہ ہوسکی وہ خواجہ صاحب کے پاس اپنی فریاد لایا خواجہ بغیر اطلاع دئے ہوئے دہلی روانہ ہوگئے جب بادشاہ کے علم میں آیا کہ خواجہ صاحب تشریف لا رہے ہیں تو بادشاہ میلوں پیشوائی کے لیے مع ارکان سلطنت پہنچا زیارت کی دیرینہ تمنا پوری ہوئی فوراً اس غریب کی زمین کے واگذاشت کرنے کا حکم جاری کردیا خواجہ صاحب وہیں سے اجمیر واپس ہوگئے غریب نواز لقب اسی وجہ سے پڑ گیا اسی طرح خواجہ صاحب کے خلفائے عظام قطب الدین بختیار کاکی بابا فرید الدین شکر گنج، خواجہ علاء الدین علی احمد صابر اور محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا دربارِ سلطنت سے دور اور حکومت کے مناصب اور عہدوں سے نفور رہے حضرت نظام الدین اولیا کو جب شہنشاہ علاء الدین خلجی نے دربار کی باریابی کے لیے مدعو کیا تو حضرت نے جواب مرحمت فرمایا "فقیر بادشاہ کے لیے خانقاہ میں دعائے خیر کرتا ہے۔" پھر جب شہنشاہ نے خانقاہ میں حاضر ہونے کی خواہش کی تو اس ملک بے نیازی کے بادشاہ نے صاف کہلا دیا کہ فقیر اپنے گھر کے دو دروازے رکھتا ہے بادشاہ ایک دروازے سے

آئے گا تو فقیر دوسرے دروازے باہر نکل جائے گا اور بادشاہ سے ملنا پسند نہیں فرمایا جس سے ملاقات کے لیے ہر شخص آرزومند رہتا تھا غرض اس سلسلہ کے چشتی مشائخ نے خدا کی تمام مخلوق کی خدمت گذاری کو دعوت حق کے ساتھ اپنا مقصد حیات قرار دیا اور جب کبھی بادشاہ نے اسلام کی طرف سے ہندوستانی عوام کے ساتھ خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو ظلم و زیادتی حق تلفی و ناانصافی کا معاملہ پیش آیا تو ان بزرگوں نے صدائے حق بلند کی اور حق پرستی اور انصاف پسندی کے لیے سینہ سپر ہوتے رہے۔

اس افغانی دور کے بعد ملک میں جب مغل برسر اقتدار آئے اور بابر و ہمایوں کے بعد جب اکبری فتنہ نے سر نکالا تو حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے تجدیدی کارناموں نے مغل شہنشاہیت کے اقتدار پسندی کے رخ کو تبدیل کر دیا اور ایک صالح و انصاف پسند معاشرہ کی از سر نو بنیادیں قائم کیں اور اکبر و جہانگیر جیسے آزاد بادشاہوں سے شاہجہاں و اورنگ زیب جیسے انصاف پسند اور خدا ترس بادشاہ پیدا ہوئے۔ اورنگ زیب جس کی حدودِ سلطنت راس کماری اور تبت سے لے کر بلخ و بخارا تک پھیلے ہوئے تھے اور جس نے پچاس سال اپنی مسلسل جدوجہد اور قربانی سے متحدہ ہند کا وہ خواب جو بھارت ورش کے لیے ہمیشہ دیکھا جاتا رہا پورا کر دکھایا اس عظیم شہنشاہ کی دوربیں نگاہوں نے فرنگی سامراج کی حریفانہ نظروں کو شروع ہی سے بھانپ کر اس کو ساحلی مقامات سے بے دخل کر دیا انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں جو سیاسی سازشوں کا اڈہ تھیں حکماً بند کر دی جس کی وجہ سے فرنگی مورخین کے نزدیک وہ کٹر متعصب مسلمان بادشاہ قرار دیا گیا۔ بقول مولانا عبیداللہ سندھی

"مغل شہنشاہیت کی قسمت میں اگر ایک اور اورنگ زیب ہوتا تو ہندوستان جنت نشان کے ہاتھ میں ایشیا کی قیادت ہوتی"

لیکن تدبیر انسانی کے مقابلہ میں تقدیر ربانی دوسرا فیصلہ کر چکی تھی۔

اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوتے ہی نہ صرف شیرازۂ حکومت بکھرنا شروع ہوگیا بلکہ ہندوستانی قومیت انتشار کا شکار ہوگئی اور فرنگی سامراج نے تجارت کے پردہ میں سیاست کے ڈورے ڈالنا شروع کردیے اور اپنی شیطانی پالیسی کے مطابق ہندوستان کے مختلف فرقوں میں پھوٹ ڈال کر اور مرکز کے مختلف علاقوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر اپنے ناپاک قدم اس پاک سرزمین پر جما لیے ٹھیک اس وقت جبکہ مغل شہنشاہیت کا آفتابِ اقبال دکن کی وادیوں میں ڈوب رہا تھا مطلعِ دہلی سے فضل و کمال کا ایک سورج نکل رہا تھا جو علمی و عملی کمالات کا بادشاہ ہوکر لباس فقر و درویشی میں ملبوس تھا یہ تھے حجۃ الاسلام امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ حضرت شاہ صاحب نے ہوش و شعور کی جب آنکھیں کھولیں تو اس وقت مغل حکومت کا عالیشان محل سیاسی افراتفری کے زلزلوں سے لرز رہا تھا حضرت شاہ صاحب نے اس خطرناک مرحلہ پر جو دعوت پیش کی وہ اس گرتی ہوتی شہنشاہیت کے قصرِ اقتدار کے تحفظ کی بنیادوں پر مبنی نہ تھی بلکہ فکِّ کل نظام کہہ کر اس نظام حکومت کو توڑ پھوڑ کر ایک صالح انسانی معاشرہ کی بنیادوں پر نظامِ اسلامی کی تعمیر و تشکیل کو اپنا مطمحِ نظر قرار دیا تھا۔

حضرت شاہ صاحب نے جب اپنی انقلابی دعوت کا اعلان کیا اس وقت ہندوستان کے مسلمان خصوصاً اور عالم اسلام عموماً غفلت کی گہری نیند سو رہا تھا اور مغرب صدیوں کے خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کے لیے انگڑائی لے رہا تھا۔ شاہ صاحب کی یہ دعوت ۱۷۱۳ء انقلابِ فرانس ۱۷۷۰ء سے نصف صدی پہلے اور کمیونزم کے بانی مبانی کارل مارکس کی پیدائش سے ایک صدی پہلے پیش کی تھی وہ پہلے ہندوستانی مفکر ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اقتصادی انقلاب کی طرف رہنمائی کی شاہ صاحب نے اپنی انقلابی فکر کو جس وقت پیش کیا اس وقت ہندوستانی سماج اور مسلم حکومت عمر طبعی کو پہنچ کر بوڑھی ہوچکی اور راحت طلبی

و آرام پسندی کے جھولے میں جھول رہی تھی اس وقت مغرب کی جدید تہذیب نئی انگڑائی لے کر جوان ہو رہی تھی اس لیے شاہ صاحب کی آواز ان نیند کے ماتوں کو نہ جگا سکی اور وہ اپنے ملک کے اندر صالح انقلاب لاکر اچھا سماج قائم کرنے میں آگے نہ بڑھ سکی لیکن ان کے جانشینوں سید احمد شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی نے اس انقلابی خاکے کے اندر رنگ بھرنے کی کوشش کی اور انگریز سامراج سے ٹکر لینے کا منصوبہ تیار کیا راہِ حق کے ان مجاہدین نے جہادِ ایمانی کی روح کو اسلامی ہند میں پشاور سے لے کر بنگال تک اس طرح دوڑایا کہ دشمن برطانوی مورخین ڈبلو ہنٹر جیسے مورخین کو ان کے اعلیٰ نظام اور حسن انتظام کی داد دینا پڑی اگرچہ یہ مقدس طائفہ فرنگی سامراج کی شیطانی پالیسی کے جال کے ہر طرف پھیل جانے اور ملک میں اقتدار پسندی کے لیے خانہ جنگی کے پھوٹ پڑنے اور اس عصر کی عسکری قوتوں سے محروم ہونے کی بنا پر اپنے نصب العین کے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا لیکن خونِ شہادت کی سرخیوں سے اس مردہ و خشک زمین کو لالہ زار بنا دیا اس پاکباز جماعت نے اس میدان میں شکست کھا کر ہمت نہیں ہاری اور دوسرے میدانوں میں جہادِ ایمانی اور جہادِ آزادی کو جاری رکھا ۱۸۵۷ء کا جہادِ حریّت جو فرنگی سامراج کی ہندوستانی عوام سے غداری کا معرکہ تھا اسی سلسلۂ جہاد کی ایک کڑی تھی جس کے اندر سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور انکے جاں نثار رفقاء و مرید مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور حافظ ضامن شہید وغیرہم کے ساتھ شاملی کے میدان میں برطانوی اقتدار کو مٹھی بھر جماعت کے ساتھ چیلنج کیا مسلمانانِ ہند کی قسمت پر ان کی صدیوں کی بد عملی اور عصری تقاضوں سے بے خبری نے مہر لگا دی لیکن ان مجاہدین اسلام نے اس شکست کو تسلیم نہیں کیا البتہ میدانِ عمل بدل دیا مغربی تہذیب و تمدن کی اس یلغار سے حفاظت کے لیے اسلامی قلعے اداروں کی صورت میں ملک کے ہر گوشہ میں کھڑے کر دئے بہر حال اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے علمائے کرام کی تاریخ ان کے

شاندار ماضی کی آئینہ دار ہے۔ دیگر اسلامی ممالک کے علما کے مقابلے میں علمائے ہند کا کردار آسمانِ تاریخ پر روشن ستارے کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا ہے ریاست بھوپال کا قیام بھی اسی دور کی ایک تاریخی یادگار ہے جس کی تشکیل میں اس عہد کے قاضیوں اور عالموں کا ہاتھ صاف نظر آتا ہے جنھوں نے نہ صرف اس کے قیام و بقا میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ اس وقت کی مخالف طاقتوں کے خلاف میدانِ مقابلہ میں معرکہ آرا رہے۔

چونکہ یہ چھوٹی سی ریاست (بھوپال)، دراصل ان جفاکش اور حوصلہ مند عوام کی پناہ گاہ کی حیثیت سے ۱۷۰۹ء کے اندر عالم وجود میں آئی جنھوں نے اس وقت کی ملک میں بڑھتی ہوئی منھ زور طاقتوں اور سامراج کی استحصالی قوتوں کے مقابلہ میں اپنی حفاظت، خود اختیاری، شرافت و خودداری اور غیرت دینی کی خاطر ایک سر چھپانے کا گوشہ اختیار کیا۔ تاریخ بھوپال کا ابتدائی دوران رئیسوں نوابوں کی جنگ آزمائیوں کی مسلسل داستان ہے ریاست بھوپال اس شاہراہِ عظیم پر واقع ہے جہاں سے جنوبی اور شمالی ہند کے قافلے ہمیشہ گزرتے رہے اور مرکزی حکومت کی کمزوری کی بنا پر مرہٹہ حملہ آور طاقتوں کا سیلاب یہاں کی سرحدوں سے ٹکراتا رہتا تھا یہ پہاڑی خطہ اس سیلاب کے لیے پشتہ کا کام دیتا تھا جو کبھی کبھی ٹوٹ پھوٹ بھی جاتا تھا یہاں تک کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط کے بعد اس کا وسیع و عریض رقبہ ایک محدود علاقہ میں محصور کر دیا گیا یہیں سے تاریخ بھوپال کے دوسرے بیگماتی دور کا آغاز ہوتا ہے جبکہ ہمارا ملک انگریزی سامراج کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ بند ہوتا چلا گیا اس عہد میں ہندوستان کے حریت پسندوں کی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں شکست کھا جانے پر امن و امان کی فضا پیدا ہو چکی تھی۔ اس لیے نوابانِ بھوپال کی باہمی خانہ جنگی اور اقتدار کی رسّہ کشی کے نتیجہ میں زمامِ اقتدار مردوں کے بجائے عورتوں کے ہاتھ میں دے دی گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ عہدِ معدلت مہد تاریخ بھوپال میں علم و ہنر،

شعر و ادب کی ترقیات کے لحاظ سے قابلِ فخر رہا بھوپال کی ان فرماں روا بیگمات نے اپنے زمانے میں ریاست کو اربابِ علم و ادب کا گہوارہ بنایا اور یہ چھوٹا سا خطہ دار الحکومت دہلی اور بیت السلطنت لکھنؤ کی تہذیبی بہاروں سے آنکھوں سے آنکھیں ملانے لگا اس بیگماتی عہد کے اختتام ۱۹۲۶ء پر آزادیٔ ہند کی تحریک جو برطانوی ہند کے باشندوں کے دلوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی جا رہی تھی اس کی چنگاریاں ریاست کے خرمنِ امن و سکون کو بھی اپنی لپیٹ میں لینے لگیں انجمنِ خدامِ وطن (پرجا منڈل) کے نوجوانوں نے اس کے لیے قید و بند کی قربانیاں دیں بالآخر ۴۷ء کی صبحِ آزادی کے طلوع ہونے کے بعد جون ۵۹ء میں یہ چھوٹا سا نقطہ (بھوپال) ایک بڑے دائرہ Indian Union میں ضم ہو گیا ریاست کا ابتدائی دور جو دلاور بہادر جوانوں اور محنت کش عوام خاندانوں کی بدولت معرضِ ظہور میں آیا تھا سادگی اور جفاکشی اور سادہ زندگی کا آئینہ دار تھا بندہ و آقا میں کوئی خاص تمیز نہ تھی ریاست فساد آدمیت سے دور تھی اوپر سے لے کر نچلی سطح تک زندگی مشقت و صعوبت اور دشمنوں کی مزاحمت سے بھری ہوئی تھی اس لیے مردانہ جنگی اوصاف کی بنا پر ریاست کے باشندوں سے اعلیٰ درجہ کی بہادری و دلیری کا ظہور عمل میں آیا جگواد کچھوا اور مرہٹہ سرداروں کے سات حملوں سے ریاست خون کے دریا میں نہا کر اور سرخرو ہو کر نکلی جب بھوپال کے بانیٔ ثانی نواب وزیر الدولہ کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ریاست کو اپنے جال میں پھانس لیا تو ارکان سلطنت کا ایک گروہ اس معاہدہ سے گو متفق نہ تھا لیکن مقابلہ کی طاقت بھی نہ رکھتا تھا۔ اس لیے ریاست بھوپال بھی ملک محروسۂ برطانیہ میں شامل ہو گئی مگر ان مخالف برطانیہ روسائے نے ۵۷ء میں انگریزی سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور بعض نے شہادت سے بھی سرخروئی حاصل کی لیکن والیۂ بھوپال سکندر جہاں بیگم نے مصلحت وقت کا لحاظ کرتے ہوئے اس بغاوت کو فرو کر دیا اس طرح یہ علاقہ انگریزی اقتدار کے زیر سایہ آ کر اور بیرونی حملوں سے محفوظ ہو کر ۵۸ء کے

لُٹے پٹے علما و شرفا کے قافلوں کی پناہ گاہ بن گیا جن ارباب علم و ادب کی آمد پر علم و ہنر، شعر و ادب کے نئے پودے اس سرزمین پر نکل آئے دہلی اور لکھنؤ کے گلستانوں کی اجڑی بہار کچھ دیر کے لیے یہاں آکر ٹھہر گئی پھر محدثین یمن اور سلسلۂ ولی اللہی کے اکابر علما کی تشریف آوری اور نواب صدیق الحسن خاں کے دور میں سلفی علما کے ورود سے بھوپال ہندوستان میں علوم دینیہ کا ایک مرکز بن گیا بہر حال بگیماتی دور میں سکندر جہاں بیگم، شاہ جہاں بیگم بانئ تاج المساجد کا عہد بھوپال کی علمی و ادبی تاریخ کا زرّیں عہد ہے اس کے بعد سلطان جہاں بیگم کے دور میں بھوپال کی شہرت و مقبولیت اندرونِ ملک سے نکل کر بیرونِ ہند جا پہنچی اور عالمِ اسلام میں بھوپال ایک مرکز علمی و دینی حیثیت سے جانا پہچانے لگا۔

آخری دور میں نواب حمید اللہ خاں نے ملکی سیاست میں حصّہ لے کر بھوپال کو سیاسی افق پر نمایاں کیا خود ریاست بھی سیاسی گرمیوں کا مرکز بن گئی پھر متحدہ ہند میں ضم ہو کر ہندوستان کے رقبہ کے اعتبار سے سب سے بڑے صوبہ کی راجدھانی بھوپال بن گیا۔

اٹھارہویں صدی کا ہندوستان

سولہویں سترہویں صدی سے یورپ نے مشرقی ممالک کو اپنی بحری مہمات کا جو نشانہ بنایا ہے اس کی غرض وغایت مغربی مؤرخین نے اپنے خوش نما الفاظ میں ان پچھڑے ملکوں کو اونچا اٹھانا، ان غیر مہذب باشندوں کو مہذب بنانا اور ان کو تہذیب وتمدّن سے آشنا کرنا بتایا ہے، ان یورپی مصنفین کے قول کے مطابق یہ سات سمندر پار مشرق و ہندوستان پر شفیق ومہربان قومیں اس لیے یہاں آئیں کہ وہ ان ملکوں کے پسماندہ لوگوں کو اوپر اٹھائیں اور ان کو حقوقِ انسانی سے بہرہ یاب کریں جس زمانے میں ان مہموں کا آغاز ہوا وہ یورپ کا مذہبی دور تھا کلیسائی نظام پورے یورپ پر چھایا ہوا تھا چنانچہ پوپ الیگزنڈر بورجیا نے پندرہویں صدی کے آخر میں اپنے مقدس اعلان کے ذریعہ نامعلوم غیر مسیحی دنیا کو اسپین وپرتگال میں تقسیم کر دیا، اسپین والوں نے اپنے سامراجی اغراض کے لیے نئی دنیا (امریکہ) کو بسایا اور پرانی دنیا کو دوسرے حریفوں کے لیے چھوڑ دیا چنانچہ ہندوستان پرتگال کے حصہ میں آیا، پرتگیزی افریقہ کے مغربی سواحل پر قبضہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اس اعلان نے ان کے اندر پر پرواز پیدا کی اور انھوں نے غیر معمولی جوش وخروش کے ساتھ ہندوستان کے ساحلی مقامات پر قلعہ بندیاں شروع کر دیں، ترکی خلیفہ سلیمان اعظم نے ۱۵۱۷ء میں پرتگالیوں کو بحرِ قلزم اور خلیج فارس سے باہر نکال دیا لیکن بحرِ ہند کے قافلہ کو ترکی بیڑہ بھی نہ روک سکا۔

یہ امر تعجب خیز مگر افسوس ناک ہے کہ جب ترکی سلطان پرتگالیوں کو بحرِ قلزم

وغیرہ کے داخلہ پر روک لگا رہا تھا تو اکبر اعظم ان بیرونی نو واردوں کو مشرقی روایات کے مطابق مہمان سمجھ کر استقبال کر رہا تھا۔ اکبر کی ذوق تماشہ گیری نے پرتگالیوں کی پذیرائی کر کے ان کو سر پر بٹھا لیا تھا اور وہ اندر ہی اندر خفیۃً اپنے مشن میں لگے رہے اور اس پردہ میں ملک کی سیاست میں دخل اندازی کرتے رہے جیسا کہ آگے کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس عیسائی مشن کا مقصد ملک کے اندر سامراج کے لیے ایک ایسا وفادار طبقہ کا پیدا کرنا تھا جس کو مال و دولت کے ذریعہ بڑھا وا دیا جائے، آج کل کی زبان میں جو پانچواں کالم بن سکے پرتگیزوں کے نقش قدم پر فرنگی سامراج نے بھی محتاط انداز میں یہی راستہ اختیار کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا یہ ہراول دستہ عیسائی پادری ہر شہر ہر قصبہ بلکہ ہر گاؤں گاؤں پھیل گئے، کمپنی کی حکومت بظاہر تو اہل ہند کے عقائد و اعمال میں کھلم کھلا مداخلت سے دور رہتی تھی لیکن عیسائیت کی علانیہ حامی تھی، پادریوں کی تنخواہیں مقرر تھیں جگہ جگہ گرجے تبلیغی ادارے اور عیسائی اسکول کھولے جا رہے تھے۔ (تاریخ پاکستان و بھارت ص ۳۲۱ ج ۲)

انگریز نواز مورخ منشی ذکاءاللہ ایک انگریز سپہ سالار کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ایک ہاتھ میں آرڈر بک اور دوسرے ہاتھ میں بائبل لے کر کھڑے ہوتے تھے اس طرح سے انھوں نے اپنی گورنمنٹ کی بڑی خدمت کی جس کے وہ ملازم تھے مشہور جج رابرٹ جو سچے عیسائی تھے انھوں نے فتح پور کے دروازے پر چار پتھر کے مینار کھڑے کیے تھے جس میں دو میناروں پر احکام عشرہ (توریت کے دس احکام) اور بقیہ دو پر عیسائی عقائد کندہ کرائے تھے (تاریخ عروج عہد انگلشیہ ص ۵۲۴)

لفٹننٹ کرنل ویمرے نے ۱۸۵۷ء میں بڑے فخر سے یہ بات کہی کہ بیس برس سے زائد عرصہ سے میری عادت یہ رہی ہے کہ سب قسم کے آدمیوں کو بغیر کسی تمیز کے عیسائی مذہب کا وعظ سناتا ہوں، مسیح کا سپاہی بن کر خدا کے احکام اور سرکار کمپنی کا سپاہی بن کر اس کے احکام سناتا ہوں، غرض افسران فوج اور احکام

اپنے ماتحتوں کو حکم دیتے تھے کہ اتوار کو ہماری کوٹھی پر آکر پادری صاحب کا یا ہمارا وعظ سنو۔

(تاریخ عروج انگلشیہ ص۳۰۱)

مشہور گورنر جنرل لارڈ ویلزلی نے کلکتہ بائبل سوسائٹی فنڈ میں سب سے زیادہ عطیہ دیا لارڈ ہیٹنگز، لارڈ ولیم بنیٹنگ، سر چارلس مٹکاف اس کی اعانت میں پیش پیش تھے۔

(تاریخ مذکور عروج عہد انگلشیہ ص۴۹۹)

یہ تاریخی حوالے ان انگریز پرست مورخین کے ہیں جنھوں نے فرنگی سامراج کی طرف سے دفاعی فریضہ انجام دیا ہے ؎

قیاس کن انگلستانِ من بہار مرا

جب ظاہر ظہور میں عیسائی بنانے کی مذکورہ بالا کوششیں کی جارہی تھیں تو ڈھکے چھپے انداز میں جو کچھ کارستانیاں ہوئی ہیں وہ محتاجِ بیاں نہیں۔ اس سلسلہ میں جو بھونڈے ذرائع و وسائل استعمال کیے گئے وہ ایک مدعی تہذیب قوم کے شایانِ شاں نہیں غرض سترھویں صدی کے ختم ہوتے ہوئے انگلستان نے ہند و برما و لنکا پر ان ترکیبوں سے اپنے پنجے جمادئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس سونے کی چڑیا کے بال و پر اکھاڑنے میں ہاتھوں کی انتہا درجہ کی صفائی دکھائی لارڈ کلائیو سے وارن ہیٹنگز تک یہاں کی ملکی دولت کو جس طرح انگلستان منتقل کیا گیا تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ مسلم دور میں جتنی کچھ فتوحات ہوئیں ملک کی دولت ملک کے اندر ہی رہی۔ لیکن برطانیہ سامراج نے تھوڑے ہی عرصہ میں یہاں کی دولت کو انگلستان کو منتقل کر کے ہمارے ملک کو مفلس و کنگال بنا دیا پھر مال و دولت کی حرص و طمع نے انگریزوں کو ملک گیری کی راہ پر لاکر کھڑا کر دیا پورے ملک میں سازشوں کا جال بچھا دیا گیا توڑ پھوڑ کی سیاست نے ایک ایک ریاست

کو اپنے قبضہ میں کر لیا لارڈ ڈلہوزی کی عہد شکنی کے سیاہ کارنامے تاریخ ہند کے ایسے داغ دھبہ ہیں جن کو مٹایا نہیں جا سکتا حکومت آصفیہ لکھنؤ کے انگریزی مقبوضات میں شامل کرنے کی کھلی دھاندلی سے ہندوستانیوں کے سامنے برطانوی سامراج کی اصلی تصویر سامنے آگئی پہلے ملک کو کنگال کر دیا گیا پھر یہاں کے امراء اور رؤسا، اور نوابوں کو یکے بعد دیگرے بے دخل کرنے کی فرنگی چال نے پورے ہندوستان کو انگریزوں کی طرف سے بے زار کر دیا اور اندر ہی اندر لاوا پکتا رہا ایک ایسی قوم جو پہلے سے پھوٹ کا شکار، باہمی رسہ کشی میں مبتلا، شخصی حکومتوں کی بدعنوانیوں سے عاجز و نالاں، جدید اسلحہ اور ہتھیار، رسل و رسائل کے ذرائع سے خالی ہاتھ اور ایک دوسرے سے رابطہ و اتصال قائم کرنے سے محروم اور سب سے بڑھ کر یہ کہ منصوبہ بندی کے ساتھ کسی تحریک کو آگے بڑھانے کے فن سے ناواقف و نابلد تھی اس مظلوم و ستم رسیدہ قوم کا ۱۸۵۷ء میں مقابلہ ایک ایسی سلطنت سے ہو رہا تھا جو بحری و بری اقتدار کی مالک، ہر قسم کے جدید ٹکنکی اور ہتھیار بند آلات سے مسلح باقاعدہ و منظم افواج پر مشتمل ایک منصوبہ بند طریقہ پر اپنے دائرہ اقتدار کو مضبوط و مستحکم کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔

ان دردناک مظالم و مصائب سے ہندوستانیوں کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک اٹھا اور اندر ہی اندر جو لاوا پک رہا تھا وہ وقت سے پہلے پھٹ پڑا اور اس قسم کی تحریکات کا جو انجام ہوتا ہے اس سے پورے ملک کو دوچار ہونا پڑا مشرقی اقوام خصوصیت سے مسلمانوں کا مزاج عقلی جوش و جذبات کی فراوانی عقل و ہوش کی کم مائیگی و تہی سامانی کا نشان بن گیا ہے جوش وقتی و ہنگامی کامیابی کا باعث تو کبھی ہو جاتا ہے لیکن مستقل دوامی کامرانی کے لیے ہوش درکار ہے یہی ہوش کی کمی اور جوش کی زیادتی ہماری قومی و ملی تحریکات کو منزل کامیابی تک پہنچانے میں سدّ راہ بنتی رہی ہیں لیکن اس کے باوجود جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے

قومی سانحہ میں اس امر کو ایک حد تک تسلیم کرنا پڑے گا کہ اپنی بے سر و سامانی اور ضروری اسباب کی بے مائگی کے ہوتے ہوئے اس تحریک کو چلانے والوں نے ملک میں خفیہ طریقہ (روٹیوں کی تقسیم وغیرہ) کا جال اس طرح بچھا دیا تھا کہ ایک چاق و چوبند اور ملک کے ہر خطہ پر قابض و حاوی دشمن (برطانیہ) کو کانوں کان اس کی خبر نہ ملی اور اس وقت ملی جبکہ یہ تحریک ملک کے ہر گوشہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی اور پورے برّصغیر میں تیز و تند یا مدھم شعلے بھڑک اٹھے تھے۔
دہلی اور میرٹھ میں منظم طریقہ پر مغل شہزادوں اور انقلابی مولویوں نے اور اودھ میں شاہ احمد اللہ جیسے مدبّر و جانباز سپہ سالار اور بیگم حضرت محل مہارانی جھانسی جیسی جاں نثار، وطن کے جیالوں نے عوامی طاقتوں کے ساتھ اپنی جانوں کو جوکھم میں ڈال دیا تھا اور اس معرکہ میں مردانہ وار کود پڑے تھے اگرچہ نظم و نسق کی شیرازہ بندی نہ ہونے کی بنا پر یہ شرارے ملک کے مختلف خطوں میں یکے بعد دیگرے بھڑکے انگریز سامراج نے اپنے حلیفوں اور ملک کے غداروں کی ساز باز سے تھوڑے ہی عرصہ میں اس آگ کو بجھا دیا لیکن ان شعلوں کے بجھ جانے کے بعد فرنگی سامراج کی جو منتقمانہ آگ بھڑکی اس نے انسانیت و شرافت، تہذیب و تمدن کے خرمن کو جلا کر خاکستر کر دیا جس پاگل پن کا ثبوت اس مہذب قوم نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں دیا ہے اس پر اپنے تو اپنے غیر بھی چیخ اٹھے خود برطانوی مورخوں میں سے کچھ نے اس وحشت و بربریت کا کھلے بندوں اقرار کیا اور کچھ نے دبی زبان سے اعتراف کیا ہے مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے اپنی کتاب انقلاب ۱۸۵۷ء
تاریخ ہند
آکسفورڈ کے مصنف پر اس لیے احتجاج کیا ہے کہ اس پر اس نے ۱۸۵۷ء کے رنج دہ واقعات پر سرد مہری و بے اعتنائی کا ثبوت دیا۔ چونکہ فرنگی سامراج نے ۱۹۴۷ء میں ملک کے لیے ہندوستان کی عظیم الشان، زبردست بغاوتوں اور بین الاقوامی ہواؤں کا رخ دیکھ کر بوریا بستر باندھ کر آزادی کا

تحفہ ملک کی صورت میں دے دیا ہے چلتے چلتے سماج کی بے رحم تلوار نے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے جس کے ٹپکتے ہوئے خون سے ملک کی سرزمین اس وقت تک رنگین بنی ہوئی ہے اس لیے ہم پچھلی خونی تاریخ کی اوراق گردانی کو ختم کرتے ہیں البتہ ایڈورڈ ٹامسن کی کتاب انقلاب ۵۷ء کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں مصنف نے یہ ہندوستان کے رستے ہوئے زخموں اور بہتے ہوئے ناسوروں کو مندمل کرنے کے لیے اہل ہند کی اشک شوئی و دل جوئی کے لیے یہ کتاب لکھی ہے اور تاریخ میں ایک معتدل روش اختیار کر کے انگریزوں کی طرف سے صلح پسندانہ دفاع کی کوشش کی ہے لیکن اس مرقع کے اندر جو تصویریں ہیں ان میں سے اب بھی خون ٹپکتا ہوا دکھائی دیتا ہے خصوصیت سے آکسفورڈ سے شائع شدہ تاریخ ہند پر اچھی طرح لے دے کی ہے اور لکھا ہے کہ تاریخ ہند کے مصنف نے ۵۷ء کے واقعات کو ایک معمولی بغاوت کا نام دے کر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن بین السطور میں اصل حقیقتِ حال پر بھی جھلکتی نظر آتی ہے وہ لکھتا ہے۔

"غدر اگرچہ بظاہر بنگالی دستہ کی ایک فوجی بغاوت تھی اور چربی والے کارتوسوں کے استعمال سے بھڑکی لیکن آخر کار یہ صرف فوج تک محدود نہیں رہی۔ سول رعایا میں بھی بہت حد تک بے چینی اور بے اطمینانی کے اسباب موجود تھے چنانچہ بہت سے مقامات پر فوجی سپاہیوں کی بغاوت سے پہلے وہاں کی سول آبادی نے بغاوت شروع کر دی"

(تاریخ مذکور ص ۲۷)

ایک جگہ وہ لکھتے ہیں۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتداءً شمالی و وسطی ہندوستان کی فوج میں بغاوت شروع ہوئی لیکن بعض بعض خاص

اسباب کی وجہ سے اس نے وہاں کی بڑی بڑی جماعتوں میں پھیل کر ایک عالم گیر بغاوت کی شکل اختیار کی لارڈ ڈلہوزی کے عہد میں ہندوستان کے بڑے بڑے حصوں کو یکے بعد دیگرے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں شامل کیے جانے کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دلوں میں یہ شکوک پیدا ہوئے کہ کمپنی کا منشا دراصل تمام ہندوستان کو فتح کر لینا ہے اس لیے اس مقصد کے پیش نظر کمپنی نے تمام معاہدات کو پسِ پشت ڈال دیا ہے دیگر لوگوں میں عام بے چینی موجود تھی جس سے بغاوت کے رہنماؤں نے فائدہ اٹھا کر اشتہارات و اعلانات کے ذریعہ لوگوں کو غیر ملکیوں یعنی انگریزوں کی بدعہدی اور ہوسِ ملک گیری کی طرف توجہ دلائی۔ (تاریخِ ہند ص ۲۲ تا ص ۲۶)

نواب معین الدین حسن خاں نے جو محاصرہ کے وقت دہلی میں موجود تھے اس طرح بیان دیا ہے۔

"میں اپنے قصہ کو اس بیان سے شروع کروں گا کہ ہندوستان میں انگریزوں کی موجودگی ہندوستانیوں کے نزدیک مداخلت بیجا کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا اودھ کو اپنی مملکت میں ملا لینے کے بعد یہ احساس اور گہرا ہو گیا۔

(تاریخ مذکور ص ۵۷ و ص ۲۷)

ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سپاہیوں میں چربی ملے ہوئے کارتوسوں کے استعمال کی سختی کرنے پر برپا ہوا جس کے اندر لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ چربی سور یا گائے کی تھی جو دونوں قوموں کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے کا باعث بنی اس سلسلہ میں لارڈ رابرٹس سپہ سالارِ اعظم افواج برطانیہ نے اپنے خط میں لارڈ کیننگ وائسرائے کے خط کے جواب میں اعتراف کیا ہے میری رائے

کارتوسوں کے استعمال سے سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو قابلِ یقین طریقہ سے ٹھکرایا گیا جب اس ناقابلِ استعمال چیز پر اصرار کیا گیا تو سپاہی آپے سے باہر ہو گئے اور استعمال کرنے سے انکار کر دیا اس کی سزا ایسی منتقمانہ انداز سے دی گئی جو انسانیت و شرافت سے گری ہوئی تھی مگر یہی لارڈ رابرٹس پھانسیوں کے واقعہ پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"ہم پشاور سے جہلم پیادہ پا سفر کرتے ہوئے پہنچے اور راستہ میں کچھ کام بھی کرتے چلے یعنی باغیوں سے اسلحہ چھیننا اور ان کو پھانسیوں پر لٹکانا چنانچہ توپ سے باندھ کر اڑا دینے کا جو طریقہ ہم نے استعمال کیا اس کا لوگوں پر خاص اثر ہوا یعنی ہماری ہیبت دلوں میں بیٹھ گئی"

آخر میں لکھتا ہے۔

"اس کا مقصد یہ ہے کہ ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے"

(کتاب مذکور ص ۳۴)

خصوصیت کے ساتھ ۱۸۵۷ء میں مسلمان قیدیوں کے ساتھ جو سفاکانہ عمل اختیار کیا گیا اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

"مسٹر موبری تھامسن نے جو ۱۸۵۷ء میں بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے مسلمان قیدیوں کی دردناک سرگذشت سر ہنری کاٹن کو ان الفاظ میں سنائی "شام کے وقت ایک سکھ اردلی آیا اور اس نے کہا کہ یہ دیکھنا آپ پسند کریں گے کہ ہم نے قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے جب میں گیا تو میں نے ان بدبخت مسلمانوں کو عالم نزع میں بے حال دیکھا جن کو مشکیں باندھ کر برہنہ زمین پر لٹایا گیا تھا اور سر سے لے کر پاؤں

تک تمام جسم کو گرم تانبے سے داغ دیا تھا اس روح فرسا نظارے کو دیکھ کر پستول سے ان کو ختم کر دینا ہی میں نے مناسب جانا۔

(کتاب مذکور ص۴۰ باب ۱)

ہنگامہ ستاون۵۷ء کو ایک عینی شاہد بیان کرتا ہے کہ کس طرح سکھوں اور انگریزوں نے ایک مسلمان قیدی کے چہرہ کو سنگینوں سے زخمی کر کے زندہ ہلکی آگ میں جلایا بدنصیب قیدی کے جلتے ہوئے گوشت کی بدبو نکل کر آس پاس کی فضا کو مسموم بنا رہی تھی اور سکھ یورپین نہایت اطمینان اور متانت سے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر ارد گرد دیکھ رہے تھے ایک انگریز افسر مجنڈی نے دہلی ستاون۵۷ء کا حال لکھا ہے۔

"وہ رات ہم نے جامع مسجد پر پہرہ دیتے ہوئے بسر کی اور ہمارا زیادہ تر وقت ان قیدیوں کو گولی سے اڑا دینے یا پھانسی پر لٹکانے میں گذرتا تھا جن کو ہم نے صبح گرفتار کیا تھا ان میں سے بہت سے بے چارے تو اسی وقت ختم ہو گئے لیکن آخر وقت تک ان کے چہروں سے شجاعت اور ضبط کے آثار ہویدا تھے جو اس سے کسی بڑے مقصد کے شایانِ شان علامت تھی۔"

(تاریخ مذکور ص۴۶ باب ۱)

سر سارج کیمبل نے لکھا ہے

"اگرچہ یہ صحیح ہے کہ باغی سپاہیوں پر ایک قسم کا جنون مسلط تھا اور غدر کے اعلان کے بعد سپاہیوں نے ہر اس انگریز کو جو ان کے ہتھے چڑھا بے دریغ قتل کر دیا اس کے مقابل سول رعایا نے عام طور پر ہمارے آدمیوں کو پناہ دی اور جان جوکھم میں ڈال کر انگریزوں کی جان بچانے میں مدد کی۔"

(ص۴۹)

دہلی کے واقعہ میں ہے کہ باغیوں کے جرائم کے مقابلہ میں ہزارہا گنا زیادہ سنگین پاداش باشندگان دہلی کو اٹھانا پڑی ہزارہا مردو عورت اور بچوں کو بے گناہ خانماں برباد ہو کر جنگلوں اور ویرانوں کی خاک چھاننا پڑی جو مال واسباب پیچھے چھوڑ گئے تھے ان سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھونے پڑے۔ (صہ۱۷ باب ا)

جرنل نیل جو ہنگامۂ کانپور و اودھ کا ہیرو ہے اس کے سیاہ کارنامے قابلِ ذکر نہیں ہیں وہ جس گاؤں دیہات سے اپنے لشکر کے ساتھ گزرتا ان کو آگ لگاکر خاکستر بنادیتا تھا اس لیے سر سارج کیمپل لکھتا ہے۔

"نیل ان انسانوں میں سے ہے جنھوں نے شہرت اور نام آوری کے زینہ تک نہایت ہی بزدلانہ تشدد کی کارروائیوں سے رسائی حاصل کی ہے۔" (کتاب صہ۹۲ باب دوم)

ایک انگریز افسر کی چھٹی میں ان ظالمانہ سزاؤں پر اظہارِ غم اس طرح کیا گیا ہے۔

"آخر ہم کب تک بنی نوع انسان کو اس دل خراش طریقہ پر گرم سلاخوں پر سکڑتے اور بھنتے دیکھنے کی اذیت برداشت کرتے رہیں گے۔"

مسٹر نکلسن ایڈورڈ کو خط لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں

"دہلی میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کے خلاف ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہئے جس کی رو سے ہم ان کو زندہ ہی جلاسکیں یا زندہ ان کی کھال اتار سکیں یا گرم سلاخوں سے اذیت دے کر فنا کے گھاٹ اتار سکیں۔"

اسی کتاب کا مصنف ایڈورڈ ٹامسن لکھتا ہے کہ

"جن اذیتوں کی آرزو کا اظہار نکلسن سے بے چینی سے کیا تھا

اس کے پورا ہونے میں کچھ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔"
ایک انگریز افسر ایک خط میں مسٹر ہڈسن کو لکھتا ہے

"میرے پیارے ہڈسن بادشاہ کو گرفتار کرنے اور ان کے بچوں کو قتل کرنے پر تم اور تمہاری پلٹن ہر طرح کی مبارکباد کی مستحق ہے مجھے امید ہے کہ ایسے معاملات میں تم کامیاب ہو گے۔"

اب تاریخ ہند آکسفورڈ کا آخری حوالہ پیش ہے۔

غدر کے اعلان کے دس دن کے اندر تمام اودھ سے انگریزی حکومت اس طرح غائب ہو گئی تھی کہ ڈھونڈنے سے اس کا سراغ نہیں ملتا تھا فوجوں نے بغاوت کا اعلان کیا اور لوگوں نے اپنے آپ کو آزاد سمجھ کر ہم سے منھ موڑ لیا لیکن اس تمام عرصہ میں نہ کوئی منتقمانہ کارروائی عمل میں لائی گئی نہ کہیں کسی پر ظلم کیا گیا چنانچہ اودھ کے بہادر اور سرکش باشندوں نے سوائے چند مستثنیات کے عام طور پر پناہ گزیں انگریزوں کو نہایت مہربانی اور شفقت سے اپنے یہاں پناہ دی۔

(تاریخ ہند آکسفور ص ۲۲۷)

اس کے مقابلہ میں انگر مورخوں اور افسانہ نگاروں نے ہندوستانیوں کی جو تصویر کھینچی ہے وہ اس طرح ہے۔

"ہندوستانی نیم شیطان اور نیم بچہ، ناتربیت یافتہ، فارغ کتے کی طرح وفادار اور اطاعت شعار، تصوف کا شیدائی اور خیالستان میں محو لیکن ان اعلیٰ صفات کے ساتھ ساتھ اس کے اندر ایک دغاباز باغی، ایک خونخوار مذہبی دیوانہ بننے کی صلاحیت بھی موجود ہے اس کے مقابلہ میں ایک انگریز کی سیرت اس طرح ہے۔

"کہ وہ متین قابل، انصاف کی نہ ٹلنے والی چٹان اور ہر ایک کے ساتھ اس کی حیثیت کے مطابق سلوک کرنے والا انسان ہے"۔

انگریز کی سیرت خواہ کچھ ہو لیکن انگلستان کی حکومت نے ہندوستانیوں کے ساتھ جو سلوک اختیار کیا ہے اس کی صحیح تصویر امریکن مورخ ایمرسن نے ۱۸۵۶ء میں کھینچی ہے وہ لکھتا ہے۔

"انگلستان کی حکومت نے عام طور پر توریت کی مفروضہ درشت تعلیم کو اپنا شعار بنالیا ہے یہاں تک کہ انجیل کا تو پہلا صفحہ تک الٹ کر نہیں دیکھا۔

اب ہم اس قضیۂ نامرضیہ کو انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر۔ Disraeli کی تقریر پر ختم کرتے ہیں. جو انھوں نے ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو پارلیمنٹ میں کی تھی۔

"مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ بنگالی دستہ کے باغیوں نے محض فوجی تکلیفات کی بنا پر بغاوت نہیں کی بلکہ درپردہ وہ ملک کی سیاسی بے چینی کی حمایت میں اٹھے تھے دوسری قوموں کے جذبات کا احترام کرنا ہماری حکومت کا ہمیشہ سے اصول رہا ہے جس کو گورنمنٹ ہند نے گذشتہ چند سالوں سے خیرباد کہہ دیا ہے اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ملک کی تمام مقتدر جماعتیں اپنے آپ کو خطرہ میں محسوس کرتی ہیں"۔

(کتاب مذکور صہ ۵۸ باب ۱)

۵۷ء کا بھوپال

سابقہ ریاست بھوپال کا پایۂ تخت شہر بھوپال جواب ہندوستان کے رقبہ کے اعتبار سے سب سے بڑے صوبہ ایم پی کی راجدھانی ہے مشہور عالم راجہ بھوج کے آباد کردینے کے بعد عالمِ گمنامی میں صدیوں تک سوتا رہا وہ دوبارہ اس وقت انگڑائی لے کر بیدار ہوا جب سرحد کے پٹھانوں نے اس کو بیت الریاست بنایا اس کی حسن وخوبصورتی کو دیکھ کر اس پر شیفتہ وفریفتہ ہوئے اور اس کو سنوارنے اور نکھارنے کا بیڑہ اٹھایا شہر بھوپال سمندر کی سطح سے سترہ سو فٹ کی بلندی پر کوہِ وندھیاچل کی چھوٹی چھوٹی سرسبز وشاداب پہاڑیوں کے درمیان گھرا ہوا قدرتی حسین مناظر اور خوبصورت جنگلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ بھوپال تال آیئنہ سیال بن کر ان پہاڑیوں کے درمیان کٹوریوں کی طرح ہر دیکھنے والوں کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے ابتدائً ماہی گیروں کا یہ چھوٹا سا گاؤں جب نئی ریاست کا صدر مقام بنا تو اس کی حیثیت ایک فوجی چھاؤنی کی تھی۔ جہاں بانیٔ ریاست اور اس کے حمایتی خاندان اولاً آباد ہوئے مغرب وجنوب رویہ علاقہ وندھیاچل کی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا اور شمال وجنوب میدانی خطہ جو خودرو گھاس (برّو) وغیرہ سے گھیرا ہوا تھا جو شخص جتنا خطہ صاف کردیتا وہ اس کا مالک ہو جاتا آہستہ آہستہ اہلِ علم وفتویٰ، ارباب تقویٰ اور شعروادب کے قافلے اترنے لگے اور علم وادب کی بہاریں یہاں آکر ٹھہرنے لگیں۔ رؤسائے بھوپال نے آغاز ریاست سے اس حقیقت کو محسوس کرلیا تھا کہ شہر یا آبادی

صرف شاندار عمارت، بلند و بالا محلات سے نہیں بنتی جب تک اس کے باشندے جوہرِ علمی و نیک عملی، انس و محبت، صداقت و امانت انسانی کمالات اور روحانی صفات سے آراستہ نہ ہوں اس لیے یہ گاؤں ابتداءً خام اور کچے مکانات، تنگ و تاریک کوچوں اور گلیوں کی آبادی رہی لیکن وقتاً فوقتاً علمی و روحانی ادبی قافلوں کے فروکش ہونے کی بنا پر شہرت و ناموری اور ترقی کے زینہ طے کرنے لگا اٹھارھویں اور انیسویں صدی پورے ملک کے لیے افرا تفری، انتشار و برہمی کو لے کر آئیں اس لیے مختلف علاقوں کے مختلف خاندان طرح طرح پریشانیوں کا شکار ہو کر اس اجڑے دیار کا رخ کرنے لگے اور اس گوشۂ عافیت کو جائے پناہ سمجھ کر بسنے لگے اس طرح یہ قصبہ رفتہ رفتہ عام و خاص لوگوں، عالموں و فاضلوں، ادیبوں و شاعروں کے آباد ہونے پر شہر بن گیا لیکن ابھی تک زیادہ تر باہر سے آنے والے قافلے بسلسلۂ ضرورت وارد ہوتے اور اقامت کے ڈیرے ڈال دیتے خود ریاست کی طرف سے مشاہیرِ علما و فضلا اور اربابِ ادب کو باقاعدہ دعوت نہیں دی گئی تھی مگر جب فرنگی سامراج نے اپنی خفیہ سازشوں اور علانیہ مداخلتوں سے ملک پر اپنا تسلط جمالیا اور ریاست بھوپال بھی ان کے چنگل میں پھنس گئے یہاں کے فرمارواؤں کو بیرونی خطرات سے نجات ملی اور امن و امان نے اپنا چہرہ دکھایا تو اس وقت نواب شاہجہاں بیگم نے ریاست میں اہلِ علم کو دعوتِ اقامت ان کے والد ماجد نواب جہانگیر محمد خاں اور ان کی والدۂ ماجدہ نواب سکندر جہاں بیگم نے دی اور اعزاز و مراتب کے ساتھ بیرونی علمی خاندانوں کو مدعو کیا۔

(تاج الاقبال)

پھر جب ۵۷ء میں انگریزوں کی غدر و بد عہدی مغلیہ سلطنت کے ساتھ فرنگی سامراج کی عہد شکنی نے پورے ملک میں خون خرابہ کا ماحول پیدا کیا غیر ملکی حکومت نے ملک کے اصلی باشندوں کے حقوق پر ظالمانہ و غاصبانہ قبضہ کیا پرانی قائم شدہ ریاستیں اور جاگیریں ضبط کی گئیں صدیوں کے جمے جمائے خاندان

اکھڑ گئے امرا و شرفا اور غریب عوام انگریزی مظالم کا شکار ہو کر اِدھر اُدھر بکھر گئے ان کی جان و مال، عزت و آبرو خطرہ میں آگئیں تو پھر باہر سے آنے والے قافلوں کی رفتار تیز سے تیز تر ہو گئی اس طرح اس پراگندہ روزی اور پراگندہ حالی کے دور میں ارباب ضرورت کو اس چشمۂ شیریں کا علم ہوتا گیا اور ریاست کی قدر دانی کی افواہیں پھیل گئیں تو بھوپال ان ارباب علم و ادب کا مرکزِ توجہ بنتا گیا چنانچہ یہ کوروہ علاقہ ہند، بیرونِ ہند کے بے شمار علمی خاندانوں سے آباد ہو گیا ایک زمانہ میں بھوپال تال سے متصل علاقہ ریت گھاٹ عرب محلہ کہلاتا تھا اس لیے کہ وہاں یمنی خاندانوں کے علاوہ دوسرے عرب خاندان بھی آبسے تھے اور شہر سے باہر چھاؤنی ولائیتان تھی اور اب بھی ہے جہاں سرحد یاغستان و افغانستان کے نو وارد خاندان آکر آباد ہو گئے تھے ایسے ہی صوبۂ متحدہ بہار و بنگال اور پنجاب کے اہلِ علم و کمال کی بڑی تعداد شہر کے اندر بس گئی تھی اس طرح یہ چھوٹا سا شہر، عالمِ اسلام اور ہندوستان کے شہریوں پر مشتمل ایک بین الاقوامی شہر بن گیا خصوصیت کے ساتھ سرحد کے باشندوں (پٹھانوں) نے حملۂ نادری کے بعد ملک کے ہر حصہ میں جہاں بھی ان کو قدم ٹکانے کا موقع ملا اقامت کے ڈیرے ڈال دئے انہی خاندانوں میں مولانا برکت اللہ کا خاندان بھی تھا یہاں پہنچ کر بھوپال ریاست اور اس سے ملے ہوئے علاقوں میں ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں کیا ہوا اس پر روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے چونکہ عام ریاستوں میں فرنگی سامراج کے ساز باز سے بغاوت کی کوئی خاص لہر نہ پھیل سکی لیکن خود بھوپال ان شعلوں سے محفوظ نہ رہا چنانچہ حیاتِ سکندری میں ہے کہ غدر کی آگ جس طرح میرٹھ سے مشتعل ہو کر ہندوستان کے دیگر مقامات پر شعلہ ریز ہوئی تھی اسی طرح وسطِ ہند (سینٹرل انڈیا) تک اس کے شرارے پہنچ گئے چنانچہ بھوپال ریاست بھی ایک حد تک اس کے لپیٹ میں آگئی بغاوتی روٹیوں کی تقسیم باغیانہ اشتہارات کی اشاعت کا سلسلہ یہاں بھی جاری ہوا چونکہ ایسٹ انڈیا

کمپنی نے اپنی ڈپلومیسی سے بھوپال ریاست کے اصلی فرمانروا خاندان کو اقتدار سے محروم کر کے بیگمات کو تخت نشین بنا دیا تھا اس لیے اس موقع پر میاں جی فریدالدین ولد میاں جی مصلح الدین نے اس کی کوشش کی کہ ریاست کے اصل مستحق میاں جی معز محمد خاں کو برسر اقتدار لایا جائے جو شاہ رؤف احمد مجددی (شاگرد شاہ عبدالعزیز دہلوی) کے مرید تھے اور بقول حیات سکندری فوج کو تین لاکھ کی پیش کش کی لیکن خود میاں صاحب نے ادھر توجہ نہ دی البتہ ریاست کے خاندان سے فاضل محمد خاں وعادل محمد خاں جاگیردار انبہ پانی نے سکندر جہاں بیگم کو ایک خط کے ذریعہ جہاد کی دعوت دی اور پھر اس میدان میں کود پڑے بھوپال کی وہ فوج جس نے ۵۷ء میں حصہ لیا وہ بھوپال کی جمونسٹہ جمنٹ تھی جس کی کمان انگریز افسر کے ہاتھ میں تھی اور اس کا ہیڈ کوارٹر سیہور تھا بھوپال کے وطن پرست باغیوں نے اعلیٰ درجہ کی سیاسی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے ہوئے ۶/ اگست ۵۷ء میں سیہور میں متوازی حکومت (سپاہی بہادر) کے نام سے قائم کر دی یہ بغاوت ایک امتیازی پہلو لئے ہوئے تھی کہ ایک نظام کو تبدیل کرنے کے بعد متبادل نظام پیش کرنے کی شعوری کوشش کی گئی تھی ساخت کے اعتبار سے بھی قومی نقطۂ نظر سے اس نظام کو قائم کیا گیا تھا جس کے اندر ہندو مسلمان دونوں یکساں شریک تھے یونین جیک کو اتار کر دو جھنڈے ایک نشانِ محمدی دوسرا جھنڈا مہاویری لگائے گئے تھے اس انقلابی حکومت کے سربراہ ولی شاہ رسلدار اور ان کے ساتھی مہاویر کوک حولدار تھے۔ ولی شاہ نے جس وقت سپاہی بہادر حکومت کا اعلان کیا تو اس وقت اپنی پرجوش تقریر کے آخر میں یہ نعرہ دیا۔

"انسان کی زندگی خدا کی دین ہے اس ملک پر انگریز یا کسی راجہ نواب کی حکومت نہیں ہے بلکہ اس ملک کے بادشاہ بہادر شاہ ظفر ہیں اور حکومت کا اصل سرچشمہ سپاہی اور صرف سپاہی ہے اس حکومت کے قیام کے لیے جن وطن پرست لوگوں نے حصہ لیا ان میں فاضل

محمد خاں عادل محمد خاں جن کے والد دوست محمد خاں کے پرپوتے تھے پیش پیش تھے ان دونوں بھائیوں نے ریاست کے اضلاع کا دورہ کر کے بغاوت کا ماحول پیدا کیا اور ایک فوج جو دو ہزار آدمیوں پر مشتمل تھی بنائی تھی جس کا فوجی ہیڈ کوارٹر ابتداءً گڑھی (رائسین) تھا۔

جس طرح دار السلطنت دہلی کے علما کے جمِّ غفیر نے انگریزوں کے خلاف جامع مسجد دہلی میں اعلانِ جہاد کیا تھا بھوپال کے علما میں سے سرفروش علماء مسجد منکا شاہ میں جمع ہوئے اور انگریزوں کے خلاف ۱۱؍ جولائی ۱۸۵۷ء کو جہاد کا فتویٰ جاری کر دیا چنانچہ ۱۸۵۷ء میں ریاست میں ایک ایسا دن بھی آیا تھا کہ یہاں ایک انگریز افسر بھی باقی نہ رہا تھا پھر جب ریاست کی فوجوں نے گڑھی پر قبضہ کر لیا تو فاضل محمد خاں نے پیکلون کو مرکز بنایا ۶؍ جنوری ۱۸۸۱ء کو سندھیا فوجوں کی مدد سے انگریزوں نے شکست دی تو راحت گڈھ (ساگر) منتقل ہو گئے جہاں انگریزی فوجوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے ۱۲؍ جنوری ۱۸۵۷ء کو سیہور میں ایک سو پچاس ۱۵۰ انقلابیوں کو رات کے وقت بندوقوں کی باڑھ سے اڑا دیا گیا۔ بھوپال کے باغیوں کا ایک قصّہ قابل ذکر ہے کہ جب اجتماعی طور پر باڑھ مار کر شہید کر دیا گیا تو ان کی نعشیں بے گور و کفن شہر سے باہر پھینک دی گئیں۔ تین دن تک وہیں پڑی رہیں لیکن ان نعشوں پر مکھی تک نہ بیٹھی لوگوں نے اعزاز کے ساتھ دفن کیا جن میں سے ایک قبر موجودہ بس اسٹینڈ کے قریب اب تک ہے۔

بہر حال سکندر جہاں بیگم نے اپنی حکمتِ عملی سے ریاست کے اندر بغاوت کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھانے میں کامیابی حاصل کی چونکہ بذات خود وہ اس تحریک سے دلچسپی رکھتی تھیں اور ریاست کے معتمد قاضی شریف حسین اسی مشن پر دہلی بھیجا گیا تھا لیکن جب حالات نے کروٹ بدلی تو انھوں نے

خاموشی اختیار کر لی۔

اس طرح ریاست بھوپال ستاون ۵۷ء کے بعد فرنگی سامراج کے جنونی انتقام سے بچ نکلی اور باہر کے آنے والے ستم رسیدہ افراد کی جائے پناہ بن گئی انہی میں مولانا برکت اللہ کا خاندان بھی تھا۔

بھوپال کی علمی مرکزیت!

ریاست بھوپال روزِ اول سے علمائے حق کا گہوارہ رہی ہے علمائے ہند کے اکثر علمی خاندان کے اصحابِ علم و فضل نے اس خطہ کو اپنی تشریف آوری سے مشرف فرمایا دارالسلطنت دہلی کے اہل علم ہوں یا بیت الریاست لکھنؤ کے اربابِ کمال پچھلے دور کے نقلی و عقلی علوم کے ماہر و کامل علماء کے قافلے یہاں فروکش ہو کر مقیم ہوتے رہے اس امر کا اظہار اہل علم کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جس طرح اردو شاعری نے دہلی و لکھنؤ دو رنگ کے اسکول مانے جاتے ہیں دہلی کی شاعری داخلی رنگ جذباتِ دلی کی ترجمانی واردات نگاری کی عکاسی کی آئینہ دار ہے اس کے مقابل میں لکھنوی شاعری میں خارجیت

سراپا نگاری اور تصنع و تکلف کی جلوہ پیرائی کا رنگ غالب ہے اسی طرح علوم عالیہ دینیہ میں بھی ان دونوں رنگوں کا ظہور ان دونوں مرکزوں میں رہا ہے عہد قدیم سے دہلی علوم نقلی (قرآن وحدیث وفقہ) کے مرکز کی حیثیت سے معروف ہے اور لکھنؤ یا پورب علوم عقلی (فلسفہ وحکمت) کے سرچشمہ کی حیثیت سے ملک بھر میں جانا پہچانا جاتا تھا۔ فرنگی محل یا خیرآباد کے خاندان نے ان عقلی علوم میں زبردست شہرت ونام آوری حاصل کی۔ ریاست بھوپال نے جب علمی میدان میں قدم رکھا تو ان دونوں مرکزوں کے اربابِ کمال نے اپنے مروجہ علوم وفنون سے اس خطہ کو منور فرمایا۔ ولی اللّٰہی سلسلہ کے علماء کا ورود تو آغازِ ریاست سے ہی ہو چکا تھا لیکن لکھنؤ کے اُجڑ جانے کے بعد وہاں کے اربابِ فن نے بھی ان اجڑے دیار کو آباد کیا مفتی الٰہی بخش، شاہ رؤف احمد مجددی، محدث بھوپال شاہ عبدالقیوم، منشی جمال الدین صاحب مدارالمہام، مولانا سید احمد دہلوی سلسلۂ ولی اللّٰہی کے اکابر میں سے ہیں جن کے دم سے قال اللہ قال الرسول کی صدائیں اس خطہ میں بلند ہوئیں دوسری طرف حکیم انور علی لکھنوی، مولوی یوسف علی گوپامؤ، مولانا سید حسین شاہ بخاری، مولانا عبدالباری نقوی، مولانا فضل حق رامپوری معقولات کے امام تھے جنھوں نے بھوپال میں ہنگامۂ درس وتدریس کو برپا کیا۔

مزید یہ کہ نواب جہانگیر محمد خاں کے زمانہ میں علمائے یمن کی بھوپال میں آمد ہوئی مشہور ادیب شیخ احمد یمنی صاحب نفحۃ الیمن بھوپال ایک عرصہ تک رہے پھر مدارالمہام صاحب نے یمن کے مشہور علمی خاندان کے ممتاز افراد میں سے پہلے قاضی زین العابدین کو پھر شیخ حسین یمانی محدث بھوپال کو مدعو کیا جن کی وجہ سے امام شوکانی کی سند عالی کو حاصل کرنے کے لیے ہند وسندھ، بلخ وبخارا کے شائقین حدیث کے قافلوں نے شہر بھوپال کو منزلِ مقصود بنایا ہزارہا تشنگانِ علمِ حدیث اس چشمۂ صافی سے سیراب ہوئے

اس کے علاوہ اس آخری دور میں ردِّ بدعت و احیائے سنّت کے لیے سلفی تحریک اٹھی جس کے اندر براہِ راست قرآن و سنّت پر عمل کرنے کی دعوت دی جاتی تھی عرب میں شیخ عبدالوہاب ہندوستان میں مولانا شہید دہلوی، میاں نذیر حسین اور خود نواب صدیق الحسن خاں اس کے داعی ہوئے نواب صاحب نے اس سلسلہ کے علما کو بھوپال میں بلا کر ریاست کو اس تحریک کا مرکز بنایا بہر حال دہلی اور لکھنؤ اجڑ جانے کے بعد ہر مکتبۂ فکر و خیال کے اربابِ فضل و کمال شہر بھوپال میں جمع ہو گئے اس لیے عہد شاہجہانی میں بیگم صاحبہ بھوپال اور نواب صدیق الحسن خاں کی قدردانیوں نے ریاست کو مستند علمی مرکز بنا دیا یہ وہ علمی ماحول تھا جس کے اندر مولانا برکت اللہ نے ہوش و شعور کی آنکھیں کھولیں۔

خدا نے بچپن سے غیر معمولی علمی و سیاسی جوہر ان کی فطرت میں ودیعت کیا تھا جو ان کاملان علم و فن کے فیضِ صحبت سے چمک اٹھا ادھر شوقِ علم بے پایاں، محنت وجدوجہد بے کراں ادھر ان عالم و فاضل بزرگوں کی جو صحبت ملی وہ عظیم الشان تھی ان امور نے تھوڑی سی مدت میں اس ہونہار جوان کو علمی راستہ پر ڈال دیا مولانا نے مدرسۂ وقفیہ میں داخلہ لیا جو بعد میں جامعہ احمدیہ بنا۔ مولانا ذوالفقار احمد نقوی سے خوشنویسی سیکھی مولانا عبدالرشید کشمیری سے مزید اصلاح لی اس لیے ایک اچھے کاتب اور خوشنویس بن گئے مولانا کے فارسی کے استادوں میں مولانا سید عبداللہ پنجابی، مولانا محمد عمر شاگرد امام بخش صہبائی دہلوی ہیں۔ علمِ ریاضی و ہیئت مولوی ہادی حسن صاحب سے سیکھا۔ مولوی احمد گل ولایتی سے مغنی اللبیب مسجد باجوڑیان میں اور پھر حافظ عبدالعزیز صاحب سے صرف و نحو، تفسیر اس چھوٹی مسجد میں پڑھی جو اب ترجمہ والی مسجد کہلاتی ہے۔ شیخ حسین یمانی محدث بھوپال سے مسجد ماجی صاحبہ میں لب تالاب صحاحِ ستہ کی تکمیل کی۔ فلسفہ و منطق اور تفسیر بھوپال کے مشہور فاضل محقق قاضی عبدالحق صاحب سے پڑھی جن کے حواشی قاضی اور توضیح و تلویح پر حاشیہ بھوپالی کے

نام سے مشہور ہوئے ان کے اساتذہ میں شیخ العلما مولانا سید عبداللہ ملتانی، قاضی محمد ایوب صاحب پھلتی اور حکیم مولوی سید انور علی مشہور محشی بھی ہیں جن کے شاگردوں میں مولوی الٰہی بخش فیض آبادی، حکیم محسن خیر آبادی، حکیم ملا نواب لکھنوی حافظ خان محمد خاں شہیر مشہور ہوئے جو مولانا کے درس کے شریک تھے۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی نے جب تعلیمی و تدریسی زندگی میں قدم رکھا تو اگرچہ مدارس کا آغاز ہو چکا تھا مگر ابھی تک برطانوی تہذیب کا عمل دخل مشرقی تہذیب تک نہ پہنچ سکا تھا مغرب کی تاجرانہ و مادیت پرستانہ تہذیب سے پہلے ہندوستان روحانی و عرفانی تہذیب کا گہوارہ تھا اس لیے علم و عرفان (گیان ودھیان) ایک مقدس قدر اور معلمی ایک مقدس پیشہ سمجھا جاتا تھا چونکہ علم و فن اس وقت تک دنیا کے بازار میں تجارتی جنس میں شمار نہیں کیا جاتا تھا علماء علم فروشی کو معیوب سمجھتے تھے لیکن جب مغربی تجارتی تمدن نے مشرق پر غلبہ حاصل کر لیا تو پھر علم بھی تجارتی جنس بن گیا اور اس کا تقدس ختم ہو گیا اس وقت ہر اعلیٰ قدر تجارتی بن گئی ہے۔

انصاف و عدالت جو ایشیا کے اندر ہر دور میں مفت میں مل جاتا تھا وہ عدالت بھی تجارت بن گئی بہر حال اس وقت اہلِ علم خدا واسطے تعلیمی و تدریسی سلسلہ کو جاری رکھتے اور صاحب استطاعت علما طلبا کے قیام و طعام کا انتظام خود کرتے محلہ کی مسجدوں یا اپنے گھروں پر بوریوں پر بیٹھ کر شائقین علوم کے آگے گرانمایہ قیمتی جواہرات کو لٹاتے رہتے جو شخص طالب علم بن کر حاضر ہوتا گوہرِ مقصود کو پالیتا علامہ شیخ حسین کا چشمۂ فیض موتی مسجد یا ماجی صاحبہ کی مسجد میں ہر وقت جاری رہتا اور ہند و بیرونِ ہند کے طلبا آکر سندِ حدیث لیتے مولانا شاہ عبدالقیوم صاحب اور قاضی ایوب صاحب مسجد حقیقت خاں میں درس کا سلسلہ جاری رکھتے قاضی عبدالحق صاحب کابلی، قاضی مکرم کی مسجد میں ہمیشہ طلبا کی ایک جماعت کے ساتھ کھاتے پیتے، اٹھتے بیٹھتے اور علومِ معقول منقول کا درس جاری رکھتے۔

حفظِ قرآن۔ طالب علمی کے زمانے مولانا برکت اللہ کے غیر معمولی قوتِ

حافظہ کو دیکھتے ہوئے قاضی عبدالحق صاحب نے حفظ قرآن کا مشورہ دیا مولانا نے کسی استاد کی نگرانی کے بغیر خاموشی سے قرآن اس طرح حفظ کرلیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی چھ ماہ کے بعد جب رمضان میں تراویح کے اندر موتی محل کی چاندنی پر بے تکان قرآن سنایا تو بڑے بڑے جید حافظ ششدر و حیران ہو کر رہ گئے۔

(مشاہیر، ملا رموزی)

قاضی عبدالحق صاحب علم و عمل کے جامع انسان تھے شاہ عبدالقیوم صاحب سے بیعت ہو کر اور سندِ حدیث لے کر حکمتِ ولی اللہی کی روح اپنے شاگردوں میں پھونکتے رہتے تھے جس طرح پچھلے دور کے شعرا نے گل و بلبل کے پردہ میں بڑے بڑے حقائق کی ترجمانی کی ہے اسی طرح اس عہد کے علما کو صوفیانہ رمز و اشارہ میں بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا سلسلۂ ولی اللہی کے علما کو اس کے اندر خصوصی دستگاہ حاصل تھی خود شاہ صاحب کا انقلابی پروگرام جو ان کی کتابوں کے بین السطور میں چھپا ہوا ہے وہ بھی اسی ایمائی اور اشاراتی زبان میں تھا کیونکہ شخصی حکومتوں میں انقلاب کا نعرہ دعوتِ شہادت کے مرادف تھا اس لیے شاہ صاحب کی عبارات کے اشارات کے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے خصوصی فہم درکار ہے بھوپال کے یہ علما، فضلا، جن کی شاگردی کا شرف مولانا کو حاصل ہوا علم کے پہاڑ تھے اور حقائق فہمی اور حقیقت شناسی کے سمندر تھے قاضی صاحب کے یہاں مولانا نے اس درجہ تقرب حاصل کیا کہ صبح کے دو سبق قاضی صاحب کے گھر پر اور دو سبق دارالقضا جاتے ہوئے راستہ میں پڑھتے تھے۔ جامع مسجد بھوپال کے صحن میں مولسری کے درختوں کے زیر سایہ حجۃ اللہ البالغہ کا مجتہدانہ درس میں مسلسل شرکت کی جس نے اس نو عمر طالب علم کے دل میں دعوت کا بیج بویا اور شاہ صاحب کی اشاراتی زبان کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی بقول مولانا عبیداللہ سندھی "شاہ صاحب کے اشارات کی حقیقت یورپ پہنچ کر ہم پر کھلی۔"

(ذاتی ڈائری)

مولانا کی ذہانت و فطانت اور بے پناہ شوق و محنت نے ان کو بہت جلد بھوپال کے امتیازی طلبا کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا اور ریاضت سے امتیازی وظیفہ ملنے لگا اب وہ کامل یکسوئی کے ساتھ طلبِ علم میں لگ گئے موتی مسجد کے مشرقی دروازہ کے بالائی حجرہ میں رہنے لگے بقول ایم عرفان مرحوم

"یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب نواب صدیق الحسن خاں پہلی بار خستہ حال بھوپال میں آئے تو اسی حجرہ میں شروع میں ٹھہرے تھے پھر ترقی کر کے نواب بن گئے اکثر اسی حجرہ میں ایک سپاہی زادہ (مولانا برکت اللہ بھوپالی) نے قیام کیا تو وہ آگے چل کر حکومت مؤقتۂ ہند کا کابل میں وزیر اعظم بنا۔"

(کتاب ص۴۴)

پھر جب ان کے والد مولوی شجاعت اللہ کی تعیناتی پولس چوکی مہندی والی سے توشہ خانہ خاص موتی محل ہوگئی تو میاں سراج الدین مہتمم توشہ خانہ نے موتی مسجد کے حجرہ سے موتی محل کے سب سے اوپر کمرے میں رکھا پھر منشی صاحب کی سبکدوشی کے بعد میاں نور محمد جاگیر دار نے جو منشی صاحب کے دوست تھے اپنے مکان کے ایک حصہ میں جگہ دی۔

علامہ جمال الدین افغانی بھوپال میں

مولانا علوم دینی اور حکمتِ ولی اللہی سے جس دور میں ان کامل اساتذہ سے فیضیاب ہو رہے تھے بھوپال کی خوش قسمتی ہے کہ مفکرِ مشرق علامہ جمال الدین افغانی کا یہاں ورود مسعود ہوا اور علامہ اپنے ہم وطن قاضی عبدالحق کے مہمان ہوئے علامہ جمال الدین افغانی مشرق کے ان مشاہیر میں سے ایک عظیم مفکر اور جلیل القدر مدبّر عالم ہیں جن کے انقلابی افکار و خیالات نے ہندوستان و ایران،

مصر و شام و عراق اسلامی ممالک میں ایک زبردست ہلچل پیدا کر دی تھی وہ مغربی سامراج کے ڈپلومیسی کے نکتہ داں اور مغربی پالیسی کے توڑ کے حقیقت شناس تھے پورے عالم اسلام کو ایک سلک میں منسلک کر کے مشرق کی سرزمین کو انقلاب کی کڑکتی بجلیوں کی سرزمین بنانا چاہتے تھے اور مغربی اقوام کی غارت گرانہ اقدامات کو متحدہ طاقت سے روکنے کے داعی تھے مصر کی سرزمین میں فرنگی سامراج کو باہر نکال دینے کی جو اسکیم تیار کی اور آزادیٔ مشرق کی جو فصل بوئی تھی ان کے شاگرد اعرابی پادشاہ اس کے پھل بن کر نکلے اور انھوں نے انگریزوں کے خلاف اعلان جہاد کر دیا لیکن مشرقی باشندوں کی وہی دیرینہ بیماری (غداری) نے انگریزوں کے لیے راستہ صاف کر دیا اور طل الکبیر کے معرکہ میں ۱۳ر دسمبر ۱۸۶۲ء میں مصر کو شکست سے دوچار ہونا پڑا علامہ جمال الدین اس وقت حیدر آباد میں تھے جب مصری بغاوت رونما ہوئی تو ان کو کلکتہ لے جا کر نظر بند کر دیا گیا اور اعرابی پادشاہ سیلون بھیج دئے گئے۔ شیخ نظر بندی سے آزاد ہو کر افغانستان پہنچے افغانستان کے منجمد ماحول میں کسی سیاسی سرگرمی کے لیے تحریک کرنا پتھر میں جونک لگانا تھا اس لیے فرانس (پیرس) کو اپنی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنانا چاہا جب وہ ہندوستان سے گزرے تو گوالیار بیاورہ ہوتے ہوئے سیہور پہنچے اور ایک دن رات قیام کر کے بھوپال تشریف لائے اور چھاؤنی ولائتیان میں اپنے ہم وطن قاضی عبدالحق صاحب کابلی کے یہاں ٹھہرے شیخ کے ہمراہ مولوی محمود علی خاں کے والد ماجد مولوی اصغر علی خاں افغانی بھی تھے جن کو وہ اپنے چند دن قیام کے بعد بھوپال چھوڑ کر چلے گئے۔

(تاریخ افغانستان ص)

علامہ افغانی کو بھوپال کے قیام کی شہرت دو وجہ سے نہ ہو سکی اول تو یہ کہ خود ریاست ۱۸۵۷ء کے بعد نازک دور سے گزر رہی تھی برطانوی سامراج کے خوف و دہشت کی وجہ سے انگریز دشمن افراد سے ملنا خطرے سے خالی نہیں

سمجھا جاتا تھا اور علامہ کی شخصیت اس سلسلہ میں بدنام تھی دوسرے علامہ جیسے بین الاقوامی مفکر کے آتشیں خیالات اور شعلہ بار افکار کو سمجھنے کی صلاحیت یہاں کے عام مولویوں میں نہیں تھی اس لیے بھوپال میں چند مخصوص افراد ہی نے علامہ کی سیاسی بصیرت سے فائدہ اٹھایا یقیناً ان مخصوص افراد میں مولانا برکت اللہ جیسا ذہین و دانش مند عالم ہو گا جو چنگاری ولی اللہی حکمت کی ان کے استادوں قاضی عبدالحق صاحب اور قاضی ایوب وغیرہ کے ذریعہ ان کے قلب میں روشن ہوئی تھی علامہ کی صحبتوں نے اس کو مزید تیزی بخشی بہر حال مولانا ایک سحر آفریں شخصیت کے مالک تھے جس میں مفتی عبدہٗ مصری، علامہ رشید رضا مصری جیسے عرب و عجم کے بے شمار اہل علم کے دلوں میں انقلاب کی مشعل روشن کی اور اس دور کے نامی گرامی ارباب سیاست سے اپنا لوہا منوایا۔

قدرت کی یہ عجیب و غریب کرشمہ آرائی فکر انسانی کو حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ افغانستان جیسے کوروہ خطہ سے جو انقلاب و سیاست سے کوسوں دور رہا علامہ جمال الدین افغانی جیسا مفکر اور سیاست داں پیدا ہوا گویا چٹان میں سے علم و حکمت کے چشمے پھوٹے۔

مولانا برکت اللہ کا خاندان اور ولادت

ہندوستان کی سیاست میں پٹھانوں کا داخلہ کس طرح ہوا؟ اس پر ہم تاریخ بزرگان بھوپال میں مفصل روشنی ڈال چکے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نادرشاہ درانی کے حملۂ قہرمانی ۱۷۳۹ نے ان پہاڑوں کے درّوں کے درمیان رہنے والے قبیلوں کو ہندوستان کی طرف ڈھکیل دیا یہاں پہنچ کر ان سرحدی پٹھانوں نے دو ریاستیں قائم کیں ایک نجیب الدولہ نے شمالی ہند کے پہاڑی اضلاع میں جس کا پایۂ تخت نجیب آباد تھا دوسری حافظ الملک رحمت خاں نے شمالی مشرقی یوپی میں روہیل کھنڈ کی بنیاد ڈالی جو بقول ایک انگریز مصنف "ایک کم عمر فلاحی جمہوری ریاست تھی جس کی راجدھانی آملہ تھا"۔ برطانوی ڈپلومیسی نے پٹھانوں کی ان ریاستوں کو اپنے لیے پرخطر سمجھ کر اولاً روہیل کھنڈ کو ۱۷۷۴ء میں شجاع الدولہ کے ذریعہ ختم کرایا۔ شاہجہاں پور یوپی ان اجڑے پٹھانوں کا بعد میں ٹھکانہ بنا۔

پھر نجیب الدولہ کے لڑکے نواب ضابطہ خاں کے عہد ۱۷۸۶ء میں دوسری ریاست بھی ابھرنے سے پہلے موت کے گھاٹ اتار دی گئی پٹھانوں کی ان دونوں ریاستوں کے برباد ہو جانے سے جو سرحد کے نو وارد پٹھانوں کا مرکز تھیں یہ وگ (پٹھان) مختلف خطوں میں بکھر جانے پر مجبور ہوئے اس کے بعد جب حکومتِ آصفیہ لکھنؤ کی شیعہ گردی نے سنّی خاندانوں کی جاگیروں کو ضبط کرنا

شروع کیا تو اس انتشار میں مزید اضافہ ہوا جس کے نتیجہ میں یہ خاندان جس طرف سینگ سمایا ادھر نکل کھڑے ہوئے پھر ستاون کے ہنگامۂ خونی نے ہر ایک خاندان محفوظ و مامون مقامات پر پناہ لینے پر مجبور ہوا چنانچہ مولانا برکت اللہ کا خاندان بھی انہی آفت رسیدہ لوگوں میں تھا جس نے اپنے جائے قیام کو چھوڑ کر ۵۷ء کے بعد بھوپال کا رخ کیا مولانا برکت اللہ کے والد کا نام مولوی شجاعت اللہ تھا جو پٹھان خاندان سے تعلق رکھتے تھے مولانا نے خود کو اپنی تحریروں میں اچھّو خانی لکھا ہے جو غالباً ان کے قبیلے کی طرف نسبت ہے مولوی شجاعت اللہ کی بھوپال آمد کہاں سے ہوئی ؟ یعنی مولانا برکت اللہ کا آبائی وطن کہاں تھا ؟ اس سلسلہ میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا اس لیے دشوار ہو رہا ہے کہ نہ خود مولانا نے اس کو بتایا نہ کوئی مستند حوالہ مل سکا۔ مولانا کے ایک مدّاح منشی شاکر حسین نکہتؔ نے شہر بدایوں کو قبۃ الاسلام اور شمالی ہند میں مسلمانوں کا ابتدائی روحانی و دینی مرکز قرار دیتے ہوئے اپنے مختصر مضمون میں تحریر فرمایا ہے کہ مولانا کے والد مولوی شجاعت اللہ اپنے وطن مالوف بدایوں سے بھوپال آئے تھے (مدینہ بجنور ۹ ستمبر ۱۹۳۳ء)

لیکن مشہور خلافتی لیڈر غازی عبدالرحمٰن صدیقی نے (جن کا تفصیلی مضمون مولانا کی سوانح کا بڑا ماخذ ہے) نہ صرف مولانا کا آبائی وطن فتحپور بتایا ہے بلکہ خود مولانا کو بھی فتحپور کا باشندہ قرار دیا ہے۔

(اردو سہ ماہی جولائی ۱۹۴۱ء)

پھر ان کی تقلید میں مولانا غلام رسول مہر نے بھی ان کو فتحپور ہی کا بتایا ہے۔

(سرگذشت مجاہدین ص ۵۲۱)

اس لیے سب سے پہلے ہم کو اس پر غور کرنا ہے کہ کیا واقعتہً مولانا برکت اللہ کی جائے پیدائش فتحپور ہے ؟

جب ہم اس امر کو تحقیق کی کسوٹی پر رکھ کر دیکھتے ہیں تو یہ بات واقعیت

سے خالی معلوم ہوتی ہے چونکہ نصف صدی پہلے تک مولانا کو اور ان کے والد کو دیکھنے والے افراد حافظ محمد صالح پدر بزرگوار ملا رموزی مرحوم میجر عبدالسلام، مسٹر نظام الدین، مفتی عبدالہادی خاں مرحوم موجود تھے جو سب کے سب مولانا کی جائے پیدائش شہر بھوپال میں ہونے کے سلسلہ میں متفق اللسان ویک زبان ہیں اس سلسلہ کی دوسری کڑی مولانا کا وہ مکتوب ہے جو علامہ ابو النصر سید احمد بھوپالی پروفیسر جامعہ ازہر کو لکھا تھا اس مکتوب کے اندر مولانا نے اپنی جائے پیدائش کو صاف لفظوں میں تحریر کیا ہے جو صدیقی صاحب کے بیان کی کھلی تردید کرتا ہے وہ یہ ہے۔

"موچیوں کے محلہ میں کمنی گروں کی مسجد کے پاس مدرسہ سلیمانیہ کو جاتے ہوئے حکیم قادر علی کا مکان تھا ان کے فرزند کا نام صادق علی ہے اس مکان میں ہم تولد ہوئے تھے اور وہیں ہمارا نلہ گڑا ہے"۔

البتہ مولانا کی ایک تحریر سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد ماجد بدایوں اور بانس بریلی کا نام لیا کرتے تھے لیکن خود انھوں نے قطعیت کے ساتھ اپنے آبائی وطن کے متعلق کوئی صراحت نہ کی لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ اس مرد انقلاب کی ولادت گاہ ہونے کا فخر شہر بھوپال کو حاصل ہے اور وہ خود کو ہمیشہ بھوپالی ہی لکھتے رہے مزید شہادت مولانا کا وہ مکتوب ہے جو انھوں نے سوئزرلینڈ سے شاکر حسین نکہت کے نام ۱۷ر مئی ۱۹۲۶ء کو لکھا ہے

"ہماری پیدائش بھوپال میں ہوئی وہیں درس علوم معقولہ و منقولہ میں ابتدائی عمر صرف ہوئی چار سال بمبئی رہ کر انگلیسی تحصیل کی اور پھر لندن چلے گئے"۔

بہرحال ان کے پدر بزرگوار بدایوں سے آئے ہوں یا بانس بریلی سے ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے بعد سکندر جہاں بیگم والیۂ بھوپال کے عہد میں بھوپال وارد ہوئے مولوی شجاعت اللہ معمولی نوشت و خواند سے واقف اور اس دور کے

پڑھے لکھے لوگوں میں سے تھے اس لیے ان کو تلاش روزگار میں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا قصبہ سیہور بھوپال کے ایک سرکاری مدرسہ میں ملازم ہو کر وقت گذاری کرنے لگے لیکن چند ماہ جب سرکاری مدارس کا معیار تعلیم بلند کیا گیا تو وہ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے چونکہ سکندر جہاں بیگم کے دور میں بھوپال علمی ترقیات کے زینہ طے کر رہا تھا جب سیہور سے بھوپال واپس ہوئے تو ان کو محلہ موچیان میں جو اب محلہ یونانی شفا خانہ کہلاتا ہے شمنی گردوں کے پاس حکیم قادر علی صاحب کے مکان میں رہنے کو جگہ مل گئی اس وقت شہر بھوپال تنگ تاریک گلیوں، چھوٹی موٹی سڑکوں اور کچے خس پوش مکانوں کی ایک غریب بستی تھی چند شاہی محلات کو چھوڑ کر اکثر عمارتیں خام و معمولی تھیں بہر حال یہ محلہ جو راقم الحروف کا بھی آبائی محلہ ہے اور جس کی آڑی ٹیڑھی سڑکیں اور گلیاں پچھلی علمی و ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کے واقعات کو اپنے سینہ میں چھپائے ہوئے ہیں اسی محلہ کے ایک سفالہ پوش مکان کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے اندر (بقول مولانا حامد بدایونی مترجم الخلافہ) فخر الہند، علامۂ ملک، امیر سیاسیاتِ ہند، ماہر رموز حقائق ملیہ و ملکیہ مولانا برکت اللہ بھوپالی نے جنم لیا بقول مولانا موصوف مسلمانوں میں وہ پہلے شخص ہیں جو عالمگیر اتحادِ اسلامی کے داعی و نکتہ شناس ہیں اور جن کی جلالت و عظمت آج بیرونِ ہند میں ایک مسلّم حقیقت و شخصیت رکھتی ہے۔

(الخلافت ص۲)

یہی وہ بین الاقوامی شخصیت ہے جس نے نصف صدی اپنے ملک کی آزادی اور ملت کی فلاح و بہبودی کے لیے ایشیا و یوروپ کا چپہ چپہ چھان مارا جہاں لیلائے مقصد سے ہمکناری کی جھلک نظر آئی مجنون وار ہر دشت و وادی شہر و آبادی میں قدم رکھا اور ملک و ملت کی سربلندی و سرفرازی کی راہ میں اپنی جانِ عزیز کو جاں آفریں کے سپرد کیا۔

مولانا کا سنہ ۱۸۶۶ء ولادت !

مولانا برکت اللہ کی پیدائش جو شہر بھوپال میں ہوئی وہ کونسا سن تھا ؟۔ افسوس ہے کہ کوئی تاریخی دستاویز یا مولانا کا مستند بیان اس سلسلہ میں اب تک ہم کو نہ مل سکا البتہ مولانا واقعات کے بیان میں تاریخ اور سن کا ضرور حوالہ دیتے تھے یہی تاریخی رنگ ان کا فطری تھا۔ مولانا کا قیام بھوپال کا زمانہ بائیس سال اور بمبئی کا چار سال رہا وہاں سے لندن پہنچے گیارہ سال وہاں گزارے پھر امریکہ چھ سال اقامت فرمارہے وہاں سے جاپان پہنچ کر پانچ سال سکونت اختیار کر کے پھر سیاحانہ زندگی گزاری مولانا نے سنہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کو چھوڑے ہوئے تیس سال بتائے تھے اس اعتبار سے سنہ ۱۸۶۲ء ۶۳ء سالِ ولادت ہو سکتا ہے جب وہ عمر کے اس حصہ میں پہنچے جہاں سے نوشت و خواند کا آغا ہوتا ہے تو ان کے پدر بزرگوار نے جو ابتداءً معلمی کا پیشہ کر چکے تھے اپنے ہونہار بچّہ کو حروف شناسی کرائی پہلے زمانہ میں چار سال چار ماہ چار دن کا جب بچّہ ہو جاتا تھا تو اس کو ابجد خوانی کے لیے استاد کے آگے پیش کرتے تھے اس وقت ان کے والد مولوی شجاعت اللہ محکمۂ پولس میں ملازم ہو کر محلہ چھاؤنی میں تعینات ہوئے تھے جو چوکی مہندی والی کہلاتی تھی اسی علاقے میں جو اس وقت گنجان آباد ہی تھا ایک کچا مکان بنا لیا جہاں پہلے عجائب خانہ اور آج مولانا آزاد سینٹرل لائبریری ہے جب باقاعدہ تعلیمی زندگی کی عمر کو پہنچے تو اب گھر کے مکتب سے آگے بڑھ کر مدرسہ سلیمانیہ میں ان کو داخل کیا گیا جو نواب شاہجہاں بیگم کی ہمشیرہ سلیمان جہاں بیگم کے انتقال پر ان کے نام سے ابتدائی اردو فارسی کے لیے سکندر جہاں بیگم نے قائم کیا تھا۔ نواب شاہجہاں بیگم نے سنہ ۱۸۶۸ء میں تخت نشین ہو کر اس ابتدائی مدرسہ کو ترقی دے کر مشرقی دارالعلوم بنا دیا۔

مولانا برکت اللہ کے ابتدائی ہم مکتب میجر عبدالسلام مرحوم نے جو ۱۹۵۸ء
بعمر اٹھانوے سال بقید حیات تھے راقم السطور کو مولانا کے والد ماجد کی سکونت گاہ
حال بتایا مولانا کا مکان حکیم عدنان کے مکان کے دائیں جانب تھا جس کے اندر
بیری کا درخت تھا جب بیروں کا موسم ہوتا تو ہم وہاں پہنچ کر بیر توڑتے اور کھاتے
فرمایا کہ اس کا نقشہ میری آنکھوں میں اب بھی ہے مولانا اور صوبیدار میجر صاحب
مدرسہ سلیمانیہ میں فارسی عربی کی کتابیں گلستاں، بوستاں، میزان، منشعب،
مولوی محمد عمر مدرس مدرسہ سے پڑھتے۔ مولوی عثمان علی قرآن مجید پڑھاتے تھے۔
مدرسہ مذکورہ حال شفا خانہ یونانی میں قائم تھا مدرسہ کی روش تعلیمی قدیمی سادگی
پر تھی اس وقت کے اہلِ علم بوریوں پر بیٹھ کر تعلیم دیتے تھے غالباً ۱۸۷۱ء کا زمانہ
ہے راقم السطور کو مدرسہ مذکورہ میں اسی سادہ وضعی کے ساتھ تحصیل علمی کا زمانہ
۱۹۲۵ء کا یاد ہے صوبہ دار صاحب سے مولانا کم عمر تھے وہ مدرسہ چھوڑ کر اندور
جا کر فوج میں ملازم ہو گئے اور مولانا مزید تحصیل علمی میں لگ گئے۔

تدریسی زندگی

۱۸۶۸ء کے لگ بھگ مولانا نے علوم رسمیہ سے فارغ ہو کر تدریسی زندگی کا آغاز علما کے طریقہ کے مطابق حسبتہً للہ کر دیا پھر ۱۸۶۹ء میں جبکہ نواب سید علی حسن خاں خلف جناب صدیق حسن خاں مہتمم مدراس ہوئے تو باقاعدہ مدرس ہو گئے اس دور کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن بعد کی انقلابی زندگی کی وجہ سے ان کے شاگرد اپنی نسبت ان کی طرف کرنے سے بچتے تھے پھر بھی منشی اکرام حسین اکرام، عبدالقادر بیدل، عبدالشکور اخلاص اور مولوی عبدالقادر ناظم بخاری قابلِ ذکر ہیں موخرالذکر اردو فارسی مختلف کتابوں کے مصنف اور اپنے استاد سے والہانہ تعلق رکھتے تھے چنانچہ مولانا کی پراسرار گمشدگی کے بعد سب سے پہلے ان کے اورنٹیل کالج لیبر پول (لندن) کے پروفیسر ہونے کی جب خوشخبری ملی تو ان کی مبارکبادی پر ایک قصیدہ لکھا اسی طرح مولانا کے ہم عصر یا ہم مکتب افراد کی تعداد بے شمار ہے جن میں قابل ذکر مندرجہ ذیل افراد ہیں۔

(۱) مولانا عبدالحلیم صدیقی ذکا مولانا مرحوم کے بعد وہ پہلے عالم ہیں جنھوں نے ریاستی ماحول کو خیرباد کہہ کر مردانہ وار آزادئ ہند اور فلاح ملک و ملت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اولاً ناظم جمعیۃ علماء ہند پھر اس کے نائب صدر ہوئے۔

(۲) مولوی حافظ علام احمد فروغی مصنف و ہیڈ مولوی مدرسہ سلیمانیہ

(۳) میر نورالحسن خاں کلیم خلف نواب صدیق حسن خاں

(۴) مولانا عباس رفعت خلف شیخ احمد یمنی

(۵) مولوی صابر حسین صبا

(۶) مولوی عبدالباقی سہسوانی

(۷) سید حامد حسین ترمذی والد ماجد ڈاکٹر عابد حسین

(۸) سید امجد علی اشہری

(۹) مولوی شاکر حسین نکہت سہسوانی

ان کے علاوہ قاضی محمد یحییٰ صاحب، شاہ ابو احمد صاحب، پیر سید محمد یحییٰ قادری، سراج میر خاں سحر، میاں یار محمد خاں شوکت، میاں عالمگیر محمد خاں نمود بھی ان کے معاصرین میں تھے۔

مولانا برکت اللہ نے سولہ سترہ سال کی عمر میں فراغت پاکر جب تدریسی زندگی کو شروع کیا تو ۱۸۵۷ء کے بعد دوبارہ ریاست پرخطر دور سے گزر رہی تھی۔ نواب شاہ جہاں بیگم بانیٔ تاج المساجد بھوپال نے نواب صدیق حسن خاں سے عقدِ ثانی ۱۲۸۷ھ ۱۸۷۰ء میں کرلیا تھا۔ (حیاتِ شاہجہانی)

نواب صاحب کو علمی دنیا میں ایک عظیم دینی مصنف اور سلفی تحریک کے بانی کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے لیکن حقیقت میں وہ ایک مردِ مجاہد ۱۸۵۷ء کے شکست کے زخم خوردہ تھے ان کو اپنے پدر بزرگوار سید اولاد حسین قنوجی (خلیفہ سید احمد شہید بریلوی) کی طرف سے انگریزوں کے خلاف جذبۂ جہاد ورثہ میں ملا تھا لیکن اب تک بے سروسامانی اور کس مپرسی کی حالت میں خانماں برباد پھرتے رہے نہ کہیں قدم جمانے کا موقع ملا تھا اور نہ اپنے ہم خیال افراد کو یکجا کرنے کا۔ والیہ بھوپال سے رشتہ قائم ہوجانے پر انگریز دشمن تحریک برپا کرنے کا زریں موقع ہاتھ آیا انھوں نے ولی اللہی سلسلہ کے جنگ آزادی ۱۸۵۸ء سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ بانیٔ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کو بھوپال آنے کی دعوت دی گئی۔

لیکن امام قاسم العلوم اپنے تعلیمی پروگرام کی بنا پر یہاں تشریف نہ لاسکے البتہ اپنے معتمد رفیق اور دارالعلوم کے صدر مدرس مولانا سید احمد دہلوی کو بھوپال

روانہ کر دیا گیا۔ (ارواحِ ثلثہ)

اس بنا پر نواب صاحب کو اپنے ہم خیال افراد کی جماعت بنانے کی ضرورت پیدا ہوئی اور یہ بھی کہ تحریک سے غیر متعلق افراد کو چھانٹ دیا جائے اس لیے ریاست کے قدیم خیر خواہوں اور نواب صاحب کے ذریعہ آئے ہوئے جدید کار پردازوں کے درمیان سخت کشمکش برپا ہوگئی ہر فریق نے دوسرے فریق کے خلاف ریشہ دوانیوں کے جال بچھائے مگر نواب صاحب کا پلہ بھاری تھا۔ ریاست بھر میں عجیب خلفشار برپا تھا پرانے آدمیوں کا پتہ کاٹا جا رہا تھا اور اپنے نئے آدمی باہر سے درآمد کیے جا رہے تھے نواب صاحب کی ہوشمندی نے ریزیڈنسی کا ناطقہ بند کر رکھا تھا شہر میں خوف و ہراس کا ماحول پیدا ہو گیا تھا جب حکومت کو اپنے خفیہ محکمہ سے اس کی سُن گن ملی تو اس کا سراغ لگانے کے لیے برطانیہ کے مشہور پولٹیکل ایجنٹ سر لیپل گریفن کو بھوپال بھیج دیا گیا جو مالوہ ایجنسی کا پہلے بھی ریزیڈنٹ رہ چکا تھا جس نے نواب جہانگیر محمد خاں اور سکندر جہاں بیگم کے درمیان آویزش پیدا کر کے نواب صاحب کی پشت پناہی کر کے بیگم صاحبہ کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہا تھا جس کی وجہ سے نواب صاحب کے انتقال ۱۲۶۰ھ تک شہر کے امرا و شرفا کی عزت و آبرو محفوظ نہیں رہی تھی اب یہ ذاتِ شریف کابل کی مہم کو سر کر کے امیر عبدالرحمٰن کو والیٔ افغانستان بنا کر یہاں پہنچا تھا اس نے پہنچتے ہی ریاست میں افراتفری پیدا کر دی جس کے نتیجہ میں نواب صاحب کو ۱۲۹۰ھ میں معزول کر دیا گیا مولانا برکت اللہ بھی انہی نووارد خاندان کے ایک فرد تھے وہ بھی اس کی زد میں آگئے اور اس لیے موتی محل سے منتقل ہو کر میاں نور محمد خاں جاگیر دار کے یہاں آکر ٹھہرے۔

مولانا کا یہ عہد عنفوانِ شباب کا تھا جہاں پہنچ کر ہر نوجوان یا تو لذت پرستی میں گرفتار ہو کر دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو جاتا ہے یا اگر صاحب عزم و ہمت ہے تو شہرت پسندی و جاہ طلبی کے پیچھے دوڑتا ہے بیس پچیس برس کی عمر کا زمانہ عموماً غفلت اور بدمستی ذوق تماشا پسندی کو لے کر آتا ہے اس دور غفلت

میں اپنے خالق و مالک کی عبادت اور مخلوق کی خدمت سے خارزار راستہ سے ہٹ کر ہر نوجوان اپنی جسمانی آرائش و پیرائش ہوس پرستانہ امنگوں کی تکمیل کی طرف رخ کرتا ہے خود بینی و خود پرستی کے برخود غلط جذبات سے اس کا سینہ لبریز ہوتا ہے لیکن یہی وہ زمانہ ہے جبکہ مولانا نے اپنے وطنِ مالوف اپنے دوست احباب غرض جملہ ظاہری و مادی رشتوں کو توڑ کر ملک و ملت کی فلاح و بہبودی کی خاطر وادئ غربت میں قدم رکھا اور اعلیٰ نصب العین کے لیے ہر محبوب چیز سے ایسا منھ موڑا کہ پھر پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا آزادئ وطن کا یہ دیوانہ اور شمعِ حریت کا یہ پروانہ جب اس وادی میں گامزن ہوا تو آگے ہی بڑھتا گیا اور حصولِ منزل سے پہلے واماندگی کی وجہ سے کہیں بھی دم نہیں لیا بلکہ اسی راستہ میں دم توڑ دیا۔

اب یہ کہ مولانا برکت اللہ کا نواب صاحب کی اس خفیہ تحریک سے کچھ تعلق تھا کہ نہیں یہ امر پردہ تاریکی میں ہے اس دور میں نواب صاحب جیسا مدبّر و زیرک انسان نے اس نوجوان عالم کو اپنی تحریک کا رکن بنا لیا ہو کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ نواب صاحب کے صاحبزادے نواب علی حسن خاں سے مولانا کا تعلق یورپ کی زندگی تک قائم رہا وہاں پہنچ کر ان کو خط روانہ کرتے رہے نواب صاحب کی اس تحریک جہاد سے بے تعلقی اور صفائی کے لیے ان کے صاحبزادے شمس العلماء نواب علی حسن خاں کو مآثر صدیقی کے سفید اوراق کو سیاہ کرنا پڑا۔

(مآثرِ صدیقی)

بہر حال مولانا کا نواب صاحب سے تعلق رکھنا اسی تحریک کا ایک شاخسانہ ہے اس کے لیے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں — بلبل چہ گفت گل چہ شنید وصبا چہ کرد

مولانا برکت اللہ کی کتابِ زندگی کا ایک اہم باب انگریزی پڑھنے کا ذوق و شوق ہے اس دور کے عام سیدھے سادے مولویوں کے نزدیک انگریزی پڑھنا حرام سمجھا جاتا ہے لیکن کیا صاحب فکر و نظر علما اس کو حرام قرار

دیتے تھے؟ اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔

عموماً تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے مشہور کیا گیا ہے کہ مولویوں نے انگریزی پڑھنے کو حرام کہہ کر مسلمانوں کو دوسری قوموں کے مقابلہ میں پیچھے کر دیا مگر اصل واقعہ کی یہ غلط تصویر ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریز سامراج کے قدم ہندوستان میں جم گئے اور یہ بدیشی زبان ملک پر مسلط کر دی گئی تو سوال پیدا ہوا کہ انگریزی زبان اور مغربی عصری علوم کو مسلمانوں میں کس طرح پھیلایا جائے اس سلسلہ میں اس امر کو واضح کر دینا ضروری ہے کہ آیاتِ قرآنی کے مطابق "کہ مختلف زبانیں خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے"۔ (الروم)

اس لیے کوئی دانشور عالم اس کو حرام نہیں کہہ سکتا البتہ یہ سوال پیدا ہوا کہ سرکاری مدارس اور کالجوں میں جو مغربی تعلیم دی جاتی تھی وہ یورپ کے ماحول کے مطابق تھی جس کے اندر الحاد و دہریت، تبلیغ عیسائیت بھی شامل تھی اونچے درجات کے استاد خود انگریز ہوتے تھے جو اپنے ساتھ ایک تہذیب و معاشرت اور ایک فلسفۂ حیات بھی لے کر آئے تھے اس لیے ہر دردمند ملت عالم کے سامنے یہ بات آئی کہ مسلمانوں میں دینی مدارس کی طرح دنیاوی اسکولوں کا جال کس طرح بچھایا جائے اور دنیاوی اسکولوں کو کن اصولوں پر چلایا جائے؟

ایک رائے یہ تھی کہ مغربی تعلیم کو مغربی ماحول ہی میں دیا جانا مناسب ہے دوسری رائے یہ تھی کہ مغربی علوم کی تعلیم مشرقی ماحول میں دی جائے تاکہ مغربی تہذیب و معاشرت کے مضر اثرات سے نونہالانِ قوم محفوظ رہیں۔

پہلی رائے سر سید احمد خاں کی تھی جنھوں نے اسی اصول پر M.A.O. کالج علیگڈھ میں قائم فرمایا جو بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے نام سے مشہور ہوا۔ دوسری رائے بانی دارالعلوم دیوبند مولانا قاسم نانوتوی کی تھی اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اسلامیانِ ہند کے یہ دونوں محسن ایک ہی استاذ

مولانا مملوک علی (استاد دہلی کالج) کے شاگرد اور ایک ہی درسگاہ کے فیض یافتہ تھے۔ بہرحال نقطۂ نظر کے اختلاف سے رائیں الگ الگ ہوگئیں۔ مولانا نانوتوی نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز دینی مدارس کو بنالیا ان دو بزرگوں کے درمیان جو کچھ نقطۂ نظر کا اختلاف تھا وہ ان کی باہمی مراسلت "تصفیۃ العقائد" میں دیکھا جاسکتا ہے اس لیے انتہا پسند کٹر مولویوں کو چھوڑ کر کوئی بھی عالم انگریزی تعلیم کے خلاف نہ تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب مولانا برکت اللہ نے ہردے کے اسٹیشن ماسٹر بابو قادر بخش سے انگریزی کا سبق لینا شروع کیا تو عام مولویوں کے ماحول میں ناپسندیدہ قدم سمجھا گیا کیونکہ انگریزوں کے ساتھ ان کی زبان سے بھی شدید نفرت کا جذبہ عام لوگوں میں موجزن تھا۔

اب یہاں دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا کے دل میں انگلش آموزی کا شوق کیوں پیدا ہوا؟

اس کی ایک حکایت میجر صاحب کی روایت کے مطابق اس طرح ہے کہ مولانا مرحوم کے نام ایک ٹیلی گرام کہیں سے آیا چونکہ انگریزی زبان کو سوائے منشی حسین خاں اور ایک دو صاحبوں کے شہر میں کوئی نہ جانتا تھا اس لیے اس کے پڑھاتے میں دو تین دن تک دوڑ دھوپ کرنا پڑا اس لیے مولانا کو انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا۔ لیکن اس ہنگامی و وقتی ضرورت کو مولانا کے ذوق و شوق کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا جس نے ان کو بعد میں بھوپال سے جبلپور اور پھر بمبئی و لندن پہنچا دیا۔

اس لیے اس سوال کے صحیح جواب کے لیے اس اوپری سطح سے گہرائی میں اترنا پڑے گا اس سلسلہ میں بقول یوسف قیصر "مولانا کو قدیم علوم میں سب سے زیادہ مرغوب علم کلام تھا یہی کھڑکی تھی جس نے ان کے اندر عقلیت پرستی اور نیچر پرستی کی طرف میلان پیدا کیا اس لیے مغربی و عصری علوم کی جو ہوائیں پورے ملک میں تیزی سے چلائی جارہی تھیں اور عیسائی مشنریوں

کے مشن اسکولوں کا جال پھیلا کر مذہبی ماحول میں زبردست ہلچل پیدا کر رکھی تھی۔ عیسائی پادری چوراہوں پر یہاں کے مذاہب پر کیچڑ اچھال رہے تھے اپنی تقریروں کے ذریعہ عقلیت کو فروغ دے رہے تھے یہ ایسے وجوہ ہیں جو مولانا کے انگریزی زبان سیکھنے کی صحیح توجیہ کرتے ہیں اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ مولانا اپنی طبیعت کے اعتبار سے خلوت پسند اور علمی مشاغل میں یکسوئی کے ساتھ مصروف رہنے والے تھے ان کی مجلس کوئی نہ تھی سوائے میاں نور محمد جاگیردار کے یا پھر شام کے وقت حافظ غلام احمد فروغی کی کتابوں کی دکان تھی جو مسجد پیرجی کے پاس واقع تھی یہیں ان کی نشست ہوتی تھی اور مختلف موضوعات پر گفتگو رہتی تھی لیکن جب ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کا ذکر آجاتا تو بقول قیصر صاحب ان کی پیشانی پر شکنیں پڑجاتیں اپنے جذبات میں کھوجاتے بلند آواز سے چیخ چیخ کر ہاتھ ہلا ہلا کر اس طرح گفتگو کرتے کہ رستہ چلنے والے بھی کھڑے ہوجاتے اور ان کی صورت تکتے رہتے وہ جہاں بھی بیٹھتے انگریزوں کے مظالم کی دردناک داستانیں سنایا کرتے تھے جو زمانۂ غدر میں اور اس کے بعد میں ہندوستانیوں پر کیے گئے اس لیے مولانا کی حریت پسند مزاج نے ان کو بھوپال کی قید و بند کی زندگی کو خیرباد کہنے کی دعوت دی اور انھوں نے کسی سے کہے سنے بغیر ایک خطرناک راستہ میں قدم رکھ دیا۔

بھوپال سے پراسرار روانگی

مولانا مرحوم حسب معمول زندگی گزار رہے تھے میاں نور محمد جاگیر دار کے کمرہ میں قیام فرما درس وتدریس کے علاوہ خاموش زندگی کے عادی، ذوق مطالعہ میں سرشار اور علمی وفکری خیالات میں غرق رہتے تھے شہر میں نواب صاحب کی تحریک کے سلسلہ میں تحقیق وتفتیش کا سلسلہ جاری رہتا تھا نت نئے واقعات روزانہ رونما ہو رہے تھے اپنے اساتذہ کے فیض تعلیمی اور سید جمال الدین افغانی کے فیض صحبت سے فرنگی سامراج کی مکروہ ڈپلومیسی کا بھیانک چہرہ نظروں کے سامنے آچکا تھا چونکہ وہ ایک حساس طبیعت کے خوددار حریت پسند فطرت لے کر آئے تھے اس لیے ان واقعات وحوادث نے بقول نکہت "ان کی شعلہ پرور طبیعت کے لیے وہ کام کیا جو فتیلہ بارود کے ساتھ کرتا ہے۔"

کسی تازہ حادثہ سے وہ شعلہ بھڑک اٹھا اور جنوری ۱۸۸۳ء کی ایک شام اچانک پراسرار طور پر بھوپال سے غائب ہو گئے نہ خصوصی احباب کو اطلاع دی نہ ہمشیرہ کو کچھ بتایا جو ان کی اکیلی بہن تھیں اور عرصۂ دراز تک زندہ رہیں والدین پہلے ہی وفات پا چکے تھے اس ناگہانی گمشدگی پر ان کی ہر چند تلاش وجستجو کی گئی لیکن سراغ کہیں نہیں لگا کیونکہ گمشدگی کا یہ واقعہ ان کے مخلص دوستوں اور شاگردوں کے لیے موضوعِ بحث بن گیا تھا اس لیے ہر ایک ان کی

کھوج میں لگا رہا چار پانچ ماہ بعد آنے والوں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ جبلپور کے مشن اسکول میں ملازم ہو کر کرسٹان بن گئے ہیں چونکہ اس دور میں قدیمی وضع کو چھوڑ کر ہیٹ کوٹ پہننے والے کا نام کرسٹان رکھ دیا جاتا تھا۔ جبلپور پہنچ کر مولانا انگریزی کی جس اعلیٰ تعلیم کا مقصد لے کر چلے تھے اس کی جب تکمیل ہوتی ہوئی نظر نہ آئی تو چھ ماہ بعد وہاں سے بمبئی پہنچ گئے بقول صدیقی صاحب " ریاست بھوپال کے ایک عہدیدار بھائی بمبئی میں مقیم تھے انھوں نے خط لکھ کر اپنے بھائی کو مولانا کی انگریزی تعلیم کے انتظام کر دینے کا لکھ دیا تھا یہاں سے ان کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا وہ دیرینہ تمنا جو ان کے دل و دماغ میں پرورش پا رہی تھی۔ اس کے بروئے کار آنے کی شکل پیدا ہوئی بمبئی جیسے بین الاقوامی شہر میں آدمی کی ہر ضرورت پوری کرنے کا سامان موجود ہے چنانچہ مولانا نے کھیت واڑی محلہ میں ولسن ہائی اسکول (بمبئی) کے اندر داخلہ لے لیا اور ہندو پارسی کم عمر بچوں کے ساتھ ایک سبزہ آغاز نوجوان بھی شریک تعلیم ہو گیا۔ لیکن ایک دن پادری اسکاٹ مدرسہ کا معائنہ کرنے آئے تو مولانا کو دیکھ کر حیران ہوئے اور حقیقت حال معلوم کر کے اپنے لیے اردو پڑھانے خواہش کی سال ڈیڑھ سال تیاری کر کے مولانا میٹرک کے امتحان میں شریک ہوئے اور مضامین میں تو پاس ہوئے لیکن بدقسمتی سے انگریزی میں فیل ہو گئے مگر اس ناکامی نے ان کے اندر انگریزی میں کامیاب ہونے کا نیا جوش پیدا کیا اور جس مقصد عالی کے لیے اس مسافر نے غریب الوطنی کا راستہ اختیار کیا تھا وہ اس سے پیچھے نہیں ہٹا چار سال کی مدت میں خاطر خواہ انگریزی تعلیم حاصل کر کے اب مسافرِ راہِ حق نے آگے کے منزل کی تیاری کی۔ مقاصدِ عالیہ کا راستہ ہمیشہ سے کانٹوں سے بھرا ہوا رہا ہے جس کے اندر ہر دشت و صحرا زبانِ حال سے اس راستہ پر چلنے والوں کے لیے پکار پکار کر کہہ رہا ہے ؎

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب   ایک آبلہ پا وادیٔ پر خار میں آوے

مولانا برکت اللہ بھوپالی انگلستان میں

مولانا کی اپنے وطن مالوف (بھوپال) سے اچانک گمشدگی کا حادثہ ایک عرصہ تک سربستہ راز رہا جس پر تاریکی کا پردہ پڑا رہا لیکن جب ہم مولانا کی اس زندگی پر نظر ڈالتے ہیں جو بھوپال سے چلے جانے کے بعد انھوں نے اختیار کی تو یہ عقدۂ مشکل کھلتا ہوا نظر آتا ہے مولانا نے فرنگی سامراج کے ہراول دستہ عیسائی مشینریز کے عیسائی بنانے کے قصے بچپن میں اپنے کانوں سے سنے تھے پھر نوعمری میں آنکھوں سے ان کا مشاہدہ ہوا اس کے بعد علمائے اسلام کے مناظروں اور پادریوں کے مباحثوں کی گرم بازاری دیکھنے میں آئی اس لیے ان کے دل میں تردیدِ عیسائیت کے لیے اس کے اصلی ماخذ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انگریزی زبان کے حصول کا شوق ابتدائً پیدا ہوا ہو پھر جوں جوں آگے بڑھتے رہے خود انگریز سامراج کو اصلی رنگ میں سمجھنے کی خواہش بیدار ہوئی عیسائیت کے پردہ میں فرنگی سامراج حصول اقتدار کے لیے جو زمین ہموار کر رہا تھا۔ مولانا جیسا ذہین فطین عالم پر یہ حقیقت مخفی نہ رہی ہوگی اس لیے بھی انگریزی تعلیم کی تکمیل کا غیر معمولی جذبہ پیدا ہوا انھوں نے بھوپال کے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اس منجمد فضا میں اس قسم کا اقدام مخالفت کا بڑا طوفان کھڑا کر سکتا تھا۔ گریفن گردی کے دور نے شرفا و امرا کی پگڑیاں اپنی آنکھ سے اچھلتے ہوئے دیکھ چکے تھے پھر وہ نواب صدیق الحسن خاں کی جماعت کے آدمی سمجھے جاتے تھے اس لیے عزیزوں، رشتہ داروں، شاگردوں اور دوستوں سے کہے سنے بغیر سارے دیرینہ تعلقات پر لات مار کر گوہرِ مقصود کے حصول کے لیے اولاً جبلپور پھر بمبئی پہنچ کر مشن اسکول ہی میں داخلہ لیا تاکہ مشینریز کے رازِ درونِ پردہ تک رسائی حاصل کر سکیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ان جیسے ہوشمند و دانشور عالم کے بارے میں یقین کیا جا سکتا ہے کہ بمبئی کی چار سالہ زندگی میں انگریزی کو پختہ کر لینے کے ساتھ انھوں نے

عیسائی مشن کی اندرونی کمزوریوں کو بھی بھانپ لیا ہوگا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اسی اثنا میں انگلستان سے عبداللہ کوئلم کے مسلمان ہونے کی خبر نے یہاں کے مسلمانوں میں ایک کھلبلی پیدا کر دی بقول صدیقی صاحب ہر مسلمان کے دل میں ایک جوش اُبل پڑا مولانا کو بھی کوئلم کے قبول اسلام نے بے چین کر دیا سلطان عبدالحمید نے اس کو جزائر برطانیہ کا شیخ الاسلام بنا دیا تھا اس لیے مولانا کے دل میں انگلستان پہنچ کر وہاں کے شیخ الاسلام کے ہاتھ بٹانے کی ذہن و دماغ میں سما گئی جس کی تصدیق اس دور کے مورخ احسان اللہ عباسی کی تاریخ سے ہوتی ہے وہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔

"ابھی صرف ایشیا و افریقہ میں اسلام پھیلنے پایا تھا کہ دعوتِ اسلام کی خدمت شاہانِ اسلام کے بجائے فقرائے اسلام کی طرف منتقل ہوگئی یورپ تعصباتی نفرت کا شکار تھا اور وہاں کے اربابِ مذہب نے اسلام کے خلاف نفرت کو اپنا نصب العین بنا رکھا تھا بادشاہوں کو یورپ میں اشاعت اسلام کی توفیق نہ ہوئی اور فقرار کو دشمنانِ دین میں گھسنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مسلمانوں کے عہد عروج میں عمومی یورپ اسلام سے بے بہرہ رہا ہسپانیہ کے مسلمان آٹھ صدی حکومت کر کے پھر بے دست و پا کر کے نکال دئے گئے۔

ہاں ترکوں کی فتح کے بعد اسلام یورپ میں داخل ہوا اور قسطنطنیہ کے اردگرد اسلام کا زور رہا یورپ کی نشاۃ ثانیہ نے پھر مسلمانوں کیلئے کچھ جگہ پیدا کی اب مذہبی تعصب کا جوش سرد ہو چکا ہے اور مذہبِ حق کی تلاش میں عبداللہ کوئلم انگلستان میں اور محمد رسل ویپ یونائیٹیڈ اسٹیٹ امریکہ میں جو کام ہو رہا ہے اس سے اشاعت اسلام کی امید کی جا سکتی ہے اتفاق ۱۸۸۷ء میں لیورپول کا ایک عیسائی مسلمان ہوگیا خواہ وہ کتابوں کے مطالعہ سے یا مغربی افریقہ کے مسلمانوں کی

صحبت سے یا دونوں وجہ ہوں اس کو اب شیخ الاسلام ڈبلو ایچ عبداللہ کوئلم کہتے ہیں اس کی بدولت اب لیورپول میں ایک مسجد ایک اسلامی اسکول اور دو سو سے زائد آدمی اس کے ہم خیال ہو چکے ہیں الیکزینڈر رسل ویب یونائیٹیڈ اسٹیٹ امریکہ میں ایک جلیل القدر فرد تھے یہ خود مسلمان ہوئے اور اپنے ساتھیوں کو مسلمان کیا ہندوستان میں ۱۸۸۲ء میں بغرض سیاحت آئے تھے اسلامی مدرسہ ہے اور اسلامی ماہنامہ ان کے اہتمام میں شائع ہوتا ہے۔

(تاریخ اسلام ص ۴۹۸ تا ص ۴۹۹)

بہر حال عبداللہ کوئلم کے مسلمان ہونے کی خبر نے انگلستان پہنچنے کی ایک تڑپ پیدا کر دی کہ ان کے پر لگ جائیں اور وہ انگلستان پہنچ جائیں لیکن سب سے بڑا مسئلہ اس سفر کے لیے کرایہ اور زادِ راہ کا تھا غازی عبدالرحمٰن صدیقی کے والد ماجد سے جو مولانا پر بے حد مہربان اور ان کے جذبۂ دینی کے دل سے قدرداں تھے۔ اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا اور کہا کہ اگر جہاز کا کرایہ کا انتظام ہو جائے تو ولایت میں روٹی کپڑے کا انتظام خود کر لوں گا انھوں نے آدھا خرچہ خود اور آدھا خرچہ ایک میمن سیٹھ سے فراہم کر کے مولانا کو دے دیا اسی دوران مولوی ریاض الدین مدیر الریاض بریلی سے اسی مہم پر لندن جا رہے تھے ایک دوسرے کے رفیق سفر بن کر جہاز پر سوار ہو کر ۱۸۹۰ء میں ساحلِ انگلستان پر قدم رکھا اور سیدھے لیور کورٹ عبداللہ کوئلم سے ملنے پہنچ گئے پہلی ہی ملاقات میں اصلی صورت حال سامنے آ گئی کہ انگریز قوم کے یہاں مذہب و دیانت میں بھی تجارت کارفرما رہتی ہے مولانا کے رفیقِ سفر ریاض الدین پژمردہ خاطر ہو کر لندن سے ہندوستان لوٹ آئے لیکن مولانا برکت اللہ ایک نصب العین کو لے کر لندن پہنچے تھے وہ اپنی دھن کے پکے اور عزم کے سچّے تھے اس لیے لندن میں خدا کے بھروسے پر طرحِ اقامت ڈال دی۔

جس وقت مولانا نے انگلستان کی سرزمین پر قدم رکھا اس وقت دارالسلطنت لندن عظیم بین الاقوامی شہر تھا جہاں سر بفلک عالیشان سرکاری عمارات امرار ورؤساء کے پختہ و مستحکم محلات جگمگاتی ہوئی سڑکیں گرد پوش راستے آئینہ کی طرح صاف ستھری بازار پورا ملک چمن بنا ہوا ایک وسیع و عریض بندرگاہ جہاں سمندر کے سینہ پر دنیا بھر کے بحری جہاز برطانوی سمندری بیڑوں کی حفاظت میں کھڑے ہوئے ہیں ہر طرف علوم وفنون کے گرم بازار کی برٹش میوزیم، برٹش لائبریری مشرق و مغرب کے علمی نوادرات و جواہرات اور فنی عجائبات سے مالا مال تھی۔ چمنیوں سے دھواں لہراتی ہوئی ہزار فیکٹریاں، بے شمار صنعتی مراکز جہاں سے دن رات ساری دنیا میں مال روانہ کیا جاتا ہے صبح سے شام تک ہر انسان اپنی محنت و مشقت میں سرگرم، لندن کی رات برقی روشنیوں سے معمور اور ہر گوشہ بقعۂ نور بنا ہوا نظر آتا تھا ہر طرف تہذیب و شائستگی کے پھول کھلے ہوئے ہر چھوٹا بڑا ملک کے سنہری مگر چمکیلی زنجیروں میں بندھا ہوا خوش خوش زندگی گزار رہا ہے غرض جو مشرقی انسان پہلی بار اس سرزمین پر قدم رکھتا تھا۔ اس کی نگاہیں خیرہ، عقل و خرد مبہوت، ہوش و حواس ماوف اور مغربی تہذیب سے مرعوب رہ جاتا تھا۔ یہاں ہم ناظرین کی دل چسپی کے لیے اس تاریخی امر کو نقل کرتے ہیں کہ کس ہندوستانی نے سب سے پہلے انگلستان کا سفر کیا تھا؟۔

شیخ اعتصام الدین پہلا ہندوستانی تھا جو ۱۷۶۶ء میں انگلستان واسکاٹ لینڈ گیا تھا اور وہاں کے حالات شنگرف نامہ فارسی میں تحریر کیے۔ اس پہلے مسافر کے سفر کی وجہ یہ تھی کہ شاہِ عالم بادشاہ نے جب کمپنی بہادر کو دیوانی کی سند عطا کی تو بادشاہ نے آبدیدہ ہو کر لارڈ کلائیو سے کہا کہ تم نے اپنا کام تو ترحم سے نکال لیا لیکن میرا کام تو تخت دہلی پر افواج کے ذریعہ قبضہ کرانے کا نہ کیا۔ کلائیو اور دیگر افسر شرمندہ ہوئے اور کہا کہ جہاں تک

فوج بھیجنے کا ان کی ہمرکابی سے تعلق ہے وہ شاہِ ہندوستان اور کمپنی بہادر کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا میں انگلستان خط لکھ رہا ہوں فی الحال آپ الٰہ آباد میں قیام فرمائیں انگریزی فوج آپ کی حفاظت کرے گی اور یہی ہوا آگے چل کر منیر الدولہ اور شتاب رائے نے بادشاہ کی مرضی کے مطابق شاہِ انگلستان کے نام خط لکھا یہ دونوں کلکتہ پہنچے اور وہاں انگریزوں کی سازش میں شریک ہو کر ایک جعلی خط بادشاہ کی مہر لگا کر لکھا اور طے پایا کہ جارج سونٹش اور ایک ہندوستانی اس خط کو لے کر انگلستان جائیں جو ہندوستانی منتخب ہوئے وہ یہی اعتصام الدین کمپنی کے ملازم تھے کلکتہ سے چلنے کے بعد کپتان سوئلسن نے اس جعل سازی کو ظاہر کر دیا اور بتایا کہ خود کلائیو چھ ماہ بعد بادشاہ کے تحفے اور اس کا جعلی خط لے کر جائے گا۔ اعتصام الدین لکھتا ہے "یہ سن کر میرے پیروں کے تلے سے زمین نکل گئی"۔

ڈیڑھ سال بعد کلائیو پہنچا اور بادشاہ کے تحفے ملکہ کی خدمت میں پیش کیے خط کا ذکر تک نہ کیا اور مورد خسروانہ ہوا کیپٹن نے ان سے کہا کہ تمہارا اندیشہ صحیح نکلا واقعتہً کلائیو نے سخت دغابازی کی ہے اب کچھ نہیں ہو سکتا خاموش رہو جب اعتصام الدین نے کہا کہ ہم بادشاہ کو کیا منہ دکھائیں گے تو اس نے برجستہ جواب دیا کہ اب جا کر کیا کرو گے مشرقی زبانوں کا اسکول کھولو ان کی تعلیم دو یہیں شادی گھر بار ہو جائے گا لیکن اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا یہ سفر دو برس نو مہینے میں پورا ہوا یہ صنعتی انقلاب کا دور تھا جبکہ ہندوستانی دولت تیزی سے انگلستان منتقل ہو رہی تھی اس نے انگریزوں کے عقائد و اعمال پر مفصل بحث کی ہے یہ مسافر وہاں کے لوگوں کے لیے ایک اعجوبہ ہستی بن گیا ہر تھیٹر ہر تماشا گاہ میں پہنچ کر خود تماشہ بن جاتا ہندوستانی لباس اور پگڑی کو دیکھ کر ہر ایک بہروپیہ سمجھتا سب سے زیادہ جس بات سے وہ متاثر ہوا وہ وہاں کی زیر سایۂ شاہی جمہوریت ہے اس کا بے حد مداح اور اس کو ترقی کا باعث اور ہندوستان

کی اس سے محرومی کو تباہی و بربادی کا موجب قرار دیتا ہے اور غازالدین حیدر کو اس کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔

(خلاصہ شنگرف نامہ)

اس کے بعد مولویوں میں سب سے پہلے مولوی محمد اسماعیل لندنی انگلستان پہنچے ہیں کچھ مدت رہنے کے بعد وہیں کے رنگ میں رنگ گئے مذہب پر سے ان کا اعتقاد اٹھ گیا تھا۔ (نزہۃ الخواطر ص۔)

ایسے ہی اور مولوی بھی جو اس کانِ نمک میں پہنچے نمک بن گئے اور تو اور سر سید احمد خاں جیسا مدبّر و مفکر انگلستان پہنچ کر مغربی تہذیب کے سیلاب میں بہہ گئے اور نیچرل ازم کی تحریک کے داعی بن کر برطانیہ سے ہندوستان واپس ہوئے انھوں نے سائنٹیفک سوسائٹیاں قائم کیں اس وقت سائنس چونکہ مادیت کے زیر سایہ اور تابع تھا اس لیے علم تو آیا مگر اس کے ساتھ الحاد و دہریت بھی آ گئی۔

بقولِ اقبالؔ "علم عملیت پسندی کی شیریں جلوہ نما تو ہوئی مگر فرہاد کا تیشہ بھی اپنے ساتھ لائی"۔ اس کے مقابلہ میں علمائے ہند نے مشرق کی مشترکہ میراث روحانیت پر کام کیا اگر علمائے ہند کی یہ روحانی تحریک اس کے جواب میں نہ اٹھتی تو اسلامیانِ ہند میں مذہب کا جو نقطۂ اعتدال نظر آتا ہے وہ ہرگز نہ پیدا ہوتا بہرحال مولانا برکت اللہ بھی اسی دور میں انگلستان پہنچتے ہیں جس عظیم مقصد کو انھوں نے اپنے استادوں سے سیکھا تھا اور جس کے لیے عیش و راحت پر لات ماری تھی کیا وہاں پہنچ کر اس کو فراموش کر گئے؟ ایسا نہیں ہوا وہ مسافر راہ حق مخالف ماحول میں بھی منزل مقصود تک برابر بڑھتا رہا اس سے پہلے کہ مولانا کی انگلستانی سرگرمیوں کو بتایا جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت انگلستان کے ملکی سیاسی ماحول کو تاریخی روشنی میں واضح کر دیا جائے۔

انگلستان کا ملکی و حکومتی سیاسی پس منظر

تاریخ انگلستان میں ملکۂ ایلزبتھ کے سنہرے زمانہ کے بعد ملکۂ وکٹوریہ کا عہد ترقی و خوشحالی کا عہد قرار دیا جاتا ہے ولیم چہارم کا دورِ حکومت اہلِ برطانیہ کے لیے نہایت پریشاں حالی و درماندگی کا دور تھا۔ چوبیس سالہ جنگ کے بعد امن و امان نے اپنا چہرہ دکھایا تھا اسی زمانہ میں فرنس کا دوسرا انقلاب ۱۸۳۰ء میں ہوا پارلیمانی اصلاحات کا غلغلہ بلند ہوا جو لوگ قدیمی روایات و خیالات کو قائم رکھنا چاہتے تھے کنزرویٹو (قدامت پسند) اور جو لوگ قوم کی نئی خواہشات کی تکمیل کے نمائندہ تھے لبرل (حریت پسند) کے ناموں سے موسوم ہوئے ۱۸۳۲ء سے پانچ ماہ چھوڑ کر پانچ سال تک قدامت پسند طبقہ برسرِ اقتدار رہا اس دور میں قانونِ انسداد غلامی مشرقی ہند سے تجارت کی اجازت، داخلی اصلاحات، میونسپلٹی کے اختیارات ملے اور لیورپول اور مانچسٹر میں ریلوے کا اجرا ہوا ۱۸۳۷ء میں جب ملکۂ وکٹوریہ تخت پر بیٹھیں تو برطانیہ فلاکت اور جنگ زدگی کے زخموں سے چور چور تھا۔ ۱۸۳۷ء میں تار برقی کا سب سے پہلے سلسلہ جاری ہوا ۱۸۳۸ء میں بحری دخانی جہاز سے لندن سے نیویارک کے سمندر کو عبور کیا گیا۔ ملکہ کی تاج پوشی کے موقع پر عورتوں کے حق رائے دہی کے مطالبات اٹھے وزیر اعظم برطانیہ لارڈ ملبورن نے جس کو ناپسند کیا تھا لیکن ہوا کے رُخ کا اندازہ ہو گیا ۱۸۴۰ء میں کناڈا کو آزادی دی گئی ۱۸۴۱ء میں افغانی حملہ کی ناکامی انگریزوں کے لیے آفتِ آسمانی بن کر ظاہر ہوئی ۱۸۴۵ء میں وزیر اعظم پیل نے آزاد تجارت کی حمایت کی ۱۸۴۹ء میں پنجاب کا الحاق ہوا اسی سن برطانوی نو آبادی۔ نے سونے کے کانوں کا پتہ لگایا ۱۸۵۱ء میں مستقل امن و امان کے قائم کرنے کے لیے بین الاقوامی نمائش لندن میں منعقد کی گئی کہ قومیں جنگ کو چھوڑ کر صنعت کے میدان میں مقابلہ کریں

لیکن یہ توقعات سراب ثابت ہوئیں پینتیس ۳۵ سالہ دورِ امن ختم ہو کر پھر جنگ کے بادل چھا گئے ۱۸۵۱ء میں پیرس میں ہنگامہ ۱۸۵۴ء جنگ کریمیا ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کی بغاوت اور کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہوا لارڈ کیننگ پہلے وائسرائے ہوئے ملکہ نے ۱۸۷۷ء میں "قیصرۂ ہند" کا خطاب اختیار کیا ۱۸۷۸ء میں پہلی بار ہندوستانی فوجیوں کو انگریزوں کے پہلو بہ پہلو رکھ کر مصر و مالٹا بھیجا گیا ۱۸۸۰ء میں افریقہ و افغانستان میں برطانوی جنگوں کا سلسلہ جاری رہا ۱۸۶۵ء کے بعد برطانیہ کی دونوں پارٹیوں کے وزیر اعظم باری باری سے کامیاب ہوئے سب سے پہلے لارڈ جان رسل پھر لارڈ ڈزریلی اس کے بعد گلڈ اسٹون آئے لارڈ روز بری اور لارڈ سالس بری نے حزبِ مخالفت کی قیادت کی ملکہ وکٹوریہ کے پچاس سالہ دورِ حکومت میں زبردست تغیرات ہوئے۔ برطانیہ افلاس و نکبت کی دلدل سے نکل کر خوشحالی کی طرف بڑھا مسٹر گلیڈ اسٹون کی وزارت ۹۴-۱۸۹۳ء میں رہی ہوم رول کے مسودہ کے چند اجزا منظور کرائے جو عرصہ سے الجھا ہوا چلا آ رہا تھا ۱۸۹۵ء میں لارڈ روز بری کی حکومت ایک سال تک رہی پھر ۱۸۹۶ء میں لارڈ سالس بری کی حکومت بنی جو ملکہ کی بادشاہت کے اختتام تک رہی انیسویں صدی کے آخر میں جو مفید قوانین بنے ان میں خط کا محصول ایک پینی مقرر ہوا ۹۷ء میں ملکہ کا دوسرا جشن جوبلی ساٹھ سالہ منایا گیا ۱۹۰۰ء میں ملکہ نے آسٹریلیا کو آزادی دی ۱۹۰۱ء میں ملکہ سدھاریں ان کے دور میں مشینوں، ریلوں دخانی جہازوں اور تار برقی کی ایجادات نے دنیا ہی بدل دی مہینوں کی مسافت گھنٹوں میں طے ہونے لگی لندن اور نیویارک کا سفر چھ ہفتہ کا ایک ہفتہ میں ہو گیا مہینوں کی مصنوعات گھنٹوں میں تیار ہونے لگیں ان تیز رفتار آمد و رفت کے مسائل اور خبر رسانی کے ذرائع نے برطانوی تجارت کو فروغ دیا اور برطانیہ ساری دنیا پر چھا گیا اس کے علاوہ دیگر فنون میں بھی انگریز قوم نے زبردست ترقی کی فوٹو گرافی، برقی روشنی، ٹیلی فون، قدیم تاریخی انکشافات، بابلیات،

مصریات داشوریات، علم الارض، جیالوجی، علم الحیات جیالوجی، ڈاروِن اور اسپینسر کے نظریہ ارتقا نے تحقیقات نے نئے نئے گوشہ کھول دئے اگر گروٹ اور میکالے آسمانِ تاریخ کے آفتاب ہیں تو گرین فری مین کارڈنر اور کیلی کو ماہتاب کہا جا سکتا ہے اقتصادیات میں جان اسٹوارٹ مِل، فلسفہ میں کارلائل، فنونِ لطیفہ میں جان رسکن، افسانہ نویسی میں ڈکنس تھیکرے جارج ایلیٹ شاعرانہ جذبات میں ٹینی سن اور براؤننگ نے انگریزی ادب کو عالمگیر بنانے میں اہم رول ادا کیا۔

بہرحال مولانا جن توقعات کو لے کر انگلستان پہنچے تھے وہ سب سراب اور نقش برآب ثابت ہوئیں جیسے کہ گذر چکا کہ عبداللہ کوئلم نے اسلام کو ایک نفع بخش سودا سمجھ کر اختیار کیا تھا اس لیے مولانا کے رفیق سفر مولوی ریاض الدین صاحب کو دل شکستہ ہو کر ہندوستان واپس ہو گئے لیکن مولانا نے ہمت نہ ہاری اور اپنی طاقت و ہمت کے مطابق اس بے کسی و بے بسی اور مفلوک الحالی میں اپنے مشن کو قائم کرنے کے لیے وہاں جم گئے اب مولانا یکہ و تنہا رہ گئے تھے لیکن ان کے حوصلہ و ہمت میں کوئی فرق نہیں ہوا لندن کی زندگی کا معیار ہندوستان کی زندگی سے بہت اونچا تھا اس لیے انھوں نے بھوپال کی سابقہ تدریسی زندگی سے مدد لی ایک طرف انگلستان میں سول سروس کے ہندوستانی امیدواروں کو عربی فارسی پڑھانا شروع کر دیا دوسری طرف تحریری میدان میں قدم رکھا عربی فارسی مضامین کے تراجم انگریزی اخبارات و رسائل میں کر کے اس کو گزر اوقات کا ذریعہ بنایا ایک طرف عربی فارسی پڑھاتے دوسری طرف خود انگریزی لٹریچر کے لیے پختہ استعداد پیدا کرنے میں لگے رہتے تھوڑے ہی عرصہ میں انھوں نے مضمون نگاری اور مقالہ نویسی کے اندر بہترین صلاحیت پیدا کر لی اسی اثنا میں جی۔ ڈبلیو۔ ایم گبز جس کے نام سے گبر میموریل سیریز میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی مولانا اس کے ایک رکن بن گئے۔ عربی،

فارسی کی عمدہ کتابوں کی تصحیح و ترتیب میں مولانا شریک رہتے اسی زمانہ میں بقول صدیقی صاحب جی۔ ڈبلو۔ ایم گبز اپنی کتاب ترکی شاعری پر لکھ رہے تھے اس کتاب کا مقدمہ جس میں ترکی زبان کے عروض و قواعد پر عالمانہ بحث کی گئی ہے اس کے اندر مولانا کا زبردست ہاتھ ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اگر مولانا کی مدد نہ ہوتی تو یہ مضمون لکھا ہی نہ جاتا بے جا نہ ہوگا۔ مشہور مورخ اسٹین لی لین پول کے ساتھ بھی مولانا نے کام کیا اور اس کا ہاتھ بٹایا گبز کے مرنے کے بعد مولانا عسرت و تنگدستی کے پھر شکار ہو گئے اسی دور میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی نے سول سروس کے امتحان میں عربی کے پرچہ کی تیاری مولانا ہی کی مدد سے کی تھی مولانا محمد علی جیسے حریت پسند اور منچلے نوجوان کی زندگی کے اندر بعد میں جو انقلاب آیا کیا عجب ہے کہ مولانا کے فیض صحبت کا دخل ہو مولانا محمد علی کی شعلہ پرور طبیعت میں فتیلہ کو آگ دینے والی چیز مولانا کے آتشیں خیالات رہے ہوں گے۔

مولانا کی زندگی گو رسمی درویشی سے آراستہ نہ تھی لیکن ان کا رہن سہن درویشانہ و قلندرانہ تھا انھوں نے دنیاوی وجاہت اور معاشی خوشحالی سے کبھی سروکار نہ رکھا جب بھی جس قدر بھی آمدنی ہوئی اس کو خود اپنے اوپر اور دوستوں پر خرچ کیا پروفیسر آغا مرزا عباس شوستری جو آوٹ لائن آف اسلامک کلچر کے مصنف ہیں جنھوں نے لندن کی زندگی میں مولانا سے تعلیم حاصل کی تھی انھوں نے لندنی زندگی کی کہانی مولانا محوی کی زبانی اس طرح بتائی ہے

"مولانا کی قیام گاہ سادہ ٹوٹی پھوٹی سکنڈ ہینڈ کرسیاں ظاہری ٹیپ ٹاپ سے دور مختصر سا کمرہ مگر صاف و ستھرا حالانکہ اس وقت ان کی علمی سرگرمیوں کا چرچا لنڈن کے مختلف حلقوں میں پھیل چکا تھا بڑے سے بڑے اہم افراد ان سے تعارف تعلقات میں فخر محسوس کرتے تھے برطانوی اخبارات میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے خصوصیت سے لنڈن ٹائمس ان کے

آرٹیکل اہتمام سے شائع کرتا تھا اس دور میں ایک ہندوستانی کے لیے اس سے بڑھ کر فخر و ناز کا اور کونسا سرمایہ ہو سکتا تھا لیکن مولانا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا ؎

کہ عنقارا بلند است آشیانہ

جب ان کے ہاتھ میں پیسے آتے تو بے تکلف خرچ کر ڈالتے اور خالی ہاتھ ہوتے تو کھانا چائے کے لیے کبھی کبھی ارشاد فرمادیتے "میں اس خدمت کی انجام دہی کو اپنی خوش قسمتی قرار دیتا"۔

بارہا ایسا ہوا کہ مولانا سنتِ پیغمبریؐ کے مطابق بھوک اور فاقہ سے دوچار چہرہ سے اس کے آثار بھی ظاہر لیکن قانع و صابر۔ میں پہنچا مولانا نے رخصت کیا اور فرمایا دو گھنٹہ بعد آنا جب دو گھنٹہ بعد حاضر ہوا تو ایک آرٹیکل مع خط اور اخبار کے پتہ کے مرحمت فرمایا جب اخبار کے دفتر پہنچا اور خط بھیجا تو بعض اوقات ایڈیٹر خود باہر نکل آتا اور خندہ پیشانی سے ملتا پوچھتا تم کون میں عرض کرتا کہ مولانا کا ادنیٰ شاگرد ہوں فوراً شکریہ کے ساتھ دو تین پونڈ معاوضہ دے دیتا اس کو لے کر جب حاضر خدمت ہوتا تو قبلہ اسی وقت اعلیٰ درجہ کا کھانا منگواتے اور ہم طعامی و ہم کلامی کا شرف بخشتے پھر تفریح کے لیے پارک جا رہے ہیں ہر ایک بل خود ادا کر رہے ہیں سب سے بڑا تعجب مجھے اس پر ہوتا کہ مولانا کے دوستوں اور شاگردوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی لیکن کسی کے آگے اپنی ضرورت کا اشارتاً اظہار کیا نہ صرفِ شکایت زبان پر لائے وہ ہر ایک کے لیے بارِ خاطر بننے کے بجائے یارِ شاطر رہے لندن کے مخصوص حلقوں میں جس کے اندر خود انگریز بھی شامل تھے بڑے بڑے موثر انداز میں ہندوستان کی اقتصادی بدحالی اور اس کے وجوہ اسباب پر ایسی مدلل گفتگو اور مفصل تقریر کرتے کہ ہر ایک کو قائل ہونا پڑتا وہ ثابت کرتے کہ ہندوستان کی خستہ حالی صرف انگریز صنعت کاروں کی وجہ سے نہیں بلکہ حکومتِ برطانیہ پر بھی اس کی

ذمہ داری ہے قیام لندن کے اس ہفت سالہ قیام میں مولانا کی شہرت علمی وادبی، سیاسی وسماجی حلقوں تک پھیل گئی تھی۔

مولانا کی لیورپول میں تبلیغی ودینی سرگرمیاں!

جب مولانا کی عربی وفارسی اور مشرقی زبانوں پر کامل مہارت اور انگریزی زبان پر قدرت اور غیر معمولی قابلیت کا شہرہ ہر جگہ ہوگیا تو اب وہی عبداللہ کوئلم جنھوں نے شروع میں مولانا کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا تھا اب مسلم انسٹیٹیوٹ آف لیورپول کے لیے دعوت دی یہ ایک تبلیغی جماعت تھی جس کے اندر ترک وایرانی وافریقی علماء وعوام شامل تھے مولانا کی تحریر وتقریر کے اب مزید جوہر کھلے تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز ہوگیا اور ان کی دلی تمنا برآئی اس ادارہ کے دونوں جریدوں" دی کریسینٹ" اور دوسرا ماہنامہ" اسلامک ورلڈ" میں مولانا کے مضامین کا سلسلہ شروع ہوگیا چونکہ انگلستان پہنچ کر جو نیا تجربہ ہوا تھا وہ صحافت (جرنلزم) کا تھا عربی وفارسی زبان کے ساتھ انگریزی زبان پر قدرت نے ان کے لیے قبولیت کے دروازے کھول دئے وہ لیورپول یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں عربی کے پروفیسر بمشاہرہ ڈیڑھ ہزار روپیہ کردئے گئے مولانا کے لندن کے قیام کی پہلی اطلاع ان کے اہلِ وطن کو اس میگزین سے ملی جو ملکہ کی جوبلی پر شائع ہوا تھا پھر یہ دونوں پرچے جو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچتے تھے اس کی کاپیاں بھوپال کے احباب کو بھی بھیجی جانے لگیں اس مژدۂ جانفزا کو سن کر مولانا کے ایک عزیز ولائق شاگرد عبدالقادر ناظم بخاری نے اپنے سفرنامہ میں یہ مضمون نظم کیا جو پیش کیا جارہا ہے۔

برکت اللہ کہ بود یکتائے　　در علوم و فنون دانائے
زاد و بوش گرچہ بلہ بھوپال　　در فضائل کمال داشت جمال
ہیچ علمے مو بند کزو ماندہ　　ہیچ فنِّ بند کہ کم راندہ
چوں بہ فنّ و علوم یک تن شد　　رخت برداشت سوئے لندن شد
دل لورپول شد پروفیسر　　از پئے کالج علوم و ہنر
پانزدہ صد مشاہرہ دارد　　با زمانہ مصارعہ دارد
از کیائے فرنگ زد لرزاں　　علمائے فرنگ زد پیچاں
ہمہ بطریقِ دہر منفعلند　　می کشند از دلائلش چہ گزند
در ترقیٔ دیں بکوشیدہ　　عالمِ سوئے دیں بگردیدہ
در لورپول ہزار نصرانی　　برگرفتند ظہور د مسلمانی
من ازاں نور دیدۂ اسلام　　درس بگرفتہ ام علوم تمام
من علوم زبان تازی را　　زاں بیا موختم بہ طبع رسا
ہر چہ دارم دریں علوم عمل　　زاں یگانہ است جملہ مستحصل
چوں بملک دگر در افتاد است　　بہر تحصیلِ مال پا دادہست
پس دعا می کنم کہ رب مباد　　خاتمہ خیر بہر او بکناد
بہ رہ دیں ثبات او دارد　　تا قیامت حیات او دارد

اس نظم سے مولانا کی تبلیغی سرگرمیوں پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاتھ پر ہزار آدمی مسلمان ہوئے ۔ واللہ اعلم

لیورپول کے آنے کے بعد مولانا کی ابتدائی پرمشقت زندگی کے خوشگوار ثمرات ظاہر ہونے لگے تنگدستی اور مفلوک الحالی کے تاریک سائے جوان کی زندگی پر پڑ رہے تھے چھٹ گئے خوشحالی اور فارغ البالی کے دور کا آغاز ہوگیا جیسا کہ ان کے اس خط سے ظاہر ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے قدیم محسن نواب علی حسن خاں

لندن سے لکھا تھا۔

"میں آج بھوپال کے مدرسہ میں علوم عربیہ دینیہ کی تعلیم حاصل کر کے اس قابل ہوگیا ہوں کہ مجھے ولایت میں عربی کی پروفیسری مل گئی ہے اور میری حالت کا آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جو تنخواہ مجھے آپ کے محکمہ سے دس روپے ماہانہ ملا کرتی تھی اس سے زیادہ قیمت کا میں اس وقت جوتا پہنے ہوئے ہوں اور جس تنگ و مختصر کوٹھری میں وہاں زندگی بسر کی تھی اس سے بڑا کشادہ اور ہوا دار میرا کمرۂ مطالعہ ہے۔"

مولانا مرحوم کا لیورپول پانچ چھ سال سے زائد قیام رہا جس کے اندر درس و تدریس کے علاوہ اپنے تبلیغی ذوق وشوق کی بھی تکمیل فرمائی ان کی تبلیغی خدمات کا دائرہ نہ صرف لندن تک بلکہ اس کے مضافات تک پھیلا ہوا تھا مگر اسی کے ساتھ ہندوستان پر برطانوی استبداد اور غلامی کے خلاف آزادیٔ ہند کے نصب العین سے وہ کبھی غافل نہیں ہوئے ان مجلسوں میں ہندوستان سے آنے والے لوگوں میں ملاقات یا تبادلۂ خیالات کا موقع ہاتھ لگ جاتا تھا اور ہندوستان کی سامراجی سیاست کے مکروہ احوال سے بھی واقفیت حاصل ہو جاتی۔

لندن میں محفلِ میلاد

مسلمانِ مصر و ایران و ترکی نے ایک مجلسِ میلاد کا ۱۲ صفر ۱۳۶۴ھ مطابق ۲۲ اگست ۱۸۹۵ء میں خصوصی اہتمام کیا جس کے اندر مولانا برکت اللہ بھوپالی خصوصی مقرر تھے مسٹر جعفر قادر بھائی کی استدعا پر مولوی رشید الدین صدر انجمن اور مولانا مرحوم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حمیدہ پر پاکیزہ و مؤثر تقریر فرمائی چونکہ اس مجلس میں غیر مسلموں کی بھی تعداد تھی اس لیے مولانا

برکت اللہ نے قرآن کے ابدی معجزہ ہونے کو موثر طور پر بیان فرمایا اور بتایا کہ قرآنی صداقت کی روشن دلیل یہ ہے کہ اس کے اسلوب میں اس کے مضامین میں کہیں بھی اختلاف کی جھلک نہیں آیات قرآنی کی تفسیر کے ساتھ اطاعت امیر اور خلیفۂ اسلام کے احکام کی تابعداری دانشمندانہ پیرایہ میں بیان کیا یہ جلسہ شیخ الاسلام عبداللہ کوئلم کے دعائے خیر پر اختتام پذیر ہوا جس کے اندر سلطان عبد الحمید ثانی اور دیگر مسلمانانِ عالم کے لیے دعائے خیر کی گئی نووارد ہندوستانیوں سے ملاقات کا اچھا موقع ملا دوسرا جلسہ جس کی روداد دستیاب ہوئی ہے وہ انجمنِ اسلام لندن کا ہے جو ۲۱ ستمبر ۱۸۹۶ء میں ایک نومسلم حاجی محمد عمر ڈالی کی دعوت پر لندن کی عارضی مسجد میں ہوا جس کے اندر ایک لیڈی کو مشرف بہ اسلام کیا گیا اور مراکش کے ایک معزز شخص سے اس کی شادی کر دی گئی اور ایک ریزولیشن پاس کیا گیا جس کی تائید میں مولانا برکت اللہ بھوپالی نے تقریر فرمائی وہ یہ ہے۔

”روئے زمین کے مختلف خطوں سے آئے ہوئے مسلمانوں کی یہ مجلس اس یکطرفہ اور نامنصفانہ شورش و تحریک کو جو سلطنت برطانیہ میں دولتِ عثمانیہ و ترکیہ کے برخلاف پھیل رہی ہے سخت نفریں کا اظہار کرتی ہے اور ساتھ ہی وہ خلیفۃ المسلمین اور مذہب اسلام کی شان کے خلاف انگریزی اخبارات پادریوں کے خطبوں اور لکچراروں کی تقریروں میں جو ناگفتہ بہ بد کلامی کھلے بندوں کی جاتی ہے اس پر سخت ملامت کرتی ہے۔“

عالم اسلام کا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ نہ صرف عالم اسلام بلکہ ساری دنیا میں ترکی سے ہزاروں میل دور بسنے والے مسلمان سلطانِ روم کو اپنا دینی و مذہبی پیشوا مانتے تھے اور ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے اس حقیقت سے مغربی حکومتیں بخوبی واقف تھیں اس لیے ان کی متحدہ کوشش یہی تھی کہ

خلافت کے اس مقدس روحانی رشتہ کو جو مسلمانانِ عالم کو ایک کڑی میں متحد ومنظم کرتا ہے اس کو پارہ پارہ کر دیا جائے۔

علاوہ ازیں چونکہ لندن دنیا کے بین الاقوامی شہروں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر تھا اس لیے جس طرح دنیا کے ہر آدمی سے وہاں واسطہ پڑتا تھا اسی طرح وہاں کے اخبارات ورسائل بھی دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچتے تھے اسلامک ورلڈ دی کریسنٹ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے رسالے بھی ہر جگہ پہنچائے جاتے تھے آسٹریلیا جو ایک برطانوی مقبوضہ تھا وہاں بھی یہ اخبار ان مسلمانوں تک پہنچتا تھا جو مشرقِ ممالک سے محنت ومزدوری کے لیے وہاں جاکر بس گئے تھے اس لیے جب بعد مولانا جاپان پہنچے تو اس خطہ کے مسلمانوں کیلئے آپ شخصیت اجنبی نہ تھی جس سے مولانا کے کاز کو زبردست تقویت پہنچی یہ مسلم انسٹی ٹیوٹ جو خلیفۂ اسلام سلطان عبدالحمید خاں کے زیرِ سرپرستی قائم ہوا تھا اس کو بیرونی مسلم حکومتوں سے بھی امداد ملتی تھی چنانچہ افغانستان کے امیر عبدالرحمٰن خاں کے منجھلے صاحبزادے نصراللہ خاں ۱۸۹۵ء میں لندن تشریف لائے تو انھوں نے پچیس ہزار کی خطیر رقم اس ادارے کو دی تھی

(تحفۂ محمدیہ شمارہ ۶ ۱۹۲۱ء)

۱۹۱۵ء

یہاں پہلی بار مولانا کی ملاقات امیر موصوف سے ہوئی جو بعد میں سفرِ کابل کارآمد ثابت ہوئی اگرچہ اب تک مولانا برکت اللہ کی سرگرمیوں کا دائرہ براہِ راست علمی وادبی اور تبلیغی رہا لیکن اپنے ملک کی سیاست اور عالمِ اسلام کے سیاسی حالات سے بے گانہ نہیں رہے نہ لندن جیسے زبردست سیاسی شہر میں رہ کر کوئی بھی ان احوال سے نابلد ہوکر رہ سکتا ہے چنانچہ اس دور میں وہی حکومتِ برطانیہ جو ۵۷ء کے ہنگامہ میں مسلمانانِ ہند کے آتشیں جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے خلیفۂ اسلام کے پیغام دوستی کو گھر گھر پھیلا رہی تھی اب وہی برطانوی ڈپلومیسی ترکی خلافت کو آنکھیں دکھانے لگی دولِ یورپ کے خیال کے مطابق

یورپ کے اس مردِ بیمار کے لیے کفن دفن کی تیاریاں شروع کردیں بلقانی ریاستوں کو بغاوت کے لیے اکسایا گیا اور تمام سامراجی حکومتوں نے ترکی کے خلاف ایک خفیہ متحدہ محاذ بنایا جس کے اندر برطانیہ کے مشہور وزیر اعظم مسٹر گلیڈ اسٹون پیش پیش تھے جو پہلے کنزرویٹو پارٹی کے ممبر تھے اور برطانوی سامراجی پالیسیوں کی کامیابی کی بنا پر چار بار مسندِ وزارت پر فائز ہوئے بعد میں زمانہ کی ہواؤں کا رخ دیکھ کر لبرل ازم کا دم بھرنے لگے لیکن مسلمانوں خصوصاً ترکوں کے خلاف آتش فشانی میں کسی دور میں بھی پیچھے نہیں رہے یہی وہ فرعون صفت وزیر اعظم ہیں جس نے ایک بار پارلیمنٹ میں ہنگامہ ستاون کے بعد تقریر کرتے ہوئے نشۂ غرور میں یہ گستاخانہ جملے ادا کیے تھے۔

"اب برٹش گورنمنٹ اس قدر مضبوط و مستحکم ہوگئی ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کو شکست نہیں دے سکتی اگر آسمان بھی ہمارے سروں پر گرنا چاہے تو ہم اس کو سنگینوں پر روک لیں گے۔"

مسٹر گلیڈ اسٹون پہلی وزارت ۱۸۷۴ء میں اپنی کمزور خارجہ پالیسی کی وجہ سے شکست کھا چکے تھے پھر بھی وہ خلیفہ اسلام اور حکومت ترکیہ کی شدت سے مخالفت کرتے رہے انھوں نے ۱۸۷۶ء میں یلغاریہ کے خطرناک حادثات اور مشرق کا مسئلہ نامی کتاب میں ترکی خلافت کے خلاف کھل کر لب کشائی کی پھر مسٹر کارلائل نے اپنے جوش تحریر میں دول یورپ کے خفیہ منصوبہ کا بھانڈا پھوڑ دیا اور لکھ دیا کہ سلطنتِ ترکیہ کو عنقریب ٹکڑے ٹکڑے کردیا جائے گا۔ انگلستان کا دولِ مغرب سے سمجھوتہ ہوگیا ہے کہ روس اور آسٹریلیا ترکوں کی سلطنت آپس میں تقسیم کرلیں انگلستان نہر سوئز کی حفاظت کے لیے مصر پر قبضہ کرلیں بد قسمتی سے یہی خیال اس سے پہلے شہزادہ بسمارک نے ظاہر کیا تھا کہ ترکوں کو بالکل نیست و نابود کردیا جائے اور ترکی کے ملک کو ایماندار اور مہذب یورپ کی حفاظت میں چھوڑ دیا جائے (تاریخ انقلاب ترکی ص ۳۶ تا ص ۴۸)

یہی مسٹر گلیڈ اسٹون نے ۱۸۶۹ء میں جبکہ ان کی آخری وزارت کا دور ختم ہو رہا تھا آرمینیہ کے مسئلہ پر ترکوں خصوصاً خلیفۂ اسلام سلطان عبدالحمید خاں ثانی پر اپنے بسلسل اپنے مراسلوں میں شدید نفرت کا اظہار کیا تھا سلطان کو جابر و ظالم سفاک و خونخوار کے ناپسند الفاظ سے یاد کیا تھا اور بلقانی سلطنتوں کو متحدہ محاذ بنا کر ترکوں کے خلاف بغاوت کرنے کو ایک سچی مسیحی دینی خدمت اور عام انسانیت کا فرض بتایا تھا اس معاملہ میں وہ لارڈ روزبری کے مکمل ہمنوا تھے۔

مولینا برکت اللہ بھوپالی کی گلیڈسٹون کے خلاف معرکۃ الآراء تقریر

جب اس معزول وزیر اعظم کی تیر و نشتر سے بھری ہوئی تقریروں سے عالم اسلام کا دل چھلنی ہو رہا تھا اور خلیفۂ اسلام ترکوں اور مسلمانوں کے خلاف اس کے زہریلے بیانات پوری فضا کو مسموم کر رہے تھے تو اب مولانا برکت اللہ بھوپالی کا پیمانہ صبر و ضبط چھلک اٹھا اور جس شخص نے دینی دعوت کو اپنا مطمح نظر بنایا تھا مجبوراً اس کو سیاست کی خارزار وادی میں کودنا پڑا اور وہ تلوار جو اب تک نیام میں چھپی ہوئی تھی لیورپول کے اسی میدان میں بے نیام ہو کر چمکی جو خود گلیڈ اسٹون کی جنم بھومی تھی مسٹر گلیڈ اسٹون کا تقریری جلسہ لیورپول میں ہونا طے ہو چکا تھا جب اس ہونے والے جلسہ کا چرچا ہوا تو مولانا برکت اللہ اور عبداللہ کوئلم نے اس کی مخالفت میں ۲۳ ستمبر ۱۸۹۶ء میں جلسہ کرنا طے کیا چنانچہ یہ جلسہ تاریخ مذکور میں عبداللہ کوئلم کی زیر صدارت منعقد ہوا جس کے اندر مولانا نے ایک معرکۃ الآرا تقریر کی۔ اپنی آتشیں خطابت سے خلافتِ اسلامیہ کے مخالفوں کے پرخچے اڑا دئے اور مسٹر گلید اسٹون کو آڑے ہاتھ لیا مولانا نے یاد دلایا کہ ۱۸۵۷ء میں ملکۂ وکٹوریہ نے خلیفۂ اسلام سلطان عبدالحمید خاں اور شیخ الاسلام ترکیہ سے ہندوستانی مسلمانوں کے نام

صلح دوستی کا پیغام جاری کرایا تھا اور تحریک آزادی کو کمزور دونا کام بنانے میں اس فرمان کے ذریعہ حکومت ترکی سے مدد حاصل کی تھی آج اسی ملکۂ وکٹوریہ قیصرۂ ہند کے دور میں سابق وزیر اعظم گلیڈ سٹون اسی خلیفۃ المسلمین کے خلاف لب کشائی بلکہ ہرزہ سرائی پر اتر آئے ہیں وہ اس بات کو بھول گئے کہ انگلستان کے حکمرانوں کو یہ شہنشاہیت کس طرح نصیب ہوئی مولانا کی یہ پہلی سیاسی تاریخی تقریر تھی جس نے برطانوی حکومت کے سینہ (لندن) میں ہلچل پیدا کردی پریس نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا مولانا کی حسنِ خطابت اور تقریری مہارت سے عام لوگ آشنا ہوئے اور یہ بھی پتہ لگ گیا کہ مسٹر گلیڈ اسٹون جیسے فرعون کے پہلو میں ایک موسیٰ بھی موجود ہے اور وہ ہندوستان کے ایک خاموش مفکر و مدبر مولانا برکت اللہ بھوپالی جو ایک طرف علم و ادب کے حلقہ میں قلم کے دھنی ہیں تو دوسری طرف میدانِ سیاست کے شہسوار بھی ہیں مولانا کا کھل کر میدانِ سیاست میں آنے کا یہ پہلا موقع تھا مولانا کی تقریر سے پہلے شیخ الاسلام عبداللہ کوئلم نے ایک قرارداد پیش کی جس کے اندر انھوں نے کہا۔

" دولتِ ترکیہ کے خلاف موجودہ صلیبی جنگ کی تحریک ایک سخت شرارت آمیز شورش ہے پہلی صلیبی لڑائیاں یورپ میں کچھ کم تباہیاں نہ لائی تھیں اگر موجودہ لڑائی کو چھیڑ دیا گیا تو جہاد کا اعلان کرنا لازمی ہو جائے گا جس سے ہر مسلمان ہلالی جھنڈے کے گرد جمع ہو جائے گا۔ ترکی میں تمام مذاہب کے رعایا کے ساتھ بے تعصبانہ برتاؤ ہے آرمینی صرف اپنے فساد پرور شورشوں سے تکلیف اٹھا رہے ہیں آخر میں موجودہ شورش کے خلاف قرارداد پیش کی گئی جس کی تائید میں تقریر کرتے ہوئے مولانا برکت اللہ بھوپالی نے ہندوستانیوں پر ڈھائے گئے مظالم کے دفتر کھول دئے جن سے اہل انگلستان واقف نہ تھے اور ۱۸۵۷ء سے اس وقت تک کے مظالم ایک ایک کر کے بتائے۔ مولانا کے اس جلسہ کا اثر یہ ہوا کہ دوسرے دن گلیڈ اسٹون نے اپنے جلسہ میں اس قدر تلخ گفتاری اختیار نہ کی جو اس کی دیرینہ عادت بن گئی

تھی ابھی تک مولانا کی سرگرمیاں خفیہ پولس کی رپورٹ کے مطابق حکومت برطانیہ کی نظر میں قابلِ گرفت نہ تھیں لیکن ترکوں کی حمایت میں جب انھوں نے سامراج کی فریب کاریوں، عیاریوں اور مکاریوں کا پردہ چاک کیا تو اب حکومت کی کڑی نظریں ان پر پڑنے لگیں اور خفیہ پولس سائے کی طرح مولانا کا پیچھا کرنے لگی مولانا کی نقل و حرکت پر پابندیوں کا آغاز ہو گیا گورنمنٹ برطانیہ اس کڑوی گولی کو حلق سے اتارنے پر تیار نہ ہوئی اور لندن سے اخراج یا جلاوطنی کے لیے ریکارڈ تیار ہونے لگا مولانا مرحوم کی لندن کی تبلیغی و سیاسی سرگرمیوں کا پورا پورا اندازہ اس لیے نہیں لگایا جا سکتا کہ اگرچہ برطانوی جمہوریت میں آزادئ تقریر و تحریر کے پورے مواقع دئے گئے ہیں لیکن خود پریس، حکومت یا چند دولت مند افراد کی مٹھی میں رہتا ہے یقیناً شخصی حکومت کے استبداد و خود پرستی کے مقابلہ میں جمہوری نظام نے عوام کو آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع دیا ہے جس کی وجہ سے بیسویں صدی میں اس نظریہ نے عمومی کامیابی حاصل کی لیکن سرمایہ داری نے آگے بڑھ کر رسل و رسائل کے ذرائع اور نشر و اشاعت کے وسائل پر اس طرح قبضہ کر لیا ہے کہ عوام کی آواز پھر نقار خانہ میں طوطی کی صدا بن کر رہ جاتی ہے موجودہ جمہوریت ایک ہاتھ سے عوام کو آزادئ رائے، آزادئ تقریر و تحریر کا تحفہ پیش کرتی ہے لیکن دوسرے ہاتھ سے ذرائع نشر و اشاعت پر قبضہ کر کے اس کو چھین لیتی ہے۔ حکومت کے معمولی اقدام پر پورا پریس متوجہ ہو جاتا ہے لیکن عوامی تحریکات جب تک کامیابی سے ہمکنار نہ ہو جائیں پردۂ تاریکی میں رہتی ہیں بہر حال مولانا کی ملاقاتوں کے وسیع سلسلوں میں چند واقعات اور ملتے ہیں ایک واقعہ اوائل ۱۸۹۷ء سلطان عبد الحمید خاں کی سالگرہ کی خوشی کے موقع پر برطانوی نو مسلم حاجی محمد عمر ڈالی نے جشن کی صورت میں منایا جس میں مصر و ہند، ترکی براسوں کے مسلمان ضیافت میں شریک ہوئے جس کے اندر تبادلۂ خیالات فرمایا اور مولانا نے ان کو اپنی دعوت سے آشنا کرایا۔

اور دوسری بار ۶ مارچ ۱۸۹۷ء بروز عید الفطر مقام جنکفورڈ تمام مقیم انگلستان مسلمان جمع ہوئے نماز عید سفیر ترکی نے بڑھائی پھر انجمن اسلام لندن کی طرف سے مسلمانوں کی دعوت کی گئی مسٹر محمد حیات نے بحیثیت صدر کے کہا کہ انجمنِ اسلام لندن حکومت برطانیہ سے یہ امید رکھتی ہے کہ وہ دولتِ عثمانیہ ترکیہ کے ہرگز مخالف نہ ہوگی اور بدستور مراسم اتحاد و دوستی کو جاری رکھے گی اس قسم کے ذہنی و معاشرتی مجلسی اجتماعات کتنے ہوئے ہوں گے جس کے اندر مولانا لندن کے اندر ہندوستان اور عالمِ اسلام کے نمائندوں سے تبادلۂ خیالات کیا گیا ہوگا اسی کے ساتھ اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ لندن کی اس تبلیغی زندگی سے مطمئن نہ تھے چونکہ عبداللہ کوئلم کا اسلامی تبلیغ کا تعلق ایک کاروباری حیثیت کا تھا جیسے کہ صدیقی صاحب نے لکھا ہے

"کوئلم صاحب سولی سیٹر کا کام کرتے تھے جب پیشہ میں زیادہ کامیابی نہ دیکھی تو اسلام کو ذریعۂ معاش اور سلطان المعظم اور عالم اسلام سے روپیہ اینٹھنے کا آلہ بنایا بعد میں اس کا بھانڈا بری طرح پھوٹا اور سولی سیٹوں سے نام خارج کر دیا گیا اس کے بعد وہ نام بدل کر مسلمانوں کے جلسوں میں شریک ہوئے ترکی اور ممالک اسلامیہ اور ہندوستان کے معاملات میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔

(سہ ماہی اردو جولائی ۱۹۴۱ء)

اس بات کی تصدیق علامہ ندوی کے برید فرنگ سے ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں

"گذشتہ اتوار کو ہم ووکنگ گئے اطراف کے ہندی و ترکی اور انگریز جمع ہو گئے خاصا مجمع تھا ظہر کا کھانا (لنچ) ہوا اس کے بعد میں نے نماز پڑھائی محمد علی و سید حسین اور پروفیسر مصطفیٰ الیون ایک انگریز مسلمان نے تقریر کی گمان ہے کہ یہ مصطفیٰ الیون وہی ہے جو پہلے لیورپول کے مشہور شیخ عبداللہ

کو علم تھے۔"

(برید فرنگ ۲۴ مارچ سنہ ۱۹۲۰ء)

بہرحال یہ موجود تھے جن کی بنا پر مولانا کو انگلستان کی تنگ نائیوں کو چھوڑ کر امریکہ کی فراخ و وسیع فضا کی طرف رخ کرنا پڑا۔

مولانا برکت اللہ پہلی بار امریکہ میں

اُدھر برطانوی سامراج کا سب سے عظیم ڈپارٹمنٹ محکمۂ خفیہ مولانا کو ملک بدر کرنے کے لیے آئینی و قانونی جواز پیدا کرنے میں مصروف تھا ادھر قضا و قدر کی جانب سے کچھ اور فیصلہ ہو چکا تھا کہ وہ فرنگی سامراج کے قید خانہ کے تنگ و تاریک ماحول سے نکل کر ایک کشادہ و روشن فضا اور آزاد آب و ہوا میں پہنچ کر آزادیٔ ہند کا لائحۂ عمل تیار کریں لندنی زندگی کے گیارہ سالہ تجربات نے ان کے دل و دماغ میں اپنی مشن کی کامیابی کے لیے جن حقیقتوں کو بے نقاب کر دیا تھا اس کو نئی دنیا میں ترتیب دے کر نیا عملی اقدام اختیار کریں مولانا برطانوی سامراج کے دل (لندن) میں بیٹھ کر جن تلخ حقیقتوں سے آشنا ہوئے تھے ان میں سب سے پہلے یہ امر تھا کہ برطانوی نظامِ حکومت کے الگ الگ دو پیمانے ہیں ایک پیمانہ انگریزی حکومت کے لیے اور دوسرا نو آبادیات کے باشندوں کے لیے۔ انگلستان میں جس جمہوریت کی جلوہ نمائی تھی ہندوستان میں اس کی ادنیٰ جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی تھی، دوسری یہ تلخ حقیقت ان کے سامنے آئی کہ انگلستان کی ساری خوشحالی کا راز ہندوستان کے معاشی استحصال اور ہندوستان کے اقتصادی لوٹ مار میں مضمر ہے ہندوستانی مزدور اور دہقان کا گرم خون کھینچ کر ہر انگریز کے چہرہ و رخسار کی سرخی بن کر دمک رہا ہے ہندوستان کی اقتصادی غارت گری سے برطانوی قصرِ عظمت کو بلندی حاصل ہوئی ہے تیسرے یہ کہ برطانوی نو آبادیات کی بنیادی پالیسی

(ڈوائڈ رول) پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو پر مبنی ہے لہٰذا جب تک ہندوستان کے تمام باشندے متحد ہو کر انگریزوں کے خلاف راہ بغاوت پر گامزن نہ ہوں اہل ہند کے لیے منزلِ آزادی تک پہنچنا مشکل ہے اگرچہ یہ راہ کانٹوں سے بھری ہوئی ہے اور ایک طویل المیعاد منصوبہ کو چاہتی ہے مگر لیلائے آزادی سے ہمکناری اس کے بغیر ممکن نہیں مولانا کے اس پروگرام نے پرانی دنیا (انگلستان) کے تجربات کے ساتھ نئی دنیا (امریکہ) کے مشاہدات کا بڑا دخل ہے

بہرحال جس وقت مولانا برکت اللہ نے ۱۸۹۹ء میں نئی دنیا میں قدم رکھا تو لندن کے گھٹے ماحول سے نکل کر آزادی کی کھلی فضا میں سانس لے کر راحت و آرام کو محسوس کیا۔

مولانا کا امریکہ میں کس طرح پہنچنا ہوا؟ وہ یہ ہے کہ

ایک امریکی سیاح مسٹر الیگزنڈر ویب تھے جنھوں نے مسلمان ہوکر اسلامی نام محمد رکھا وہ امریکہ میں ایک مدت سے تبلیغ اسلام کی مقدس خدمت کو مخلصانہ طور پر انجام دے رہے تھے جیسے کہ نواب صاحب رامپور کے سفرنامہ سے پتہ چلتا ہے

نواب حامد علی خاں والیٔ رامپور ۱۸۹۳ء میں جب بسلسلۂ سیاحت امریکہ پہنچے تو محمد الیکزنڈر ویب سے ملاقات ہوئی وہ مسلم ورلڈ اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ نواب صاحب لکھتے ہیں

ایک روز ہمارے کمرے میں مسلم ورلڈ اخبار کے تین پرچے ملے جس کے مالک وایڈیٹر محمد الیگزینڈر ویب ہیں یہ صاحب منجملہ یوروپین امریکہ کے پہلے مسلمان اور امریکہ میں مذہب مبارک اسلام کی اشاعت ومنادی کرنے والے اول شخص ہیں اسلام اِن امریکہ کی دو جلدیں اور ٹامس کارلائل کا رسالہ " اثبات نبوت" ہیں مدلل ہدیۃً پیش کیا نو مسلموں کی تعداد انتالیس ۳۹ ہے۔ مولوی فرحی صاحب ان سے ملے وہ کہتے ہیں کہ نہایت مقدس ونورانی چہرہ بزرگ ہیں مکہ سرکل کے نام سے ایک لائبریری قائم کی تھی جس کے امریکن لوگ ممبر تھے۔ (مسیر حامدی ص ۲۴۸)

بہرحال یہ محمد الیگزینڈر ویب انگلستان تشریف لائے اور مولانا سے ملے ان کے خلوص وصداقت اور اسلام کی مخلصانہ خدمت سے بے حد متاثر ہوئے انھوں نے مولانا کو امریکہ آنے کی دعوت دی چنانچہ مولانا ان کے ساتھ امریکہ تشریف لے گئے۔ اب مولانا کو ان کی معیت میں رہ کر اپنی مذہبی تبلیغ کو ازادی کے ساتھ پیش کرنے کا عمدہ موقع ملا چنانچہ بقول صدیقی صاحب Friend نامی رسالہ میں مولانا کے مقالے شائع ہونے لگے جن کے اندر ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ کو وہ ضرور پیش کرتے تھے"۔

افسوس ہے کہ مولانا کے وہ مضامین و مقالات جو لندن کے اخباروں میں چھپے پھر وہ افکار و خیالات جو انھوں نے امریکہ کی آزاد فضا میں صفحۂ قرطاس پر پھیلائے اس کا کوئی ذخیرہ ہم کو میسر نہ آسکا کہ جس کی روشنی میں ان کے فکر و نظر کی رفتارِ ترقی کا اندازہ لگایا جا سکتا جو کچھ مواد دستیاب ہوا وہ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے لیکن ہماری خوش قسمتی ہے کہ مولانا کا ایک سیاسی مضمون جو غالباً ان کے افکار و خیالات اور لائحۂ عمل کا خلاصہ اور گویا سابقہ تجربات کا نچوڑ ہے وہ ہمارے ہاتھ لگا ہے یہ وہ مضمون ہے جو فارسی زبان میں مولانا نے تحریر کر کے مولانا حسرت موہانی کے پرچہ "اردوئے معلیٰ" کے لیے بھیجا تھا اور سنہ ۱۹۰۵ء میں چھپ کر بہت مقبول ہوا اس قیمتی اور تاریخی مضمون میں انھوں نے ہندوستان کی اقتصادی بدحالی اور معاشی پستی کی دکھتی رگ کو پکڑا ہے جس کا لندنی زندگی میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا فرنگی سامراج اور اس کے حاشیہ برداروں نے ہندوستان جیسے مالدار دولت مند ملک کو مفلس و کنگال بنانے کے جن طریقوں کو اختیار کیا ان کو جونکوں کے خون پینے سے تعبیر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس قوی و توانا ملک کے خون چوسنے کے لیے کتنی جونکیں انگریز بہادر نے چھوڑ رکھی ہیں جو ہندوستان کا خون پی پی کر طاقتور و تندرست ہوتی جا رہی ہیں اور بیمار ہندوستان موت کے سائے میں پہنچتا جا رہا ہے آخر میں اس کا علاج جملہ قوموں کا متحد ہو کر برطانوی سامراج کا مقابلہ انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہونے میں تجویز کیا ہے اس وقت یہ مضمون ایک تقویم پارینہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن جس وقت لکھا گیا تھا اس وقت عام تعلیم یافتہ مسلمانوں نے عام مسلمانوں کے اقتصادی مسائل سے کوئی واسطہ تھا۔ نہ براہِ راست سیاست میں حصہ لینے کا حوصلہ تھا سرسید کی تعلیمی پالیسی کے مطابق سیاست خصوصاً برطانوی حکومت سے مقابلہ ایک شجر ممنوعہ تھا مگر بقول علامہ ندوی

"حسرت موہانی پہلے بہادر نوجوان ہیں جس نے علی گڈھ کی پالیسی کے برخلاف جہاد کا علم بلند کیا اور اردوئے معلیٰ ادب کے ساتھ سیاست کا صحیفہ بنتا گیا۔"

مولانا حسرت نے ۱۹۰۳ء میں علی گڈھ سے بی۔اے۔ کرکے (انگریزوں کی کاسہ لیسی کے بجائے) اردوئے معلیٰ کے نام سے ایک بلند پایہ رسالہ علی گڈھ سے جاری کیا اس سے دو تین سال پہلے "مخزن" لاہور سے نکل چکا تھا جو خالص ادبی تھا اردوئے معلیٰ نوجوان جدید تعلیم یافتہ گروہ کی ادبی خدمت کا دوسرا قدم تھا مگر مرحوم کی طبیعت میں جو تضاد تھا اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اردوئے معلیٰ کے صحن میں شعر وسخن کے چمنستان کے ساتھ سیاست کا خارستان بھی نظر آتا تھا چنانچہ اس زمانہ میں جب مسلمان سیاست سے جھجکتے تھے علی گڈھ کا یہ بیباک نوجوان کانگریس میں شامل ہو گیا اور ۱۹۰۴ء میں بمبئی کے اجلاس کانگریس میں ڈیلی گیٹ بن کر شامل ہوا اور سورت کانگریس تک اسکے اندر رہا اردوئے معلیٰ میں شعر وسخن کے پھول اور سیاست کے کانٹے پیش ہوتے رہے اور لوگ حسبِ مذاق اس دورنگی سے لطف اٹھاتے رہے۔ اردوئے معلیٰ ۱۹۰۸ء تک نکلتا رہا اور مولانا حسرت کے گرفتار ہونے پر بند ہو گیا۔ (یادِ رفتگان ص۴۷)

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا عام تعلیم یافتہ طبقہ برطانوی دور میں حکومت کے ذریعہ اقتدار پرستی اور منافع طلبی کے پھول چننے میں لگا رہا اور سیاست کے کانٹوں سے اپنے دامن کو بچائے رکھا اس کارزار سیاست میں اترنے والے "فرقۂ زہاد" کے بجائے یہی "رندانِ قدح خوار" ہوئے جن کو مولوی یا عالم کہا جاتا ہے اس سلسلہ میں ایک اور عجیب وغریب تاریخی امر کا اظہار ضروری ہے کہ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت کے باشندوں نے سب سے پہلے سیاست کو اپنا موضوع بنایا اور ریاستوں کے رہنے والے سیاسی افکار سے کوسوں دور رہے لیکن سید صاحب کی زبانی ایک دوسری حکایت بھی سنئے۔

اسی زمانے میں دو عالموں کے مضامین کانگریس کی حمایت میں اردوئے معلیٰ میں چھپتے تھے جس میں مسلمانوں کو سیاست کی دلیرانہ تعلیم دی گئی تھی ان میں ایک مضمون تو حیدر آباد دکن کے ملا عبدالقیوم صاحب کا تھا جو دائرۃ المعارف دکن کے بانیوں میں تھے اور دوسرا مضمون ایک بھوپالی عالم مولوی برکت اللہ کا تھا جو جنگِ عظیم سے بہت پہلے ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے تھے اور آخر وقت اسلام کی بین الاقوامی سیاست پر مضامین لکھا کرتے تھے اور ہندوستان کے دوسرے آزادی خواہ ہندوستانی نوجوانوں کی رہبری کرتے تھے ۱۹۲۶ء تک زندہ اور سوئٹزرلینڈ میں مقیم تھے اور خلافت کے لیے کوشاں تھے وہیں انتقال کیا مسئلہ خلافت پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی جو کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔

(یادِ رفتگاں ص ۴۸)

مولانا برکت اللہ بھوپالی کا یہ اہم مضمون وقت کی آواز تھا عام مسلمانانِ ہند اور خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ جو کانگریس سے نفور اور اس کی سیاست سے دور تھا اس مخالفانہ ماحول میں شرکت کانگریس کے مضمون کا علی گڈھ سے شائع ہونا ہواؤں کے رخ کے بدلنے کی غمازی کر رہا تھا۔

اردوئے معلیٰ جنوری ۱۹۰۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے بیسویں اجلاس بمقامِ بمبئی کی مفصل رپورٹ مولانا حسرت موہانی نے شائع کی پھر اسی پرچہ فروری ۱۹۰۵ء میں کانگریس پر ایک مضمون ذاکر حسین اور ایک مقالہ پارٹی پالیٹکس کا شائع ہوا پھر ایک مقالہ موسیٰ خاں (علی گڈھ) بعنوان " اجلاس کانگریس بمبئی ۱۹۰۵ء کے فیصل شدہ رزولیشن اور مسلمانانِ ہند کا نفع نقصان" چھپا۔ اکتوبر کے شمارہ میں حاجی موسیٰ خاں کے مضمون پر ایک مضمون از مسلمان شائع ہوا اور جون ۱۹۰۵ء میں نیشنل کانگریس اور مسلمان کے عنوان سے فارسی میں ایک مقالہ اشاعت پذیر ہوا جس پر لکھا ہوا تھا۔

" از محمد برکت اللہ اجھو خانی (بھوپالی) الہندی فی نیویارک من الممالک

المتحدہ الامریکانیہ"۔

اس مضمون پر حسرت کا نوٹ بڑا اہم ہے جس میں ان کی رائے بھی آگئی اور اس کا خلاصہ بھی جو درج ذیل ہے۔

"ستمبر ۱۹۱۴ء کے پرچہ میں کانگریس کے متعلق جو مضمون نکلا تھا اس کا انگریزی ترجمہ کسی اخبار میں دیکھ کر ہمارے ایک غائبانہ کرم فرما نے نیویارک سے ایک فارسی تحریر اس کی تائید میں بھیجی ہے جس کو ہم بجنسہٖ درجِ رسالہ کرتے ہیں امید کہ ناظرین اردوئے معلیٰ اسے بنظرِ غور ملاحظہ فرمائیں گے خصوصاً دو مقاموں کو یعنی وہ مقام جہاں سرسید علیہ الرحمۃ کی قومی خدمتوں کا پرنس بسمارک کی ملکی خدمتوں سے مقابلہ کرکے دونوں کو ایک حیثیت سے مشابہ قرار دیا ہے اور دوسرا وہ حصہ جہاں اہل ہند کی خاص خاص شکایتوں کا ذکر کرکے دکھلایا ہے کہ وہ شکایتیں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی شکایتیں ہیں اس لیے گورنمنٹ سے ان کی اصلاح کی استدعا کرنے میں دونوں کو برابر حصہ لینا چاہئے تاکہ ان کی متفقہ درخواست کی کچھ عزت و وقعت ہو اسی طرح بسمارک کی طرح سرسید مرحوم کی ملکی پالیسی کی نسبت بھی مسلمانوں کی رائے بدلتی جائے گی اگرچہ وہ سرسید کو ہمیشہ مسلمانانِ ہند کی ترقی کا بانی سمجھتے رہیں گے کیونکہ ان کو یقین رہے گا کہ سرسید نے جس وقت کانگریس کی مخالفت کی تھی اس وقت مخالفت ہی مناسب تھی چونکہ اس سے مسلمانوں کو یہ فائدہ پہنچا کہ وہ ہمہ تن تحصیل علم میں مصروف ہوگئے اور کانگریس کو بھی ان کی مخالفت سے تقویت ملی اور امر دوم کی نسبت لکھا ہے کہ ہنود اور اہلِ اسلام کے درمیان سب سے پہلے نقطۂ اتحاد حبِ وطن ہے کہ دونوں ایک ہی ملک کے رہنے والے ہیں اور پھر دونوں افلاس و قحط کی مصیبتوں میں یکساں گرفتار ہیں اور یہ امر مسلم ہے کہ دونوں جماعتوں کے درمیان اتحاد کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک ہی قسم کے مسائل میں مبتلا ہیں اور پھر آگے چل کر ان سب مصائب کو ترتیب وار بیان کیا ہے۔

(۱) انگلستان کے کارخانوں کی رعایت سے ہندوستانی موضوعات پر محصول لگایا جانا۔

(۲) متمولین انگلستان کا ہندوستان کی پیداوار کو ارزان خرید کر ملک سے باہر نکال لے جانا۔

(۳) زراعتِ ہند کا اصولِ جدیدہ کے مطابق نہ ہونا اس پر طرہ خراج کی سختی اور اس کا حصہ پیداوار کے بجائے زر کی صورت میں لیا جانا۔

(۴) وزارتِ ہند کے اخراجات عمّال کی پنشنیں اور قرضۂ ہند کے ادا کرنے کے لیے تیس کروڑ روپے کی ناقابلِ برداشت رقم کا ہر سال ملک سے باہر نکل جانا

(۵) عہدہ ہائے جلیلہ پر صرف اہلِ انگلستان کا مقرر ہونا اور ہندوستانیوں کا محروم رہنا۔

(۶) امتحانِ سول سروس کے لیے اہلِ علم کا انگلستان جانے اور زرِ کثیر صرف کرنے پر مجبور ہونا وغیرہ

اس کے بعد صاحبِ مضمون نے دکھایا ہے کہ اگرچہ کانگریس کو ہنوز کچھ کامیابی نہیں ہوئی ہے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ ہر سال وہ کامیابی سے نزدیک ہوتی جارہی ہے اور روز بروز اس کی وقعت بڑھتی جارہی ہے چنانچہ اس سال پہلی بار کانگریس کی کارروائی بذریعہ تار نیویارک کے کسی اخبار کے نامہ نگار نے بمبئی سے بھیجی اور اسی میں سر ہنری کاٹن، دادا بھائی نوروجی اور سر سیندر ناتھ بنرجی سے حالات مع کانگریس کے مقاصد کے شائع ہوئے۔

مولانا برکت اللہ صاحب کا وہ خط جو مولانا حسرت موہانی کے نام تھا اس کا مضمون یہ ہے

"جناب نے ہندو مسلم اتحاد پر جو ایڈیٹوریل لکھا ہے اور انڈین نیشنل کانگریس میں مسلمانوں کے شامل ہونے کے بارے میں جو اظہار خیال کیا ہے اس کا انگریزی ترجمہ میری نظر سے گزرا اسے پڑھ کر مجھے

بے حد خوشی ہوئی۔"

پچھلے دس برسوں میں قریب دو کروڑ انسان بھوک اور فاقے سے مر چکے ہیں اور غریبی کے مارے ہوؤں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی اس حادثہ کے بھیانک پہلو اس وقت سمجھ میں آتے ہیں جب ہم ان کی تعداد کا مقابلہ ایران کی آبادی سے کریں یعنی پورا ایک ملک فاقے کا شکار ہو کر مر گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ غریبی کہاں سے آئی ؟

اس کا جواب یہ ہے

(۱) جس وقت برطانوی حکومت قائم ہوئی انگریزی کارخانوں کے مالکوں نے مشینوں کے ذریعہ کپڑا، ہتھیار، برتن وغیرہ بنا کر ہندوستان کی تمام صنعت و حرفت کو خاک میں ملا دیا اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے یہ قانون بنایا کہ ہندوستان کی بنی ہوئی چیزیں جب انگلستان آئیں گی تو ان پر کسٹم ڈیوٹی ستر اسی فیصدی لگے گی اور انگلستان کی مصنوعات پر کوئی ڈیوٹی نہیں ہوگی اگر ہندوستان کی حکومت خرچ چلانے کے لیے لگائے تو وہ برائے نام ہوگی یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی دست کاری اور مصنوعات دوسرے ملکوں میں خریدار نہ پیدا کر سکی اور خود ہندوستان میں ہندوستانی مصنوعات گراں اور انگلستانی مال ارزاں بکنے لگا جس کے نتیجہ میں آہستہ آہستہ یہاں کی صنعت و حرفت کو فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا اور وہ ملک جو کسی زمانہ میں صنعتی ملک کہلاتا تھا خالص زرعی ملک بن گیا۔

(۲) ہندوستان کے تیار کردہ مال اور دیسی مصنوعات انگریز سرمایہ دار اونے پونے خرید کر دوسرے ملکوں میں من مانے دام پر بیچتے اور دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ لیتے ہیں۔

(۳) ہندوستان میں ابھی تک کھیتی باڑی کا طریقہ صدیوں کا دقیانوسی چلا آرہا ہے ان کو جدید طریقوں سے قصداً ناواقف رکھا گیا ہے۔

(۴) ہندوستان کی حکومت تیس کروڑ روپے سالانہ ہندوستان کی خارجہ پالیسی کے نام پر اور بینک آف انگلینڈ کے قرضے مع سود چکانے کے بہانے انگلستان بھیج دیتی ہے جو یہاں کی لوٹ کا سب سے بڑا حصّہ ہے۔

(۵) اعلیٰ مناصب اور عہدے انگریزوں کے لیے مخصوص ہیں صرف چھوٹی اور درمیانی درجہ کی ملازمتیں ہندوستانیوں کی قسمت میں ہیں۔

(۶) قانون اور انڈین سول سروس کے امتحانات کے لیے ہر ہندوستانی امیدوار لندن جانے کے لیے مجبور ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

ہندوستان پر برطانوی سامراج کا یہ زبردست اقتصادی بوجھ ہے جو ہماری گردن پر لادا گیا ہے یہی ملک کی بربادی اور اقتصادی تباہی کا باعث ہیں

یہ نقصانات مشتے نمونے از ضرورے اس لیے بیان کیے گئے ہیں کہ جو لوگ انڈین نیشنل کانگریس سے دور رہنا چاہتے ہیں وہ اس سے عبرت حاصل کریں۔

اگر مسلمان کانگریس میں شامل ہو کر اس کشمکش کے میدان میں گوئے سبقت لے جائیں اور اپنے ہندو بھائیوں سے آگے بڑھ جائیں وہ درحقیقت اسلام کی سچی اور عظیم خدمت کریں گے اور علیحدہ رہ کر اپنی متحدہ طاقت وقوت کو کمزور کرلیں گے

(اردوے معلیٰ ۱۹۰۷ء جون)

مولانا نے اس تاریخی مکتوب میں جن مسائل کو چھیڑا ہے وہ ہمارے ملک کے وہ سلگتے ہوئے مسائل ہیں جن کی چنگاریوں سے نصف صدی تک ہمارے ذہن ودماغ گرم ہوتے رہے۔

انگریز اور یورپی قوموں کی استعماری پالیسی کی جڑ بنیاد وہ لوٹ کھسوٹ ہے جو سولھویں صدی سے مغرب نے مشرقی ممالک کے اندر جاری کر رکھی تھی مولانا نے ملک کی تباہی کا جائزہ حکمت ولی اللہی کی روشنی میں اس وقت لیا تھا جبکہ معاشی قدروں کا احساس اہل مشرق میں سے کم لوگوں کو ہوا تھا اور کمیونزم

اور بالشویزم کا فلسفہ اشاعت پذیر نہ ہوا تھا بدیشی مال کے ہاتھوں ہندوستان کی تباہی کے جس راز کو مولانا نے اس وقت بھانپ لیا تھا اسی کی بنیاد پر چوتھائی صدی کے بعد مہاتما گاندھی نے سودیشی کی تحریک اٹھائی اور برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ کا نعرہ مولانا کے اسی اقتصادی بنیاد پر دیا گیا آزادئ ہند کے لیے ہندو مسلم اتحاد کا بنیادی مسئلہ مولانا نے اس وقت اٹھایا جبکہ وہ ایک غیر مانوس آواز تھی جو ان کی بالغ نظری اور دور بینی کا پتہ دیتا ہے یہی وہ اہم مسئلہ ہے جو تقسیمِ ہند سے پہلے مسلمان کیا کریں؟ کے عنوان سے اہلِ فکر و نظر کا زبردست موضوع بنا رہا اگرچہ مولانا اور علما کے اس نظریہ کو سنہ ۴۷ء کی انگریزی ڈپلومیسی نے مسترد کرا دیا لیکن اس کی ضرورت آج بھی جوں کی توں ہے مولانا کی لندنی زندگی نے ان کو برطانوی سامراج کے ہتھکنڈوں کے سمجھنے کا پورا پورا موقع دیا۔ امریکہ پہنچ کر مغربی اقوام کی خارجی سیاست کے مطالعہ کی روشنی میں ہوسِ اقتدار پرستی کے مکروہ نظارے ان کے سامنے آئے اور وہ ایشیائی ممالک کے حصہ بخرے کرنے کی سامراجی قزاقوں کی اسکیموں سے مطلع ہوئے۔

امریکہ کے قلب میں رہ کر اس حقیقت کا بھی اندازہ ہوا کہ فرنگی سامراج کا عفریت اور برطانوی حکومت کے استبداد کے سرکش دیو سے تنِ تنہا نہیں نپٹا جا سکتا جب تک بین الاقوامی طاقتوں کی رقابتوں سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت نہ پیدا ہو اس لیے آزادئ ہند کے مسئلہ کو ملکی باشندوں کی مسلسل جدوجہد اور قربانیوں کی سرگرمی کے ساتھ بیرونی قوموں کو بھی ہم خیال بنانے کی ضرورت ہے ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ کو بین الاقوامی مسئلہ بنائے بغیر کامیابی اپنا نورانی چہرہ نہیں دکھا سکتی یہی وہ نقطۂ خیال ہے جس کو بعد میں انڈین نیشنل کانگریس نے اختیار کیا اور جس کو پنڈت نہرو کے ذہن کی پیداوار کہا جاتا ہے اور پھر یہی نکتہ ہندوستانی خارجہ پالیسی کی بنیاد بنا بہرحال مولانا کے نزدیک ایک طرف ہندوستان کے نزدیک ایک طرف ہندوستان کے تمام فرقوں کا متحد ہو کر برطانوی سامراج کے

خلاف متحدہ محاذ بنانا ضروری تھا دوسرے بین الاقوامی طاقتوں کا فرنگی سامراج پر دباؤ ڈالنے کی ضرورت تھی اس لیے اس مسئلہ کو بین الاقوامی مسئلہ بنا کر فضا کو سازگار کرنا اس کے لیے زمین ہموار کرنا مولانا کے مقاصد میں سے اہم مقصد بن گیا جس زبردست حقیقت کا احساس مولانا نے امریکہ کے بین الاقوامی ماحول میں رہ کر کیا تھا اس کا ادراک ہندوستان کے ایک خدامست خانقاہی درویش نے ہندوستان کی چار دیواری میں رہ کر لیا یہی اتحاد کا وہ نورانی رشتہ ہے جس نے مولانا برکت اللہ کو شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی سے قریب کر دیا۔ اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہند کی تحریک پر مختصر روشنی ڈالی جائے۔

تحریک شیخ الہند

تاریخ انسانی قوموں کے عروج وزوال کی مسلسل داستان ہے ایک قوم کی تباہی وبربادی کے اندر دوسری قوم کی ترقی وبربادی کا راز چھپا ہوا ہے بقول متنبیؔ ؎ مصائب قوم عند قوم فوائد

یعنی ایک قوم کی مصیبت دوسری قوم کے لیے منفعت کو لے کر آتی ہے اس لیے پچھلی تاریخ کی خونچکاں حکایات اور خونی واقعات درد مند انسانوں کے دلوں کو مضطرب اور ان کی روحوں کو بے کل کر دیتے ہیں خصوصیت سے وہ سچے درد مند انسانیت دوست افراد جن کے سینے خداوندی محبت کے ساتھ مخلوقِ خدا کی شفقت کے نشیمن بن گئے ہوں ایسے خدا پرست، ہمدرد خلق، پاکیزہ نفوس انسانیت کی آبرو اور شرافت ومروت کا نشان بن کر عالم انسانیت کے لیے ہدایت کا مینار بن کر چمکتے ہیں ولی اللٰہی تحریک انسانیت کی درمندی کی ایک مسلسل داستان ہے مغربی اقوام نے جب سولھویں صدی میں اپنی ترقیات کے لیے قدم بڑھایا تو ان کی تہذیب وتمدن کا یہ عالیشان محل مشرقی اقوام

کی تباہی و بربادی کے کھنڈروں پر اٹھایا گیا یوں تو ہر دور میں کوئی نہ کوئی ہلاکو یا چنگیز شرافت اور انسانیت کے دامن کو چاک کرتا رہا لیکن پچھلے دور کے مظالم ایک فرد کی ہوس اقتدار کا نتیجہ ہوتے تھے لیکن مغربی اقوام نے ان پچھلی صدیوں میں پرانی اور نئی دنیا کے انسانوں پر جو مظالم ڈھائے ہیں وہ ایک منصوبہ بندی کے ساتھ جس کا ظالمانہ وجابرانہ گوشہ اجتماعی نسل کشی (جیونسائڈ) ——— ہے اہلِ ہسپانیہ نے نئی دنیا کے پرانے اصلی باشندوں کی تقریباً نسل ہی ختم کردی برطانیہ نے آسٹریلیا کے قدیمی باشندوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ اس گناہ کی پاداش میں کہ وہ معصوم بے گناہ سیدھے سچے انسان دجل و فریب سے ناآشنا تھے فرنگی سامراج نے مشرقی اقوام خصوصاً اہلِ ہند پر جو انسانیت سوز مظالم ڈھائے ہیں ان کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو خود ایک تہذیب کے بانی مبانی اور اخلاقی وروحانی تمدن کے مالک تھے اس بدیشی سامراج نے سراج الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے دور میں ہمارے ملک پر ظلم کا ڈیرا ڈالا اور ہندوستانیوں پر اپنی عیاری و مکاری کے پردہ میں ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنا شروع کیے شاہ صاحب کی دوربیں نگاہ مستقبل کا بھیانک نقشہ دیکھ کر ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ ۱۸۰۳ء میں دے دیا تھا جس کی بنیاد پر جہاد کی دو تحریکیں اٹھیں

ولی اللہی جماعت نے دوبار فرنگی سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا معرکۂ بالاکوٹ ۱۸۳۰ء کی خونی سرخی بن کر تاریخ جہاد کی پیشانی پر دمک رہا ہے۔

دوسرا سانحہ ۱۸۵۷ء ہے جس کے اندر تمام ہندوستانیوں کے ساتھ شریک ہو کر جنگِ آزادی میں حصہ لیا اور وہ فرنگی سامراج کی تاریخ کا کلنک کا ٹیکہ بنا پہلا جہاد باقاعدہ تنظیم (امارت) کے ساتھ عمل میں آیا تھا اور خوانین سرحد کی غداری سے ناکام ہوگیا دوسرا معرکہ ۵۷ء عمومی بغاوت کی ایک غیر اختیاری

واضطراری لہر تھی جس کے اندر ولی اللّٰہی سلسلہ کے بزرگوں نے اپنی کشتی اس سمندر میں ڈال دی اس تحریک آزادی کو حکومت برطانیہ نے اپنی قوت قاہرہ کے بل بوتہ پر دبادیا ان دونوں معرکوں کی ناکامی نے ولی اللّٰہی مجاہدین کے اشہبِ ہمت وحوصلہ کو نئی جولانی بخشی اور ہر ناکامی نے سمندِ ہمت کے لیے تازیانہ کا کام کیا اور ان ناکامیوں سے سبق حاصل کرنے کا جذبۂ بے اختیار عطا کیا۔ حضرت شیخ الہند اور ان کے اکابر نے اس حقیقت کو محسوس فرما لیا کہ جب تک عوام وخواص کی صحیح تعلیم کے ساتھ باقاعدہ تربیت نہ دی جائے اس وقت تک کوئی انقلابی تحریک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی اس لیے اس تحریک کا آغاز کیا جس کو مدراس کی تحریک کے نام سے اب یاد کیا جاتا ہے کیونکہ ایک بے بال وپر بے سروسامان قوم جس کا جوڑ وبند غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو وہ پر تشدد ذرائع سے انقلاب برپا نہیں کر سکتی اس لیے ہر آئینہ ضروری ہوا کہ ایک طرف قوم وملت کو ذہنی غلامی سے آزادی صحیح تربیت دی جائے دوسری طرف ملک کے تمام باشندوں کو آزادئ وطن کے رشتہ میں منسلک کرکے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا جائے یہی وہ مشترک خیالات تھے جس نے مولانا برکت اللّٰہ کو تحریک شیخ الہند سے وابستہ کر دیا تحریک ولی اللّٰہی کے چوتھے امام شیخ الہند کا جب زمانہ آیا تو حکومتِ برطانیہ کی قہرمانی طاقتوں نے ہندوستان کو اپنے شکنجہ میں اس طرح جکڑ لیا تھا کہ اس کے تن بدن کے ہر بُنِ مو سے خون ٹپکنے لگا پورے ملک کا خون نچوڑ کر مال ودولت کے خزانہ لوٹ کر ملک کو مفلسی کے آخری کناروں پر پہنچا دیا گیا تھا خدا کا ایک سچا عاشق خدامست درویش وہ خود کو گوشۂ گمنامی میں چھپائے ہوئے خلوت نشین تھا وہ ان دردناک حالات کو دیکھ کر تڑپ اٹھا اگرچہ اس سے پہلے اس کی جماعت اپنوں کی غداری سے دوبار شکست کھا چکی تھی لیکن اس بلند حوصلہ اور صاحبِ عزیمت انسان نے فرنگی سامراج سے مقابلہ کی طاقت نہ ہونے کے باوجود پھر ہندوستان کی آزادی کا منصوبہ بنایا پچھلے دورِ ماضی میں جو کچھ خامیاں کوتاہیاں اور کمزوریاں

ہو چکی تھیں ان تلخ تجربات کو سامنے رکھ کر ایک دور رس طویل المیعاد منصوبہ ابتدا ہی سے تجویز فرمایا اور چونکہ شیخ الہند ایشیا کی عظیم الشان دینی درسگاہ (دارالعلوم) کے شیخ و سربراہ تھے اس لیے ان کے فیض یافتہ طلبا ہند اور بیرونِ ہند تک پھیلے ہوئے تھے شیخ جن طلبا کے اندر سیاسی سوجھ بوجھ اور رمز شناسی کی چمک محسوس فرماتے ان کے سامنے اپنے مشن کو رکھ دیتے عوام کی دینی و سیاسی تربیت ان کے ذمہ لگا دیتے اس طرح ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں یہ تحریک پھیل چکی تھی سرحد کابل، یاغستان وافغانستان، بلخ و بخارا تک اس کا جال آہستہ آہستہ بچھا دیا گیا تھا۔ جب مولانا برکت اللہ بھوپالی کا وہ مضمون اردوئے معلیٰ سنہ ۱۹۰۵ء کا حضرت شیخ نے ملاحظہ فرمایا تو اس کو دیکھ کر پھڑک اٹھے اور وہ جس درد و غم کی آنچ میں تپ رہے تھے اس کی جھلک مضمون نگار کے اندر نگاہِ باطنی سے دیکھ لی اور مولانا برکت اللہ سے رابطہ پیدا کر کے ان کو اپنے مشن کا ایک رکن بنا لیا۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی کا یہ تاریخی و انقلابی و سیاسی مضمون جو بیسویں صدی کے آغاز میں لکھا گیا تھا اس وقت ہمارے ملک کی سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس جو گورنمنٹ برطانیہ کی وفاداری کا سبق پڑھانے والے مسٹر ہیوم کے سیاسی پنجہ سے نکل چکی تھی اور حکومتوں کے دفتروں اور بند کمروں سے باہر آکر عوامی خدمت کے میدان میں ابھی ابھی اتری تھی۔ عام مسلمانانِ ہند ۵۷ء کے پچھلے زخموں کو مندمل کر کے اور پچھلی تباہیوں اور بربادیوں کے کھنڈروں پر حیات ملی کی تعمیر میں لگے ہوئے اور سر سید کی پالیسی کی بنا پر برطانوی حکومت کے تعاون کو ترقی کا زینہ سمجھتے تھے کانگریس ملازمانی حقوق اور ملک کے اندر تھوڑے بہت اختیارات کی سیاست کی راہ پر گامزن تھی مولانا کا یہ تاریخی دستاویزی مضمون جو ہندوستان کی آزادی سے نصف صدی پہلے لکھا گیا تھا اس سے ان کے مستقبل کے سیاست کی دور اندیشی و رہنمائی اور ایک عظیم مفکر و مدبر

انسان کے افکار و خیالات کی گیرائی و گہرائی کی روشنیاں جھلکتی نظر آتی ہیں اور یقین ہوتا ہے کہ بعد میں جو تحریکات ملک میں اٹھائی گئیں ان کی عملی بنیادوں (سودیشی کی تحریک) انگریزی مال کا بائیکاٹ، ہندو مسلم اتحاد اور اس کے لیے عدم تشدد کا راستہ مولانا کے صفحۂ ذہن پر ابتداءً ابھرا تھا جبکہ ہمارے قومی رہنما مہاتما گاندھی کو اور مسٹر نہرو کو میدانِ سیاست میں داخل ہونے میں رُبع صدی باقی تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے علما کی عقابی نظر ہندوستانی سیاست کے کتنے بعید ترین افق تک پہنچ چکی تھی۔ اب ہم مولانا کے اس فارسی مضمون "ہندو مسلماں در ہندوستاں" کا اپنی زبان میں سلیس ترجمہ کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں۔

مولانا برکت اللہ کا اہم دستاویزی مضمون

"ہندو مسلماں در ہندوستاں"

دنیا میں تیس کروڑ مسلمان آباد ہیں یعنی دنیا کی آبادی کا ہر پانچواں انسان مسلمان ہے اسلامی آبادی میں آدھے سے زائد مسلمان غیر مسلم حکومتوں کی رعایا ہیں مگر مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد کسی ملک میں بھی ہندوستان سے زیادہ نہیں جہاں سات کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ مسلمانانِ عالم کی فلاح و بہبودی مسلمانانِ ہند کی فلاح و بہبودی سے وابستہ ہے اس لیے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کسی ملک میں ایک جگہ پر نہیں ہے۔ مسلمانانِ ہند کی حیات و زندگی اور عافیت و سلامتی اس پر منحصر ہے کہ وہ اپنے تمام اہلِ وطن (ہنود وغیرہ) کے دوش بدوش چلیں۔

اس مختصر مضمون سے جو فارسی میں تحریر کیا گیا ہے ہماری غرض علمائے کرام اور دوسرے اصحاب فکر و نظر رہنمایان قوم کو ایک عظیم الشان مسئلہ کی

طرف متوجہ کرنا ہے اور ہم اپنی استعداد کے مطابق اس مسئلہ کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں پر دو فرض عائد ہوتے ہیں جس کی ادائگی ان کے لیے ضروری ہے ایک وطنی فرض دوسرا دینی۔ حبِّ وطن کا تقاضا یہ ہے کہ ہر انسان وطن کی خدمت میں جان و مال خرچ کرنے سے دریغ نہ کرے بنی نوعِ انسان کی تاریخ شاہد ہے کہ جو شخص حبِّ وطن سے خالی رہا انسانیت سے خارج ہوا۔

مشمار مردکاں راحبِ وطن نہ باشد ۱؎ ننگِ بشر ہمانست یعنی خدا بر آنست

اور فریضۂ دینی کا یہ تقاضا ہے کہ مسلمانانِ ہند اخوتِ اسلامی کی بنا پر تمام عالم کے مسلمانوں کے دوست ہوں اور جب وقت پڑے تو بقدرِ طاقت مدد و تعاون کریں ان دینی و وطنی دونوں فرضوں کی ادائگی ایک ہی طریقۂ عمل سے ہو سکتی ہے یعنی ہندو مسلم اتحاد البتہ ایک اور بات قابلِ توجہ ہے کہ اہلِ یورپ ایشیا والوں کو حقارت کی نظر سے کیوں دیکھتے اور ہر سلسلہ میں ان کو نظر انداز کرتے بلکہ بے عقل جانوروں میں شمار کرتے ہیں۔ حقیقتاً اہلِ ہند کی یہ زبوں حالی، کس مپرسی، بے دست و پائی اور کمزوری اخلاقی خرابی اور باہمی نا اتفاقی کا نتیجہ ہیں — انگلستان کے مٹھی بھر تاجر ہندوستان آخر خود ہندوستانیوں کے اور اس ملک کے مالک بن بیٹھے اور ڈیڑھ صدھی بیت چکی ہے کہ ہندوستان کا مال و دولت انگلستان منتقل کرتے چلے جا رہے ہیں جیسا قانون چاہتے ہیں نافذ کرتے ہیں اور جیسے بھاری سے بھاری ٹیکس چاہتے ہیں لگاتے ہیں مگر ہندوستانیوں نے اب تک نہ سیاست کی طرف توجہ کی اور نہ مالیات کی گتھیوں کو سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش کی نہ یہاں کے دانشوروں کو باہمی اتفاق سے کوئی کام کرنا آیا نہ خودداری کا احساس ہوا وہ ہمیشہ حکومت کے دست نگر بن کر رہ گئے اور خود کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ ظاہر ہے کہ اہل یورپ اس کے سوا اور کیا سمجھ سکتے ہیں کہ یہ لوگ اصولِ تمدن سے بے بہرہ ہیں۔

ہاں یہ سچ ہے کہ کچھ سربرآوردہ ہندو بھائی سیاست کے راز کو پا گئے ہیں اور اب سیدھے راستہ پر گامزن ہو کر قوم کو فلاح و بہبودی کی راہ پر لے جانا چاہتے ہیں انھوں نے قوم کی تعلیم و تربیت کو اپنے ہاتھوں میں لینے کا بیڑہ اٹھایا اور حکومت کی محتاجی و غلامی سے آزادی کی طرف قدم بڑھایا ہے صنعت و حرفت، زراعت و تجارت (جو مالداری اور خوشحالی کے خزانے ہیں) ان کو اپنے قبضہ میں رکھنے کے راز کو پا لیا ہے ان مقاصد کا حصول صرف اسی وقت ہو سکتا ہے کہ ہر فرقہ و ہر طبقہ کے لوگ باہم متفق ہو کر متحدہ کمیٹیاں بنائیں اور تھوڑا تھوڑا سرمایہ فراہم کر کے دیانت داری و دل سوزی سے کام کیا جائے یہی وہ حقیقت ہے جس نے یورپ و امریکہ کو دنیا بھر کا مالک بنا رکھا ہے وہ تھوڑا تھوڑا سرمایہ فراہم کر کے ریلیں بناتے، جہاز چلاتے اور زمین کی تہوں سے جواہرات نکال کر مالدار بنتے جا رہے ہیں اگر ہندوستان کے مسلمان یہ طریقہ اختیار کر لیں تو دینی و وطنی دونوں فریضہ ادا کر سکیں گے اور ملک کا نظم و نسق ان کے حوالے کر دیں گے جیسا کہ کناڈا اور آسٹریلیا میں ہو چکا ہے اس صورت میں ہندو ہوں کہ مسلمان سب وقار و عظمت کے مالک ہوں گے اور مسلمانانِ ہند اس قابل ہو جائیں گے کہ ان ممالک غیر کے اندر رہنے والے دونوں بھائیوں کی مدد کر سکیں گے جو دوسرے مقامات پر جا کر آباد ہو گئے ہیں اگر ہندوستانی مسلمان ہندوؤں سے کندھے سے کندھا ملا کر نہ چلیں گے تو خود تباہی کے غار میں گر جائیں گے۔ ہندو بھائی تو سیاست و صنعت کے میدان میں گامزن ہو چکے ہیں گو قدم آہستہ اٹھ رہے ہیں تاہم صبح و شام چل کر راستہ طے کر لیں گے لیکن مسلمان ایک بے جان مٹی کی طرح ہیں جو راستہ کا غبار بن کر جم گئی ہیں ان کا ہر قدم منزل سے دور کرتا جا رہا ہے بے علمی و بے ہنری ان کو پستی کے گھڑھے میں گرا دے گی کچھ بعد نہیں کہ اس وقت امیروں شریفوں کی اولاد کو سڑکوں پر جھاڑو دینے کی خدمت سپرد کر دی جائے یورپ کے نصاریٰ تو اسلام سے انتقام لینے کے لیے

تلے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے وطن پرست ہندو بھی ان کی بے حمیتی سے تنگ آکر وطن کا دشمن سمجھنے لگیں گے اور اس دشمنی کی بنا پر مسلمانانِ ہند پر وہ مصائب نازل ہوں گے جو نصاریٰ کے ہاتھوں سردیا بلغاریہ اور کریٹ کے مسلمانوں پر نہ ہوئے تھے اب وقت آگیا ہے کہ ہندو مسلمان اپنے پچھلے جھگڑوں کے دفتر کو گلدستۂ طاقِ نسیاں بنائیں اور ہر سعادت مند فرزندِ اسلام مادرِ ہند کی محبت میں یک دل و یک جہت ہو کر ایک دوسرے کے معاون و مددگار بن جائیں ؎

برخیز خواب اکنوں وقتے تو سخت تنگ است — ایں لحظہ گر نپائی تیر از کمان جستہ

یعنی خواب غفلت سے بیدار ہو جاؤ جو وقت رہ گیا ہے اس کو برباد نہ کرد اگر یہ وقت بھی چلا گیا تو تیر کمان سے چلا جائے گا۔

ہندوستان کی تاریخ اہلِ جدید ہمارے لیے حقیقت شناسی کا سرچشمہ اور عبرت کا درس ہے جب سلطنتِ تیموریہ کی بنیادیں کھوکھلی ہوگئیں تو ہر طرف سے سلطنت کے دعوے دار کھڑے ہو گئے جنھوں نے خود غرضی کا علم بلند کیا نہ ان کو دور اندیشی سے کچھ تعلق تھا نہ وطن پرستی کا کچھ حصہ ملا تھا انگریز جو انجام بیں اور صاحب تدبیر تھے انھوں نے ٹیپو سلطان نظام الملک اور مرہٹوں کو ایک دوسرے سے لڑا بھڑا کر ہر ایک کو زیر کر لیا مولانا روم کی مثنوی میں جو قصہ باغبان کے صوفی و فقیہ اور علوی کو جدا کر دینے کا لکھا ہے وہی انگریزوں نے اختیار کیا ہر ایک قوت کو یکے بعد دیگرے کمزور و خستہ کر کے تمام ہندوستان کے حاکم بن بیٹھے ؎

ہر کہ تنہا ماند از یارانِ خود — ایں چنیں آید مراد را حملہ بد

جو اپنے ساتھیوں سے چھوٹ کر اکیلا رہ گیا تو اس پر ساری دنیا کی مصیبتیں ٹوٹ پڑتی ہیں۔

ہندوستان کا انگریزوں کے ہاتھ میں آنا تھا کہ یہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہوگیا برطانیہ کے ٹکرگدوں کے ہاتھ میں جب ہندوستان کے نہ مٹنے والے خزانے آئے تو ان کی ہمتیں بڑھ گئیں دماغ میں جہانگیری کا سودا سما گیا ہندوستان کے سرمایہ سے فوجیں بنائی جانے لگیں اور جنگی جہازوں کے بیڑے بنا کر زمین کے بحر و بر میں تاخت و تاراج کا میدان گرم کر دیا اگر انگریزوں کے قبضہ میں ہندوستان نہ آتا تو یہ واقعہ ہے کہ افریقہ میں راس امید سے لے کر قاہرہ تک ان کا تسلط ناممکن تھا۔ آسٹریلیا کا بڑا اعظم، چین کی بندرگاہ اور امریکہ کے علاقے کبھی ان کے ہاتھ نہ آتے ہندوستان کے ان خزانوں کی بدولت انگریزوں کا دماغ اس درجہ آسمان پر پہنچ گیا ہے کہ جزیرۃ العرب، بیت المقدس اور ایران پر قبضہ جمانے کی فکریں کر رہے ہیں کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ امسال موسم بہار میں سلطان عبدالحمید خاں کو پیغام بھیجا تھا کہ اگر سلطان المعظم نے اپنی فوجیں مدینہ سے واپس نہ بلائیں تو حکومتِ برطانیہ ممالکِ عثمانیہ پر فوج کشی کر دے گی یہ ان کی ایک پرفریب سیاست کا ایک شاخسانہ تھا حجاز ریلوے اور بغداد ریلوے کی تکمیل سے پہلے ملک عرب پر اپنا قبضہ جمالے اگر قیصر ولیم ثانی انگریزوں کی مخالفت نہ کرتا تو یہ امر واقع ہو جاتا پھر یہ بھی دیکھئے کہ جزیرہ نمائے سینا کی حدبندی کے مسئلہ پر جب حکومتِ عثمانیہ و برطانیہ میں جھگڑا ہوا تو برطانوی اخباروں نے اس قدر نخوت و غرور آمیز مضامین شائع کیے جس کے اندر مطالبہ کیا کہ ہند اور مصر کے علمائے اسلام سے سلطان المعظم کے حقِ خلافت کے بارے میں فتویٰ طلب کیا جائے اور سلطان عبدالحمید خاں کو معزول کر کے کسی ایسے مسلمان کو خلیفہ بنایا جائے جو برطانیہ کا حامی ہو اور مقامات مقدسہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بیت المقدس ان سب کو حکومتِ برطانیہ کی سرپرستی میں دے دیا جائے اس طرح گویا حج بھی انگریزوں کی نگرانی میں ہوگا۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ گذشتہ ماہِ جون میں بیچارے بے گناہ مصریوں کو کس بے رحمی اور وحشیانہ سفاکی کے ساتھ سولی دی گئی اور ان سولی پر

چڑھے بے گناہوں کے پہلو میں دوسرے مجرموں کو سزائے تازیانہ دی گئی اور مسلمانانِ مصر نے اس پر احتجاج کیا تو برطانوی وزیر خارجہ نے شمالی افریقہ کے مسلمانوں کو وحشیانہ کارروائیوں کو بیان کیا اور مصر میں انگریزی افواج کی تعداد میں مزید اضافہ کر لیا گیا اسی طرح ماہ مارچ میں سقوطرا واقع افریقہ میں ایک سو مسلمانوں کو بے دریغ شہید کر دیا گیا آخر انگریزوں کے پاس یہ طاقت کہاں سے آئی اس کا صاف جواب ہے کہ ہندوستان کی دولت پر قابض ہونے سے ان کے اندر یہ غرور و نخوت پیدا ہوئی ہے آج اگر ہندوستان کی دولت ان کے قبضہ سے نکل کر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آجائے تو حکومت برطانیہ بیلجیم یا ہالینڈ کی طرح ایک چھوٹی سی ریاست بن کر رہ جائے گی اب دیکھنا یہ ہے کہ انگریز ہندوستان کی دولت پر کیوں قابض ہے اس کا سبب صرف ہندو مسلمانوں کی نااتفاقی ہے جب تک یہ قومیں باہمی اتفاق و مصالحت نہ اختیار کریں گی سلطنتِ عثمانیہ، حکومتِ ایران، افغانستان اور مراکش وغیرہ کی آزادی اس نااتفاقی کی بدولت معرض خطر میں رہے گی۔ انصاف سے دیکھئے تو ساری خطا اہل ہند کی ہے کہ اپنی جہالت و غلامی کی ذلت پر قانع اور تمام عالم کی ترقیات کے لیے مانع بن گئے ہیں جب تک نوعِ انسانی کی آبادی کا بڑا حصہ جو کل دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے اپنی غلامی پر رضامند ہو کر معدودے چند افراد کو ظلم و ستم رانی، حق تلفی، فساد پروری مختار مطلق بنائے رہیں گے تو ہر فرد و بشر کی آزادی خطرے میں رہے گی اگر انگریزوں کے بجائے کوئی دوسری قوم حکمراں ہوتی تو بھی ہندوستانیوں کی خوئے غلامی اس کا دماغ خراب کر دیتی اور اس کے اخلاق کو بگاڑ دیتی سچ تو یہ ہے کہ انگریزوں کی اس قدر خطا نہیں ہے جتنی ہماری آپ کی ہے۔ شاہِ انگلستان نے ۱۸۳۳ء اور پھر ۱۸۹۸ء میں ملکہ نے اپنے سرکاری اعلان میں یہ وعدہ کیا کہ ہندوستانیوں کو مالی اختیارات دے دئے جائیں گے جو ان کا بنیادی حق ہے مگر ہندوستانیوں نے چونکہ علم و ہنر اور سیاست سے اپنی توجہ ہٹالی اور

بے کار باتوں کی طرف مائل اور نا چاقی کا شکار ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ انگریز حکام جو ہندوستان آتے ہیں یہاں کی جہالت و بے خبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اغراض کو ہندوستان کی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں اور یہ ایک فطری بات ہے۔

زمانۂ جاہلیت کے شاعر نے اس قانونِ فطرت کو کیا خوب ادا کیا ہے ؎

ومن لم یذد حوضہٗ بسلاحہٖ یہدّم ومن لایظلم الناس یظلموا

جو شخص اپنے پانی کے حوض کی بزورِ شمشیر حفاظت نہیں کرتا دشمن کے ہاتھوں سے وہ حوض ٹوٹ کر رہے گا اور جو اپنے نفس پر ظلم سے دوسرے لوگوں کو اپنی طاقت سے باز نہیں رکھتا اس پر ظلم کیا جاتا ہے یہی قانونِ فطرت وحی آسمانی میں بھی ظاہر کیا گیا ہے "واعدوا لہم ما استطعتم" اپنے دشمنوں کی مدافعت کے لیے اپنی طاقت کے مطابق قوت مہیا رکھو گھوڑوں کو جنگ کے لیے پرورش کرو تمہاری یہ قوت اور جنگ کے لیے تیاری خدا کے دشمنوں کے دل میں تمہارا رعب اور خوف پیدا کر دے گی اور وہ تم پر حملہ آور نہ ہوں گے۔

اب اگر انگریزوں نے کل سرزمینِ ہند کو اپنی ملکیت قرار دے دیا یہاں کی زمینوں پر بھاری مال گذاری مقرر کر دی یا ہندوستانی صنعت کو غارت کر کے ہند کی بیرونی تجارت پر غالب آگئے یا اعلیٰ عہدوں پر اپنے ہم قوموں کو مقرر کیا اور ادنیٰ ملازمتیں ہندوستانیوں کے لیے مخصوص کر دیں یا عدالت میں انگریز قاتلوں کو سزائے جرم نہیں دی جاتی یہ سب ظلم و ستم جو اہل ہند پر انگریزوں کے ہاتھوں ہو رہے ہیں حقیقتاً ہندوستانیوں کی جہالت و گمراہی کا نتیجہ ہیں انگریزوں کی غلطی نہیں۔ اس زمانے میں قومی دولت مندی کا علم فلسفیانہ اصول پر مبنی ہے۔ بیرون و اندرونِ ملک میں باہمی تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی حد سے زائد پیچیدہ اور دقیق اصولوں کی واقفیت پر منحصر ہے مختلف قوموں کے آمدنی و خرچ سے کیفیت و احوال سمجھنے کے لیے ایک فلسفی کا

دماغ درکار ہے ایک بڑے دانشمند کی سی چھان بین کا مادہ جب تک نہ ہو تو دنیا کی تجارت کے راز سمجھ میں نہیں آسکتے یورپ و امریکہ کے گنے چنے افراد زمانہ بھر کی دولت کے مالک بن بیٹھے وہ اپنی غیر معمولی بے انداز دولت و ثروت کی بدولت تمام عالم کی تجارت وصنعت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آگئی ہے اور اپنے سرمایہ کی طاقت سے دنیا کو تہہ و بالا کیے رہتے ہیں یورپ کی حکومتیں ان کی رائے پر چلتی ہیں زمانہ بھر کے اخبار ان کے ہاتھوں میں ہیں وہ جس ملک کو زرخیز یا بیش قیمت جواہرات کی کانوں کا حامل دیکھتے ہیں تو یورپ کی کسی حکومت کو اس ملک کے لینے پر اپنی صحافت کے ذریعہ مجبور کر دیتے ہیں خلقت کا ہجوم ہو جاتا ہے اور خوں بہا کے مالک یہ یہودی قارون ہوتے ہیں وہ ایسے ہیرے تراشتے ہیں کہ عوام الناس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتے مثلاً جب دنیا کے بدقماش یہودی سود خواروں نے ٹرانس وال کی سونے کی کانوں پر قبضہ کرنا چاہا تو لندن ٹائمس جو یہودیوں کا خاص پرچہ ہے ان یہودیوں نے حکومت برطانیہ کو بھڑکا کر برطانیہ کو ٹرانس وال سے لڑا دیا بیچارے انگریزوں کا زبردست جانی نقصان ہوا اور دو سو ملین پونڈ یعنی تقریباً تین ارب روپیہ آنے والی نسلوں کے لیے قرضہ کے طور پر لگ گیا مگر خود وہ ٹرانس وال کی کانیں آج یہودیوں کے قبضہ میں ہیں ایسے ہی جب ان یہودیوں نے مصر کی دولت پر قبضہ کرنا چاہا تو پہلے خدیو مصر کو چالاکی سے کئی ملین پونڈ قرضہ دے دیا اور پھر مصر میں اپنی عیاری سے شورش پیدا کر کے برطانوی حکومت کو اپنے غاصبانہ سود کی حفاظت کے لیے مسلط کر دیا اب وہ اس فکر میں ہیں کہ فرانسیسی حکومت کو مراکش پر مغرب اقصیٰ کی طرف سے محاصرہ کر کے قبضہ میں لے لیا جائے ان کی غرض یہ ہے کہ زار روم کی طرح اس ملک کا خون چوس لیں اور کانوں پر قبضہ جمالیں جنگ کریمیا سے پہلے سلطنتِ عثمانیہ پر کسی مغربی حکومت کا تسلط نہ تھا لیکن انہی مردم خواروں نے برطانیہ

فرانس اور حکومتِ عثمانیہ کو ایک دوسرے سے ملا کر روس سے لڑا دیا اُس وقت سے ترک بھی ان انسان نما بھیڑیوں کے پنجہ میں آ گئے اور جو بھی لڑائی یا بغاوت وہاں رونما ہوتی ہے ترکوں کے گلے میں ان سرمایہ دار یہودیوں کا پھندا سخت سے سخت ہوتا جاتا ہے اس کے مقابلے میں جاپان کو دیکھئے کہ اس نے ترقی یافتہ قوموں کے معاشی راز اور اقتصادی امور کو کیسی خوبی سے سمجھ کر صنعت و حرفت کے کارخانے نئے اصولوں پر اپنے یہاں قائم کر لیے اور دنیا کی عالمگیر تجارت نے یورپین قوموں کا ہمسر و مدِ مقابل بن گیا ابھی جاپان کو دیکھ کر حکومتِ چین نے بھی اپنے آزمودہ کار لوگوں کو امریکہ و یورپ میں بھیجا ہے جنھوں نے قومی معاشیات کے اصول کو جدید طریقہ سے سیکھ لیا اور چین میں آہستہ آہستہ ان کا اجرا عمل میں آ رہا ہے۔

اب ہم پھر ان یہودیوں نسل کے موذی دشمنوں کی دست درازیوں اور ان کے ہاتھوں انگریزوں کی درگت یا بری حالت کو تحریر کرتے ہیں۔ جزیرہ برطانیہ ایک مختصر سازمین کا حصہ ہے جو بحر شمالی میں برِّاعظم یورپ کے شمال مغرب کی جانب واقع ہے اس کا رقبہ ہندوستان کا سوواں حصہ بھی نہیں ہے آبادی چالیس ملین سے زیادہ نہیں جزیرۂ برطانیہ کی تمام آراضی وہاں کے چند امرا کی ملکیت میں ہے ان امیروں نے ملک کے قطعات تقسیم کر لیے ہیں خوشنما باغات، خوبصورت پارک، سبزہ زار اور نہروں کا نظام قائم کر رکھا ہے وہ زراعت جس کے لیے ہندوستان پچھلے زمانے میں مشہور تھا برطانیہ میں اب اس کا نام و نشان نہیں ان کی جگہ بڑے بڑے کارخانے قائم ہو گئے ہیں جو انہی دولت مند اشخاص کی ملکیت میں ہیں ادنیٰ طبقہ کے لوگ مزدور بن کر دیہات سے معاش کے لیے شہروں میں آتے ہیں اور اس دولتمند گروہ کے زر خرید غلام بن کر رنج و مصیبت میں گرفتار رہتے ہیں درمیانی طبقہ یا تو حکومت کا ملازم ہے یا انہی تجارتی کارخانوں میں ملازم ہو کر زندگی

کے لیے گذر اوقات کر رہا ہے آمدنی کم خرچہ زائد ان میں کم ایسے لوگ ہیں جن کے پاس اپنا گھر ہے عام لوگ کرائے کے مکانات میں ساری زندگی گذار کر دنیا سے خالی ہاتھ چلے جاتے ہیں خلاصہ یہ ہے کہ گنے چنے افراد راحت و آرام میں زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں اور باقی لوگ زندگی کو ایک عذاب سمجھ کر اس کو کسی طرح سے گذار لیتے ہیں ان بدنصیبوں پر ان امیروں کی خاص نظرِ عنایت یہ ہے کہ انھوں نے جا بجا شراب خانے کھول دیئے ہیں کہ وہ شراب خوری کر کے اپنا غم غلط کریں اور اپنے حال میں مست رہیں حسنِ تدبیر کی کرامت سے دیوانگی اور خودکشی روز افزوں ترقی پر ہے ان مصیبت زدہ مفلسوں اور غریبوں کو خوش کرنے کے لیے ایک اور تدبیر بھی عمل میں لائی جاتی ہے یعنی برّ اعظم ایشیا و افریقہ میں مختلف ممالک پر قبضہ اور تسلط کے سلسلہ کو جاری رکھنا اگرچہ ان ممالک کے تاخت و تاراج کا سب سے بڑا فائدہ اسی اونچے طبقہ کو پہنچتا ہے تاہم اس ادنیٰ طبقہ کی بھی کچھ نہ کچھ اشک شوئی ہو جاتی ہے اور ان کے لیے خیر و فلاح کے دروازے کسی حد تک کھل جاتے ہیں یہ عجیب و غریب نظام اس فاسد تعلیم کا نتیجہ ہے جو اسکولوں میں رائج ہے اور مختلف اخبار و رسائل کے ذریعے ایسے مضامین کی اشاعت کی جاتی ہے جس سے انگریزوں کی عظمت اور تمام بنی نوعِ انسان کی طرف سے نفرت و حقارت کا بیج انگریز بچوں کے دلوں میں بو دیا جاتا ہے دارالعوام اور دارالامرا میں یہی معدودے چند افراد جو قوانین بنواتے ہیں وہ ان کی مصلحتوں کے موافق ہوتے ہیں بے چارے عوام یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ قانون ہماری بہتری کے لیے ہے سچ یہ ہے کہ جو ممالک آج تہذیب و تمدن کے مدعی ہیں ان کا نظام معاشرت عموماً اور برطانیہ کا نظام خصوصاً ایک پیچ در پیچ طلسم اور ایک لاینحل معمہ ہے جس کو دیکھئے ستم زدہ ہے جس کو دیکھئے تیر ستم کا شکار ہے مگر ستم گر کا پتہ نہیں ہے

ہاں در زباں پاستاں اشخاص بود بندگاں
اقوام را ایں غربیاں بندہ کنند از مکر و فن

یعنی پچھلے زمانے میں جو لوگ غلام تھے وہ خستہ حالی سے تھے۔ اب یورپ والوں نے اپنی مکاری وعیاری سے سب کو غلام بنا رکھا ہے۔

جب ان بنی نوع الانسان کے صیادوں نے اپنی مکاری سے انگلستان کی مخلوق کو اپنے دامِ فریب میں پھانس لیا ہے تو کیا عقلِ سلیم اس کو قبول کر سکتی ہے کہ وہ ہندوستانیوں کی محض چیخ وپکار سے ان کو غلامی سے آزاد کر دیں گے حاشا وکلّا۔ اگر رہائی اور گلو خلاصی کی ان موذیوں سے کوئی تدبیر ہے تو صرف وہی جو ہمارے برادرانِ وطن نے سمجھ لی ہے یعنی سودیشی تحریک صنعت وحرفت کا اپنے ہاتھ میں لینا، مدارس کا انتظام حکومت کی مداخلت کے بغیر کرنا، قوم کی تجارت کو قوم کے قبضہ میں رکھنا بس یہی فتح وظفر کی کنجیاں ہیں۔ اگر ہندوستانی یہی چال چلے تو سیاست کی شطرنج میں انگلستان کے غارت گروں کو دو طرف سے شہ مات کا پڑنا لازمی ہے اول تو یوں کہ جب انگلستان کی بنی ہوئی چیزوں کا ہندوستان میں بازار ٹھنڈا پڑ جائے گا تو انگلستان کے کارخانے معطل اور تمام کام کرنے والے بے کار ہو جائیں گے۔ پہلے ہی سے یہ حالت ہے کہ چین میں انگریزی تجارت دوسری قوموں کے مقابلے میں پچاسی ۸۵٪ فی صدی تھی جو اب باون ۵۲٪ فی صدی ہو گئی ہے جس قدر انگریزوں کی تجارت میں نقصان یا کمی ہو گی وہی امریکہ وجاپان اور جرمنی کی تجارت میں زیادتی وبیشی کا سبب بنے گا صرف چین پر کیا ہے تمام دنیا میں اب جرمنی وامریکہ اور جاپان کی مصنوعات کی گرم بازاری ہے اور انگریزی تجارت روز بروز گرتی جا رہی ہے ایسی حالت میں اگر کہیں ہندوستان کی تجارت بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئی تو انگلستان میں انقلاب عظیم اور شور انگیز بلووں سے دوچار ہو جائے گا اور وہ گرگ صفت یہودی جن کی دامِ بلا سے کوئی شخص بچا ہوا نہیں خود برطانیہ کا گلا بھی ان کے دانتوں میں دبا ہوا ہے وہ اپنی کرنی کو پہنچ جائیں گے اور اہلِ ہند برطانیہ دونوں ان کے چنگل سے چھوٹ جائیں گے دوسری طرح یہ بھی

قابل لحاظ ہے کہ جب ہندوستان میں انگریزوں کی تجارت غارت ہو جائے گی تو پھر برطانیہ کو یہ جنگی جہاز بنانے کا موقع نہ ملے گا اور تمام زمانے میں فتنہ پردازی اور کمزوروں پر دست درازی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے مثلاً دیکھئے آج کل برطانیہ کی ڈپلومیسی یعنی پیچیدہ تدبیر سیاست اس پر تلی ہوئی ہے کہ تاجدارانِ یورپ کے موجودہ تعلقات میں فرق آ جائے مراد یہ ہے کہ اٹلی کا اتحاد آسٹریلیا و جرمنی سے باقی نہ رہے بلکہ برطانیہ و فرانس و روس سے رابطہ اتحاد قائم ہو جائے اس طور پر فرانس مراکش کی اسلامی سلطنت پر متصرف ہو جائے اطالیہ، طرابلس الغرب اور البانیہ کو سلطنت عثمانیہ سے نکال کر ان پر اپنا حق جمائے روس قسطنطنیہ و شمال ایران کا مالک بن جائے اور برطانیہ ملک عرب تا صوریہ و افغانستان و جنوبی حصہ ایران کو اپنی سلطنت میں شامل کرلے اسی لیے انھوں نے سرویا بلغاریہ، مانٹی نگرو کو آسٹریا سے لڑا دیا ہے جو جرمنی کا حلیف ہے امید یہی ہے کہ اس طریقہ سے دولتِ عثمانیہ کے یورپی ممالک باہم تقسیم ہو جائیں۔ مگر ابھی یہ منصوبے خیال سے عمل تک نہیں آئے ہیں جس کا سبب صرف روس کی علیحدگی ہے اب ظاہر ہے کہ ہند کے وہ مسلمان جنھوں نے فقیروں کی طرح وائسرائے ہند سے خوشامدانہ التجائیں کی ہیں اور ہند اور برادرانِ وطن کے خلاف چلے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم ممالک اسلامیہ کے پائے استقلال میں خود کلہاڑی مارتے ہیں اور دنیائے تمدن کی نظر میں وطن سے بے وفائی و غداری کے ملزم ٹھہرتے ہیں وہ گویا وطن کی دائمی تباہی پر راضی ہو گئے اور حکومتِ برطانیہ کو بہت اچھا موقع مل گیا کہ تمام اہلِ ہند کے حقوق کو ایک غیر محدود زمانے تک معطل و ملتوی کر دے ان بے چارے مسلمانوں کو ابھی تک یہ خبر ہی نہیں کہ یورپ و امریکہ میں کوئی قوم مسلمانوں سے زائد وحشی و بدتر قیاس ہی نہیں کی جاتی وہ لوگ امت مرحومہ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) انسانی چمنستان تمدن میں ایسا خس و خاشاک جانتے ہیں جو فطرت کی شاخوں اور پھولوں کے

پھیلنے میں سدِّ راہ ہے لہٰذا وہ مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنا ایک نہایت ہی نیک کام سمجھتے ہیں وہ صاف کہتے ہیں کہ جہاں اسلام کی حکومت ہے انسانی ترقی مسدود ہے گویا اسلام انسانیت کی گردن میں ایک چکی کا پاٹ ہے جو ہر آدم زاد کو تمدن و حریت کے بلند میناروں پر چڑھنے سے مانع ہے وہ ہر شخص کے ساتھ مہربانی و شفقت جائز سمجھتے ہیں مگر مسلمانوں کو اس سے محروم رکھنا فرض جانتے ہیں ؎

آنکہ رحم از دل برو تا شیر خریاد من است — و آنکہ نسیاں آورد خاصیت یاد من است

یہ سب انگریزی مطبوعات کا فیض ہے جنھوں نے ایک صدی سے اسلام اور اسلام والوں کی صورت نہایت بدنما بھیانک بنا کر پیش کی ہے۔

الغرض ملتِ اسلام کے تحفظ کے لیے شرط لازمی اور امتِ محمدی کے مستقل ممالک کے قیام کے لیے امر ضروری اور محبت وطن کا مقتضا یہی ہے کہ مسلمان اہلِ ایشیا سے بالعموم اور اہلِ ہند سے بالخصوص محبت و ربط پیدا کریں۔

حال میں عنایتِ الٰہی نے برِّ اعظم ایشیا کی تمام اقوام کی حمایت کے لیے جاپان کو منتخب فرمایا ہے ہندو مسلم نوجوانوں کو وہاں کے مدارس علوم و فنون میں تحصیل علم و صنعت جدید کے لیے بھیجنا چاہیئے۔ شرفِ ذاتی کا جوہر عقل و دانش، حریت و مساوات کی روشنی میں مشرقِ اقصیٰ کے مطلعِ انوار سے حاصل کرنا چاہیئے۔ جاہلانہ تعصب اور فروعات پر نزاع سے قطع نظر کرنا چاہیئے ہر مذہب کی اصلی غرض اس کی کتاب کی رو سے خدا پرستی اور محبتِ خلقِ خدا، کوتاہ فہمی کی تیرگی کو روحانی تجلی سے محو کرنا اور حریت عامہ کی بنیاد ڈالنا ہے خاص خاص گروہوں میں حریت مساوات پیدا ہو جائے آخر نتیجہ یہی ہے کہ حریتِ عام حاصل ہو جائے کیونکہ فرداً فرداً ہر شخص کا آزاد ہو جانا، قوم کا آزاد ہونا ہے اور فرداً فرداً ہر قوم کی آزادی عالم کی آزادی ہے پس اگر ہندوستان ہمیشہ غلامی پر راضی ہے تو حریت عامہ حاصل ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے

اب جاپان ایک آزاد قوم ہے اور چین نے بھی آزادی کے اسباب مہیا کرتے شروع کر دئے ہیں اگر ہند نے بھی اس راہ میں قدم رکھا تو براعظم ایشیا کی نجات یقینی ہے اور چونکہ ایشیا کی آبادی کل عالم کی آبادی کا نصف ہے لہٰذا اس کی آزادی کل عالم کی ضامن ہے اب ہندو اور مسلمان کا فرض ہے کہ ہر قریہ ہر شہر و ضلع میں باشندگان کی انجمنیں قائم کریں۔ ساکنانِ شہر کی مردم شماری کریں اور شادی و غمی میں دوستی و اخلاص کا لحاظ رکھیں۔ حصولِ علم، حفظِ صحت، جسمانی و تعلیم سیاست کو فرض سمجھیں اگر ایک پر ظلم ہو کل جماعت مظلوم کی مدد کرے وہ لوگ جو وطن کے ساتھ بے وفائی روا رکھیں اور اغیار کی خدمت میں رہ کر اہل وطن پر ظلم توڑیں ان کو جماعت سے خارج کر دیں۔ حکومت آخر کیا چیز؟ انسان مدنی الطبع ہے وہ تنہا زندگی بسر کرنے کا عادی نہیں ہے۔ منفعت کا طلب کرنا، مضرت کا دفع کرنا یہ بھی ہر ایک کا طبعی خاصہ ہے پس جہاں مختلف افراد و انسان باہم ہوں گے ان میں نزاع کا بھی احتمال ہوگا۔ ایک ملک یا ایک ہی سرزمین کے باشندے جو طریقِ عمل باہمی رفع نزاع کے لیے مقرر کریں وہی وہاں کا قانون ہے۔

قانون کی رو سے فیصلہ نزاعات و اجرائے احکام قاضی کا کام ہوگا۔ جماعت میں امن قائم رکھنے کا ذمہ دار کوتوال اور پولس ہوگا اب بیرونی دشمنوں کے دفع کرنے کے لیے ایک خاص جماعت چاہیئے یہ لشکر ہے یہ خاص جماعت اپنی خدمت کا معاوضہ کل جماعت سے پائے گی یہ معاوضہ بصورت خراج کل جماعت سے لیا جائے گا پس قانون کا وضع ہونا، حکام کا تقرر بغرض اجرائے قانون ملک و ملت کے ضروری مصارف کے لیے خراج معین کرنا یہ سب قوم ہی کے ارادہ کا ظہور ہے جس ملک میں یہ نظام نہ ہو تو وہاں کی حکومت غیر طبعی ہے اور حکومتِ ہندوستانی کا یہی عالم ہے مٹھی بھر انگریز جو محض غیر ہیں اور ہمیشہ غیر رہنا چاہتے ہیں اہل ہند کے لیے قانون وضع کرتے ہیں اجرائے قانون کے لیے حکام بھی مقرر کرتے ہیں

اور خراج بھی اہل ملک پر معین کر دیتے ہیں اور ہندوستانیوں پر غلبہ و تسلط کی خاطر لشکر اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں لازم ہے کہ اس نظام فاسد کے دفع کرنے کے لیے ہندو اور مسلمان ایک ہو جائیں اور انگریزوں سے کہہ دیں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ انگریز اپنے اور ہندیوں کے حقوق مساوی سمجھیں۔ تمام ممالک برطانیہ میں ہندی ایسے ہی ممتاز رہیں جیسے خود انگریز رہتے ہیں اگر یہ منظور نہیں ہے تو قانون فطرت جو حفظ ذات کا حکم دیتا ہے ہندوستان کو ممالک متحدہ امریکہ کی طرح ایک مستقل (آزاد) ملک بنا دے گا۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے نہ بغاوت ضروری ہے نہ لشکر نہ سامان جنگ نہ توپ و تفنگ صرف اس قدر کافی ہے کہ ہر ہندی تمام طول و عرض ہند میں یکبارگی حکومت کی خدمت سے دست کش ہو جائے ملک کا تمام کاروبار آن واحد میں معطل ہو جائے اگر ایسا ہو تو ہر انگریز بجائے خود ایک اسیر کے حال میں آ جائے گا اگر پریشان قوم اس بے شمار مخلوق کو جو ٹڈی دل کی طرح ہندوستان میں چھائی ہوئی ہے ایک اجتماعی حالت میں لے آئیں تو اس کی قوت حدِ توصیف سے باہر ہو گی اور کسی اور بات کی ضرورت ہی نہ رہے گی ؎

اے قوم خفتہ برخیز ایں خواب بس گران است
تا کہ چنیں تغافل آتش بجان مان است
شو مجتمع چو پرویں بر آ بہ چرخ رفعت
چوں ذرہ شو پریشاں خاکت اگر مکان است

نہ آئے نیند جو ہو دل کو مہربان لگی
اٹھو اٹھو کہ بس اب آگ گھر میں آن لگی
ملا جو خاک میں دانہ نہال ہو کے رہا
بنے ہو خاک سے کیوں تم کو یہ شان لگی

(محمد برکت اللہ بھوپالی ہندی از نیویارک ممالک متحدہ امریکہ)

مولانا برکت اللہ پہلی بار قسطنطنیہ میں!

امریکہ کی طویل زندگی ایک سچّے انقلابی کی طرح اپنے نصب العین کی تلاش وجستجو اور منزلِ مقصود کے لیے نئے ستوں کے تعین میں بیتی او عملی سیاست کے ایک حقیقی طالب علم کی طرح بین الاقوامی حالات کے مطالعہ میں اور ایک سیاسی مفکر کی طرح سیاسی کوائف کے مشاہدہ اور تجربہ میں مولانا نے گذاری اس مدت میں بہت وسیع وعمیق تجربات سے اپنے دامن کو بھرلیا اور ان تجربات سے نہ صرف مستقبل میں فائدہ اٹھایا بلکہ خود امریکہ میں اس کے لیے زمین کو ہموار کیا اور اسی زمین پر آگے چل کر غدر پارٹی کی تعمیر ہوئی مولانا جب امریکہ پہنچے ہیں تو اس وقت اس نئی آزاد شدہ نوآبادی نے برطانوی سامراج کے خلاف کھل کر پارٹی بنانا اور وہ بھی ہندوستان کی آزادی کے لیے آواز اٹھانا امریکہ کی سرزمین اس کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی اس لیے بحالتِ موجودہ خدا کی زمین کے وسیع خطوں کو تلاش کرنا شروع کیا کیونکہ وہ تحریک شیخ الہند سے وابستہ ہوچکے تھے اس لیے ان کے تجویز کردہ مشن جاپان کے لیے سربراہ بن گئے بقول ایم عرفان

"ہندوستان میں سنہ ۱۸۹۸ء سے سنہ ۱۹۱۵ء تک ہندو مسلمان انقلابی اتحادی مقصد کے باوجود الگ الگ حلقوں میں بٹے ہوئے تھے مہاراشٹر اور بنگال ہندو اتحادیوں کے گڑھ تھے تو مدرسہ دیوبند مسلمان انقلابیوں کا مرکز تھا لیکن ہندوستان سے باہر ہندوستانی باشندہ صرف ہندوستانی سمجھے جاتے تھے وہاں ہندو مسلم کے الگ الگ خانے نہیں تھے۔"

شیخ الہند نے جن سفارتوں کو بیرونی ہند بھیجا تھا ان میں پہلا چینی مشن تھا جو مولانا مقبول الرحمٰن سرحدی (شاگرد شیخ الہند) کی رہنمائی میں شوکت علی بنگالی کے ساتھ بھیجا گیا تھا مولانا انگریزی و چینی زبان سے ناواقف تھے لیکن شوکت علی تھوڑی بہت انگریزی اور چینی زبان جانتے تھے یہ مشن چھ افراد پر مشتمل تھا اس مشن میں سیرت کمیٹی کے نام سے اپنے کام کا آغاز ۱۹۰۵ء میں "الصّین" ماہنامہ کے ذریعہ کیا جو ۱۹۰۹ء تک جاری رہا یہ مشن چین و برما میں کام کرتا رہا۔ مولانا مقبول الرحمٰن نے عربی زبان میں "اللسان" نامی کتاب لکھی جس کے اندر برطانوی سامراج کے مظالم و غارت گری کو تفصیل سے لکھا۔ مولانا طب کے ذریعہ اور شوکت علی ایلوپیتھک طریقۂ علاج کی آمدنی سے اس مشن کو چلاتے رہے جب وہ برما منتقل ہوئے تو تین افراد چین ہی رہے اور ایک فرد مزید ہدایات کے لیے ہندوستان آگیا یہ مشن اپنے مقصد میں کامیاب رہا دوسرا مشن جو پانچ نفر پر مشتمل تھا مولانا برکت اللہ کی قیادت میں جاپان کے لیے تجویز ہوا چنانچہ مولانا جب امریکہ سے چلے تو پہلی منزل فرانس بنی وہاں ٹھہر کر جب آگے چلے تو حسب روایت رفیق بھائی دارالخلافت قسطنطنیہ نے ان کے قدم پکڑ لیے چونکہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے امید کی روشنی کچھ نظر آئی مولانا جب استنبول پہنچے تو ان کے رفیق سفر ایک اور صاحب بھی تھے اس وقت حکومتِ ترکی سخت کشمکش سے گزر رہی تھی اندرونی مخالفتیں اور بیرونی ریشہ دوانیاں ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھیں سلطان محمد خامس عثمانی اس بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کو بچانے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا حکومت کے خلاف بغاوتوں اور مخالفانہ تحریکوں کو دبانے کے لیے سخت پابندیاں عائد کر رکھی تھیں چونکہ وہ امریکہ کی آزاد فضاسے تازہ تازہ وارد ہوئے تھے جمعہ کا دن تھا کافی لوگ جمع تھے نماز کے بعد ان کے ساتھی نے مسجد جامع میں وعظ شروع کر دیا پھر وعظ کے اندر حکومت پر نکتہ چینی بھی کر ڈالی اول تو وہاں قانون کے مطابق بغیر اجازت کے وعظ ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کہاں یہ گرم تنقید اور حکومت پر نکتہ چینی وہ ساتھی فوراً گرفتار کر لیے گئے اور یہ مقدمہ قاضی القضاۃ کے پاس پہنچا مولانا بھی جا پہنچے

قاضی صاحب ترکی زبان میں مولانا کے ساتھی کو قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دیا مولانا نے فارسی میں جواب دیا قاضی صاحب جواب الجواب دیتے رہے آخر زچ ہو کر ساتھی کو جیل بھیج دیا گیا مولانا تنِ تنہا رہ گئے لوگوں نے انور پاشا سے ملنے کا مشورہ دیا انور پاشا نے صدر المہام سے مولانا کی ملاقات کرادی صدر المہام مولانا کی گفتگو سے اس قدر متاثر ہوا کہ نہ صرف ان کے ساتھی کو رہا کر دیا بلکہ مولانا کو قیام کی دعوت دی اور ہر طرح کی امداد کی توقع دلائی اس واسطے سے مولانا کی سلطان المعظم تک رسائی ہو گئی وہ تو موقع کی تلاش ہی میں تھے اس کو غنیمت جانا اور ترکی میں قیام کا فیصلہ کر لیا کچھ دنوں وہاں کے احوال و کوائف کا جائزہ لینے کے بعد ایک ہفتہ وار اخبار "الخلافت" کا ڈول ڈالا جس کا ایک کالم عربی اور ایک ترکی میں ہوتا تھا ترکی خلافت کی تائید و مدح سرائی کی جاتی تھی خود سلطان بھی خلافت کی تائید سے اپنی حکومت کو مضبوط بنانا چاہتے تھے۔ ابتداءً انگریزی سیاست پر ہلکی پھلکی تنقید کی جاتی رہی صدر المہام نے اخبار کی توسیع کے لیے مزید امداد کا وعدہ کیا شروع میں اخبار کی پالیسی معتدل رہی پھر مولانا کا محبوب موضوع انگریز مظالم کا تذکرہ جو ہندوستان پر توڑے گئے تھے اور جس طرح ہندوستانیوں کو بھوکا مار کر استحصال کیا جاتا تھا خوب آب و تاب سے لکھے جاتے رہے یہاں تک کہ مولانا کے مضامین حکومت کی خارجہ پالیسی سے ٹکرانے لگے اس پر صدر المہام نے ان کو بلا کر کہا کہ ہم نے آپ کو سیاسی پناہ گزیں کی حیثیت سے رہنے کی اجازت دی تھی انگریزی حکومت یہ سمجھتی ہے کہ جو مضامین اس اخبار میں شائع ہوتے ہیں اس کے اندر ہماری حکومت کا ایما شامل ہے اس لیے حکومت کا محکمۂ اطلاعات جب تک سنسر نہ کر لے گا اخبار شائع نہیں ہوگا مولانا نے اس پابندی کو قبول نہ کرتے ہوئے اخبار بند کرنے کا فیصلہ کیا مولانا کی گزراوقات کے لیے حکومت نے روزینہ مقرر کرنے کو کہا اور یہ کہ آپ عام شہریوں کی طرح رہ سکتے ہیں بصورتِ دیگر جہاں جانا چاہیں حکومت اس کے لیے سہولتیں فراہم کرے گی چنانچہ مولانا نے قاہرہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور قسطنطنیہ کو خیرباد کہہ کر قاہرہ پہنچے۔ وہاں پہنچ کر حسبِ معمول ایک اخبار جاری کیا جس کا ایک کالم عربی اور ایک فارسی میں

ہوتا تھا حکومتِ مصر نے ابتداءً کوئی توجہ نہ کی کیونکہ یہ اخبار قاہرہ میں کم اور عرب ممالک اور ایران میں زیادہ تر بھیجا جاتا تھا اور وہاں سے کافی رقم اخبار کے لیے مل جاتی تھی کچھ عرصہ بعد جب اخبار مذکور کا لب و لہجہ فرنگی سامراج کے خلاف سخت ہوتا گیا تو انگریزی قونصل خانہ کی طرف سے حکومتِ مصر پر سخت دباؤ ڈالا گیا اور مولانا اور ان کے ساتھی کا مصر سے اخراج کر دیا گیا بہر حال مولانا نے ان دونوں اسلامی ملکوں سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ پوری ہوتی نظر نہیں آئیں بلکہ جلاوطنی اور زباں بندی کی مصیبت سے دوچار ہونا پڑا تو اب سابقہ پروگرام کے مطابق جاپان کا رخ کیا۔

مولانا برکت اللہ جاپان میں

مولانا برکت اللہ بھوپالی نے عنفوان جوانی میں جب دشت غربت میں قدم رکھا تو اس اعلیٰ نصب العین کے مسافر نے پھر کسی ملک کو مستقل وطن نہیں بنایا ایرانی دنیا اور نئی دنیا کو چھان مارا شروع میں ان کا مشن دینی و مذہبی تھا لیکن لندن کے گیارہ سالہ قیام نے برطانوی سامراج کے مشرقی ممالک کے لیے مکروہ منصوبہ کو بے نقاب کر دیا۔ ان کو اندازہ ہوگیا کہ کوئی بھی مشن مغربی سامراج کے زیر سایہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا جب تک سامراج کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر نہ پھینک دیا جائے اس لیے لندن کی زندگی نے سیاست کا سبق سکھایا امریکہ میں فرنگی حکومت کی گلوخلاصی کی تحریکات سے آگاہی ہوئی اور انھوں نے آزادیٔ ہند کے لیے سیاسی پروگرام تجویز کیا امریکہ کی زندگی نے سیاست کا چسکہ پیدا کر دیا یہ عجیب و غریب حقیقت قابل ذکر ہے کہ مشرق کے اکثر مصلح مذہب کی راہ سے سیاست کے میدان میں آئے لیکن پھر لیلائے سیاست نے ان کو اپنی زلفوں کا ایسا اسیر کیا کہ عمر بھر اس کی قید سے نہ چھوٹ سکے مولانا ۱۹۰۵ء میں امریکہ سے روانہ ہوئے سال ڈیڑھ سال استنبول میں آزمائشی طور پر گزرا لیکن کامیابی کی ادنیٰ جھلک بھی جب نظر نہ آئی تو پھر طے شدہ پروگرام کے مطابق جاپان جا پہنچے۔

جاپان کا سیاسی ارتقا

جب مشرق کے اس چھوٹے سے مگر سب سے اہم ملک میں مولانا نے قدم رکھا

تو اس وقت جاپان مشرقی اقوام کی آنکھوں کا تارہ بنا ہوا تھا جاپان ایشیائی ملکوں میں ایک نوخیز مگر عجیب و غریب ملک ہے جاپان و روس کی جنگ ۱۹۰۵ء میں اس کی فتح یابی نے تمام دنیا کو اس کی طرف متوجہ کر دیا پھر جنگ عالمگیر ۱۹۴۲ء اس کی بجلی کی طرح فتوحات کی چمک نے نگاہوں کو خیرہ کر دیا لیکن ڈرامائی عروج کے بعد افسوس ناک زوال نے عبرت ناک منظر پیدا کیا امریکہ کے وحشیانہ ایٹمی حملہ نے انسانیت کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا اور مادی ترقی کے اس پیمانہ عمل نے سامراج سے نفرت کو بیدار کر دیا مگر جاپان معاشی بربادی کے بعد اپنے عزمِ محکم اور عمل پیہم کے ذریعہ بین الاقوامی برادری کے اندر صنعت و حرفت کے میدان میں کھویا ہوا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اس کی مختصر سیاسی تاریخ یہ ہے کہ سب سے پہلے چین نے اس ملک کو چھٹی صدی میں گمنامی کے درجہ سے نکال کر تہذیب و تمدن، فلسفہ و حکمت، صنعت و حرفت کے میدان میں لا کر کھڑا کر دیا وہ جاپانی شہنشاہ سورج کی اولاد سمجھا جاتا تھا لیکن ملکی اقتدار ہمیشہ مذہبی پیشواؤں (شیوگن) کے ہاتھ میں رہا اصل قوت کا سرچشمہ جاگیردار طبقہ (ڈائیمو) رہا جن کی باہمی معرکہ آرائیاں جاری رہتی تھیں انہی کے ماتحت وہ جاں نثار سپاہی (ہمورابی) ہوتے تھے جو اپنے سرداروں کے لیے جانیں گنوایاں کرتے تھے ان کی جاں نثاریوں کا عوام کے دلوں میں گہرا اثر تھا۔ سولھویں صدی کے آغاز میں جاپان کو بھی مغربی سامراج نے عیسائی مذہبی اشاعت کے بہانہ دراز دستیوں کا نشانہ بنانا چاہا لیکن جاپان نے متحد ہو کر ان کو نکال پھینکا البتہ امریکی امیر البحر نے ۱۸۵۳ء میں اپنے بحری بیڑہ کے لیے جگہ مانگی جاپان نے جب اس کو قبول نہ کیا تو انگریزوں اور امریکیوں نے مل کر گولہ باری کی اور ۱۸۵۷ء میں بالجبر اس کو منوا لیا اس کے نتیجہ میں شہنشاہِ جاپان جو شاہِ شطرنج تھا اس کو پورا پورا اقتدار مل گیا ۱۸۶۲ء میں جاپانی سفارت نے مغربی ممالک کی ترقیات کا جائزہ لے کر ان کو اپنے ملک میں جاری کرنے کا پکا ارادہ کر لیا چنانچہ ۱۸۷۱ء میں بکھرے ہوئے مقبوضات کو شہنشاہ کے ماتحت بنا کر جاپان مشرق کی زبردست طاقت بن کر ابھرا اور ۱۸۹۰ء میں شہنشاہ

نائبِ خدا مان لیا گیا رعایا کے تین طبقہ نواب و تعلقدار (کازوکو) دوم جنگجو سپاہی (شذوکو) سوم عوام (ہیومن) شمار ہوتے تھے اسی سال عوام کو انتخاب میں فتح ہوئی۔ ۱۸۹۴ء میں چین جاپان میں جنگ ہوئی جس نے عوام کے مقابلہ میں برسر اقتدار طبقہ کو طاقت بخشی ۱۹۰۲ء میں اینگلو جاپانی معاہدہ ہوا جو روس پر حملہ کا پیش خیمہ بنا ۱۹۰۴ء میں جاپان کی روس پر فتح عظیم نے ساری دنیا کو حیرت زدہ کر کے فخر ایشیا بنا دیا جاپان میں شاہ پرستی ٹینوازم کو وہی مقام حاصل ہے جو یورپ میں جمہوریت اور روس میں اشتراکیت کو ہے یہی عقیدہ ان کو تاریخی تسلسل کے ساتھ متحد رکھنے کا باعث بنا جاپان اس اتار چڑھاؤ سے گزر رہا تھا کہ عین نقطۂ عروج کے موقع پر مولانا برکت اللہ بھوپالی نے اس کی سرزمین پر قدم رکھا جب مولانا وہاں پہنچے تو ہندوستانی جلاوطن بم پارٹی کے چند افراد وہاں پناہ گزیں تھے جس کے سربراہ راش بہاری بوس تھے ابتداءً مولانا جاپان کے مقامی رسائل میں بسر اوقات کرتے رہے ان کے معلوماتی مضامین پسندیدہ نظری سے دیکھے جانے لگے۔

مولانا کی ٹوکیو یونیورسٹی میں پروفیسری!

اس عرصہ میں مولانا نے وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر یہ معلوم کر لیا کہ امپرر کے یہاں کو نسا رسالہ پسند کیا جاتا ہے اس کے ایڈیٹر سے ملاقات کر کے وہاں کے حالات کے اعتبار سے ایک مذہبی مضمون تحریر کیا جس کے اندر اعلان قرآنی کے مطابق وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ ہر قوم میں کوئی نہ کوئی ڈرانے والا ضرور گذرا ہے۔ وَلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ اس آیت کریمہ کی وہ تشریح جو حضرت مرزا مظہر جانجاناں میں اپنے مکاتیب میں کی ہے مولانا اس کو مخصوص انداز میں تحریر کر کے شائع کیا مرزا صاحب لکھتے ہیں۔

"آیت کریمہ وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ اور دیگر آیات سے یہی معلوم

ہوتا ہے کہ ہر جگہ انبیاء و رسول بھیجے گئے ہیں اور کچھ آثار باقی ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ممالکِ ہند میں بھی رسول و نبی بھیجے گئے ہیں جو کمال و تکمیل کے مرتبہ تک پہنچ گئے تھے اور باور کیا جانا چاہئے کہ رحمتِ عامہ نے اس وسیع مملکت کو فراموش نہیں کیا اہلِ ہند کی پرانی کتابوں سے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی پیدائش کے آغاز میں رحمتِ الٰہی نے ان کی دنیا و آخرت کی اصلاح کے لیے وید نامی کتاب برہمہ نامی ایک فرشتہ جو دنیا کی ایجاد کا وسیلہ و آلہ ہے کے ذریعہ بھیجی تھی یہ کتاب چار دفتر رکھتی ہے اور احکام امر و نہی اور ماضی و مستقبل کی خبروں پر مشتمل ہے جو کچھ ان کے پچھلوں نے تصرفات کئے ہیں وہ قابل اعتبار نہیں ان کے تمام فرقہ خدا تعالیٰ توحید پر متفق اور دنیا کو حادث و مخلوق جانتے ہیں دنیا کے فنا ہونے اور جسمانی حشر اور نیک و بد اعمال کی جزا و سزا پر یقین رکھتے ہیں ان لوگوں کو علوم عقلی و نقلی ریاضیات مجاہدات تحقیق معارف و مکاشفات میں ید طولیٰ حاصل ہے ان لوگوں میں بت پرستی کی رسم الوہیت میں شرک کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کی حقیقت دوسری ہے۔

اس حقیقت کو دوسری جگہ مرزا صاحب نے اس طرح بیان کیا ہے کہ بعض فرشتوں یا بعض کاملوں اور زندۂ جاوید شخصیتوں کے بت بنا کر ان کے توسط سے حقیقت خدا کی طرف توجہ کی جاتی ہے جو مسلمان صوفیوں کے عملِ ذکر رابطہ سے مناسبت رکھتا ہے کہ وہ اپنے پیر کی صورت کا تصور کرتے اور اس سے فیض اٹھاتے ہیں بس اتنا فرق ہے کہ وہ پیر کا بت نہیں تراشتے کفار عرب تو بتوں کو اپنی ذات سے مؤثر و متاثر سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ کو ان کا آلۂ تصرف نہیں گردانتے تھے ان کو زمین کا خدا جانتے تھے اور خدا کو آسمان کا یہ الوہیت میں شرک ہے ان کفارِ ہند کا سجدہ کرنا سجدۂ تحیت ہے سجدۂ عبودیت نہیں۔"

بہر حال مولانا نے مرزا صاحب کے ان افکار و خیالات کی روشنی میں اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ ہندوستان میں مہاراج کرشن اور جاپان میں کون اور چین میں کنفیوشس ان خصوصیات کے حامل ہیں جن کو پیغمبر کہا جا سکتا ہے۔

جاپانی زبان میں اس مضمون کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف اس کی دھوم مچ گئی مذہبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا چنانچہ جاپان کے امپرر کی طرف سے ملاقات کا دعوت نامہ موصول ہوا اس نے مولانا کو شرف باریابی بخشا بہت خوشگوار ماحول میں گفتگو ہوئی سو پونڈ نذرانہ پیش کیا اور مولانا کے پاس تیسرے دن ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو پروفیسری کے لیے احکام آگئے بنگلہ بھی مل گیا مولانا نے اپنی ذہانت و فراست اور سیاسی بصیرت سے ارکانِ حکومت سے ربط پیدا کر لیا جب ان کی پوزیشن مضبوط ہو گئی اور سیاسی اعتبار سے قدم جم گئے تو مولانا نے ایک طرف مذہبی و دینی بنیاد پر ایک جماعت اسلامک فرینٹرنیٹی

یعنی اخوت اسلامی کے نام سے قائم کی جس کے اندر ٹوکیو میں آباد تمام مسلمان باشندوں کو اس تنظیم سے وابستہ کر دیا دوسری طرف جلاوطن ہندوستانیوں کو منظم کرنے کا کام شروع کیا جب اس تنظیم کا حلقۂ اثر وسیع ہوتا گیا تو مولانا کی سیاسی سرگرمیاں اس کے بطن سے نمودار ہونے لگیں جزائر شرق الہند برما و جاوا کے بسنے والے ہندوستانیوں کو اپنی تحریروں سے برطانوی سامراج کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تعلیم دی جانے لگی یہ اخبار دینی و تبلیغی مسائل کے ساتھ سیاسی دعوت کا بھی ترجمان بن گیا یہ ہفت روزہ انگریزی و جاپانی اور اردو بھی شائع ہونے لگا۔

مولانا کی جاپان میں دینی و سیاسی سرگرمیاں!

اسلامک فریٹرنیٹی کو نہ صرف جاپان میں مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ برما و لنکا ملایا و جاوا اور انڈو چائنا تک اس کا دائرہ وسیع ہو گیا اس کے ڈیلرس مقرر ہو گئے جس کے اندر برطانوی سامراج کے خلاف تمام ہندوستانیوں کو متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہو جانے کی کھلے بندوں تعلیم دی جانے لگی چنانچہ اس اخبار کا داخلہ ملک

محروسۂ برطانیہ میں بند کر دیا گیا۔

مولانا نے اپنے مخلص دوستوں کے تعاون سے اس آواز کو ہندوستان پہنچانے کے لیے عجیب و غریب طریقہ اختیار کیا کہ جاپانی جوتوں کے پارسل کے اندر اس اخبار کی کاپیاں رکھ دی جاتیں اور شناسا افراد کے نام یہ پارسل کر دیئے جاتے بقول ملا رموزی مرحوم

"مولانا کے ایک دوست محمد صدیق جو کسی دیسی ریاست کے دیوان تھے ان کے نام جب یہ پارسل پہنچا تو گورنمنٹ کی خفیہ پولس کو اس کی بھنک مل گئی اس کو ضبط کر کے ممنوعہ لٹریچر کے وصولی کے جرم کی کارروائی شروع ہو گئی وہ تو یوں کہئے چونکہ صدیق صاحب کے تعلقات وہاں کے پولیٹکل ایجنٹ سے گہرے تھے اس لیے اس مصیبت سے نجات ملی مولانا کے بچپن کے ساتھی میجر عبدالسلام نے سنہ ۱۹۱۰ء میں بنگلور کے فوجی کیمپ سے ایک خط لکھا مولانا نے اخبار ان کے نام جاری کر دیا جب گورنمنٹ نے نوٹس لیا تو بند کر دیا گیا اس دور میں مولانا کے تعلقات ہندوستان کے انقلابیوں سے قائم تھے کانگریسی رہنماؤں سے اس لیے رابطہ نہ تھا کہ اس وقت تک کانگریس انقلابی رجحانات سے خالی تھی آزادئ ہند کا تصور تو کجا ہوم رول کا تصور بھی صفحہ خیال پر نہ ابھرا تھا البتہ حسرت موہانی سے خط و کتابت تھی چنانچہ اس دور کی ایک نظم اردوئے معلیٰ میں چھپی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

ہم مریں اور غیر ہوں حکامِ ہند
یہ خطا ہے یہ نہیں ہرگز ثواب

پوری نظم میں ٹیپ کا مصرعہ عربی کا تھا ؎

ذالک عیاتی عنقریب الصواب

بہر حال مولانا کی یہ انقلابی سرگرمیاں جوں جوں آگے بڑھتی گئیں اخبار کا لب و لہجہ روز بروز سخت سے سخت ہوتا گیا اور بقول رولٹ کمیٹی جب لب و لہجہ کی سختی دائرۂ اعتدال سے آگے نکل گئی تو برطانوی سفیر نے جاپانی

حکومت سے احتجاج کیا ابتداءً تو امپررنے مولانا کو فہمائش کی ان سرگرمیوں کو یک لخت بند کر دیا جائے یہ رویہ حکومت کے لیے ناقابلِ برداشت ہے چنانچہ مولانا نے کچھ دنوں تک نرم پالیسی اختیار کی اور دینی و اخلاقی مضامین شائع ہونے لگے لیکن حکومت برطانیہ کے شدید دباؤ کی وجہ سے اخبار کی بندش اور پروفیسری سے علیحدہ ہونے کے احکام آگئے مولانا نے جوڑ توڑ کر کے امپررر سے ملاقات کا موقع حاصل کر لیا امپررنے مسکراتے ہوئے فرمایا پروفیسر صاحب آپ کا وزن جاپان کی زمین برداشت نہیں کر سکتی جہاں آپ جانا چاہیں بھیجا جاسکتا ہے اور اب مولانا ۱۹۱۱ء میں جاپان سے رختِ سفر باندھنے کے لیے مجبور ہو گئے قیام جاپان کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے یورپ کے اسفار کا سلسلہ قائم رہا جیسا خواجہ حسن نظامی کے سفرنامہ سے پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"پورٹ سعید (مصر) میں کوک کمپنی کی معرفت خرچ منگایا تھا جب پورٹ سعید پہنچا تو معلوم ہوا کہ روپیہ ہندوستان سے نہیں آیا عجیب پریشانی کا سامنا ہوا اور پانچ چھ روز نہایت پریشانی سے گزرے جن میں کچھ فاقے بھی برداشت کرنا پڑے چونکہ یہاں کسی سے شناسائی نہ تھی اور پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کو فروخت کر دیا جاتا اس فاقہ کشی کے زمانہ میں مولانا برکت اللہ بھوپالی مقیم ٹوکیو (جاپان) سے ملاقات ہوئی جو قسطنطنیہ سے آرہے تھے اور جاپان جا رہے تھے ان کی عالمانہ صحبت نے بہت فائدہ پہنچایا مگر ان کو خبر نہ تھی کہ میرا پیٹ روٹی مانگتا ہے اور دل و دماغ میں سوچنے کی طاقت نہیں ہے۔

(سفرنامہ مصر و شام و حجاز ص ۹۷-۹۶)

مولانا کے قیام جاپان کے زمانہ میں ہندوستان کے جلاوطن انقلابیوں سے جب

گاڑھی چھنی تو ایک انقلابی پارٹی کی بنیاد پڑ گئی مولانا کے ساتھی متھرا سنگھ نے سنگھائی میں اور بھگوان سنگھ نے ہانگ کانگ میں اس کی شاخیں قائم کر دیں اسی پارٹی کے خاکہ میں غدر پارٹی امریکہ کے ذریعہ عملی رنگ بھرا گیا جس نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی بہرحال قیام جاپان کی اس مدت میں مولانا نے سنگاپور ہانگ کانگ اور کولمبو کے ہندوستانیوں تک اپنی آواز پہنچائی۔

مولانا کی آمد فرانس! ۱۹۱۲ء

مولانا نے سرزمین ایشیا کی اس قابل فخر سرزمین جاپان کو بادل نخواستہ چھوڑا اب ان کو ہندوستانیوں انقلابیوں کی دعوت فرانس کے لیے پہنچی چونکہ فرنس کے لیے جو خفیہ مشن بھیجا گیا تھا جس کے قائد چودھری رحمت علی پنجابی تھے ان کے مشہور صحافی رام چندر بھی تھے جو بعد میں کٹ گئے اس مشن سے خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا اس لیے اس کے اندر سرگرمی وتیزی پیدا کرنے کے لیے مولانا جیسے تجربہ کار جہاں دیدہ قائد کی ضرورت محسوس کی گئی اس لیے مولانا اوائل ۱۹۱۲ئ میں پیرس پہنچ گئے اور آزادئ ہند کے لیے جو اخبار "الانقلاب" پہلے جاری کیا گیا تھا اس کی ادارت مولانا کے سپرد کردی گئی چونکہ فرنچ زبان سے ان کو پہلے سے واقفیت تھی اس لیے اخبار مذکور تھوڑے دنوں کے بعد چمک گیا اور جاپان کے اخبار کی طرح اس کے اخراجات پورے کیے جانے لگے۔ اس اخبار کو ہندوستان تک پہنچانے کے لیے اس خفیہ مشن نے رنگ کی سپلائی کا کام شروع کردیا جو تاجروں کو بھیجا جاتا اور اس کے ذریعہ ملک کے انقلابیوں سے رابطہ قائم رکھا جاتا لندن کی طرح پیرس بھی دنیا کی ہر تحریک کا مرکز بنا رہتا تھا اس لیے برطانیہ کے دوست ملک فرانس میں انگریز دشمن خیالات کا پرچار اور برطانیہ کی سامراجی پالیسیوں پر گولہ باری شروع کردی گئی یہاں سے آزادئ ہند کا پیغام نہ صرف یورپ بلکہ افریقہ کے ممالک تک پہنچا اور مولانا نے چودھری صاحب کو امریکہ میں ہندوستان کی آزادی کے لیے سیاسی مرکز قائم کرنے کو بھیجا چودھری رحمت علی جو اعلیٰ درجہ کے سوجھ بوجھ کے آدمی تھے امریکہ پہنچ کر انھوں نے ایک ہوٹل قائم کیا

جو ہندوستان کے انقلابیوں کا مرکز بن گیا جب مشہور انقلابی لالہ ہردیال دوبارہ امریکہ پہنچے تو چودھری صاحب یہ کام ان کے سپرد کر کے خود پیرس آگئے چونکہ فرانس اور برطانیہ پچھلی جنگوں کے مہلک و تلخ تجربات کے نتیجہ میں ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے اس لیے پیرس یا لندن میں بیٹھ کر آزادی کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کرنا مشکل ہو گیا لالہ ہردیال کی طرح مشہور انقلابی شیاما کرشن ورما جو لندن میں رہ کر کام کر رہے تھے وہ بھی امریکہ جا پہنچے۔

مولانا کی امریکہ کی طرف دوبارہ مراجعت

مولانا کا جاپان میں قیام پانچ سال کے قریب رہا جس کے اندر ۱۹۱۱ء میں انکی شہرت و مقبولیت نقطۂ عروج پر پہنچ گئی برطانوی حکومت کے سخت نوٹس پر ان کو جاپان سے نکال دیا گیا اُدھر راش بہاری بوس پارٹی کی باہمی رسہ کشی اور ادھر جاپان کی برطانیہ سے صلح پسندی کی وجہ سے اب جاپان میں ہندوستانی کام کی بیل پروان چڑھتی نظر نہیں آئی اس لیے جاپان کو الوداع کہہ کر فرانس میں قدم ٹکانے کی کوشش کی لیکن حریت و آزادی کا مدعی ملک بھی ہندوستان کی آزادی خواہ لوگوں کو جگہ نہ دے سکا اس لیے دوبارہ امریکہ کو مولانا نے منزلِ مقصود بنایا یہ وہ زمانہ تھا کہ دنیا جنون و دیوانگی کی دہلیز پر پہنچ کر انسانیت کی تباہی کے لیے دستک دے رہی تھی۔ مغربی اقوام کی برسوں کی رقابتیں اپنا رنگ دکھانے والی تھیں مشرق و مغرب ایک قیامت صغریٰ سے دوچار ہونے کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا آسٹریا کا شہزادہ آئرستان کی سرحد پر جولائی ۱۴ء میں قتل کر دیا گیا اور چار اگست ۱۴ء کو جنگ عظیم کا لاوا پھٹ پڑا یورپ کی تمام قومیں جنگ میں کود پڑیں البتہ امریکہ کے صدر ولسن نے اپنے ملک کو جنگ کے شعلوں سے بچا لیا امریکہ کی آغوش یورپ کے مقابلہ میں آزادی خواہ افراد کے لیے کھلی ہوئی تھی جہاں لالہ ہردیال دہلوی غدر پارٹی کے لیے

زمین ہموار کر رہے تھے شیاما جی بھی وہاں پہنچ چکے تھے لالہ جی آکسفورڈ یونیورسٹی میں ۱۹۰۵ء سرکاری وظیفہ سے داخل ہوئے تھے لیکن جوشِ آزادی میں وظیفہ کی آخری قسط واپس کر دی لاہور میں ۱۹۰۸ء میں ایک کلاس جاری کر کے برطانوی مال کے بائیکاٹ کی تحریک چلائی ۱۹۱۱ء میں سان فرانسسکو پہنچ کر ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں مختلف مقامات پر انجمنیں قائم کیں جس کے اندر ہر ممبر سے یہ خفیہ معاہدہ لیا جاتا تھا کہ وہ ہندوستان میں انگریز راج ختم کر کے دم لیں گے "غدر" کے نام سے اخبار جاری کیا جو کئی ہندوستانی زبانوں میں چھپتا اور امریکہ کے مقیم ہندوستانیوں میں تقسیم کیا جاتا تھا خود ہندوستان میں بھی پہنچایا جاتا تھا اسی طرح کرشن ورما جو کاٹھیاواڑ کے زبردست انقلابی تھے جنھوں نے ۱۸۹۷ء میں ملکہ کے جشنِ صد سالہ پر بم پارٹی کا ساتھ دیا اور ملکہ کے مجسمہ کا منھ کالا کیا تھا وہ کسی طرح لندن پہنچ گئے لندن میں ۱۹۰۵ء میں انڈیا ہوم سوسائٹی اپنی صدارت میں بنائی اور اخبار "انڈین سوشیلوجسٹ" جاری کیا جس کا مقصد ہوم رول حاصل کرنا تھا لندن میں کرشن ورما نے ۱۹۰۶ء میں انڈیا ہاؤس قائم کیا جو سامراج دشمن انقلابی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا جس کی وجہ سے ۱۹۰۷ء میں برطانوی دارالعوام (ہاؤس آف کامنس) میں ان کے بارے میں سوال اٹھایا گیا جس کی وجہ سے ان کو لندن چھوڑ کر پیرس کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانا چاہا ستمبر ۱۹۰۷ء میں یہ مضمون شائع ہوا کہ ہندوستان کے اندر ریجی ٹیشن نہ چلایا جانا اور روسی طریقہ کو اپنانا چاہیے اور یہ اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک انگریز اپنے مظالم وسفاکی سے ہاتھ کھینچ کر ہندوستان سے نکل جانے کے لیے مجبور نہ کر دیئے جائیں جس کی وجہ سے مقدمہ قائم ہوا پھر ۱۹۰۹ء میں اس کے ایڈیٹر کو ایک سال قید کی سزا دے دی گئی اور یہ اخبار لندن سے پیرس منتقل ہو گیا ۱۹۰۸ء میں جنگِ آزادی کے شہیدوں کی سال گرہ منائی گئی اور اشتہارات شائع کئے گئے۔ ۱۹۰۹ء میں انڈیا ہاؤس کے ایک نوجوان ممبر مدن لال ڈھینگڑا نے کرنل ولیم کرزن کو گولی کا نشانہ بنایا۔

مولانا اور غدر پارٹی کی تشکیل

جنگ عظیم کے برپا ہونے سے پہلے انقلابی محبانِ وطن کا ایک بڑا گروہ جس کے اندر مولانا برکت اللہ بھوپالی اور لالہ ہردیال کرشن جی ورما خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں یہ سب امریکہ میں جمع ہوئے اور کیلیفورنیا کے مزدوں کے مرکز سیکرامینٹو کے ایک عظیم جلسہ میں " انڈین ایسوسی ایشن آف پیسیفک کوسٹ" کی بنیاد رکھی اس پارٹی کے ترجمان ۱۹۰۵ء کی حیثیت سے "غدر" کے نام سے جاری کیا گیا پھر بعد میں یہ جماعت غدر پارٹی کے نام سے ہی مشہور ہوئی غدر پارٹی کا نصب العین برطانوی حکومت کا تختہ الٹنا اور اس کی جگہ پر ہندو مسلمانوں کی جمہوری حکومت قائم کرنا ٹھہرا جس کے لیے ضرورت پڑنے پر مسلح بغاوت کی جائے اس اخبار کا اجرا ۱۹۱۳ء میں ہوا پندرہ ہزار ڈالر جمع ہوئے مولانا برکت اللہ لالہ ہردیال نے پرمانند کے ساتھ امریکہ اور کناڈا کے دورے کئے اور ہندوستانی نو آبادکاروں کے ضلعوں میں پہلی بار آزادی کی مشعل روشن کی ایک سال ہی کے اندر یورپ میں مقیم ہندوستانیوں کے اندر پارٹی کا جال بچھادیا اس وقت شمالی امریکہ میں پندرہ ہزار اور خالی کناڈا میں چار ہزار ہندوستانی تھے جن میں زیادہ تر پنجابی اور سکھ لوگ تھے ان کے اندر غدر پارٹی کے مقاصد سے اتفاق کرنے والوں کی اکثریت تھی اور جو انگریزوں کے حمایتی بھی تھے وہ بھی لالہ جی اور مولانا کی تقریروں سے مخالف بن گئے یہ اخبار ہندوستانیوں کو جماعتیں بنانے پر زور دیتا تھا مولانا برکت اللہ کی حیات سیاسی کا سب سے زیادہ سرگرم پرجوش دور تھا۔ اس وقت مولانا کا کام اپنی آتش بیانیوں سے ہندوستانیوں کے جذبات کو فرنگی سامراج کے خلاف مشتعل کرنا اخبار کے ایڈیٹر رام چندر کے ساتھ شعلہ بار مقالات

سے ہاتھ بٹانا اور پھر خود اخبار کا ہاکر بن کر بازاروں اور سڑکوں پر فروخت کرنا ہوگیا تھا اس کام کا مرکز یگانتر آشرم نمبر ۵ وُڈ اسٹریٹ کا مختصر مکان تھا۔

دو سال تک مولانا نے پارٹی کے لیے پورے دلی جوش سچی لگن اور شبانہ روز جدوجہاد کے ساتھ انجام دیا جس کی بنا پر یہ تحریک اور اخبار امریکہ، کناڈا، میکسیکو کے علاوہ فلیپائن، آسٹریلیا، ملایا، جاوا اور برما تک اس کا دائرہ وسیع ہوگیا۔

غدر پارٹی کا پیغام عام ہندوستانیوں کے نام

۱۹۱۴ء میں اخبار غدر نے ہندوستانیوں پر یہ زور دینا شروع کر دیا کہ ہندوستان واپس جاؤ غدر مچا کر دہشت پھیلاؤ انگریزوں کو اس قدر خوف زدہ کر دو کہ وہ بھاگ اٹھیں ہندوستان کو برطانوی غلامی کی لعنت سے نجات دلاؤ پھر اسی اخبار نے آگے چل کر مشورہ دیا کہ غدر مچانے کا وقت آگیا ہے خود کو پوری طرح منظم کر کے تیار ہو جاؤ کیونکہ یورپ میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں اٹھو بہادرو جلدی کر دیہ تمام ٹیکس دینا بند کر دو ایسے بہادر سرفروش مجاہدین کی ضرورت ہے جو اس وقت غدر مچا سکیں۔ میدانِ جنگ ہندوستان۔ تنخواہ موت انعام شہادت۔

"غدر کی گونج" کے نام سے ان شعلہ انگیز نظموں کا مجموعہ شائع ہوا جس کی انیسویں نظم ایک قصیدہ پر مشتمل تھی اس قصیدہ کے اندر لالہ ہردیال، برکت اللہ بھوپالی، شیاما کرشن ورما، لیاقت حسین، اجیت سنگھ، ساورکر آربندھو گوش اور غدر پارٹی کے رہنماؤں کی تعریف و توصیف کی گئی تھی کہ انھوں نے علمِ بغاوت بلند کر دیا ہے سکھ ہندو مسلمان سب شامل ہو گئے ہیں اٹھارہ اگست ۱۴ء کو اخبار غدر میں اپیل کی گئی کہ غدر لٹریچر خوب خوب تقسیم کیا جائے ریلوے لائنیں اکھاڑ پھینکی جائیں، بینکوں سے روپیہ نکال لیا جائے، فرنگیوں کو ذبح کر ڈالو"

برطانوی حکومت کے خلاف ان آتش فشاں اپیلوں کے شائع ہونے پر حکومت امریکہ نے برطانیہ کے اشارہ پر لالہ جی کو ملک بدر کرنے کا حکم صادر کر دیا اور وہ سوئٹزرلینڈ چلے گئے اب مولانا برکت اللہ اور رام چندر جی نے اخبار اور پارٹی کو سنبھالا ۲۵ مارچ ۱۴ء کے اخبار میں لالہ جی کی سان فرانسسکو میں گرفتاری اور جلاوطنی کے واقعہ کو شائع کیا گیا اس میں کوئی شک نہیں کہ لالہ ہردیال، رام چندر، کرشن ورما زبردست مفکر اور انقلابی لوگ تھے اور پارٹی میں ان کے اثرات بھی نمایاں تھے لیکن مولانا کی شائستگی و سنجیدگی فراخ حوصلگی اور ہر چھوٹے بڑے کے تئیں فیاضی ورواداری نے پارٹی میں اونچا مقام عطا کیا اور اپنی وسیع النظری کی بنا پر مولانا نے اس حقیقت کے اعتراف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا کہ ان کی سیاسی سوجھ بوجھ میں غدر پارٹی کی ان شخصیتوں کا بڑا دخل ہے۔

امریکہ کی آزاد فضا میں غدر پارٹی کی آزادئ ہند کے لیے کوششیں روز بروز سخت تر ہوتی گئیں حکومت امریکہ نے ابتداءً تو کوئی پابندی نہیں لگائی لیکن جب انگریز دشمنی کی چنگاریاں انگارے بن کر اینگلو امریکن تعلقات کو جھلسنے لگیں تو اور ارکان پر بھی پابندیاں لگ گئیں جس کی بنا پر پارٹی کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا جس کو جدھر موقع ملا چلا گیا اس سانحہ پر مولانا کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے قائم کردہ توقعات پر پانی پھرتا ہوا دیکھ کر اپنی قسمت آزمائی کے لیے کوئی اور منصوبہ تیار کریں۔

مولانا کا قسطنطنیہ میں دوبارہ ورود ۱۹۱۴ء

مولانا برکت اللہ بھوپالی کی جس سیاسی زندگی کا آغاز لندن سے ہوا تھا اور امریکہ میں پہلی بار پہنچ کر افکارِ سیاسی کی نشوونما ہوئی اور جاپان پہنچ کر جس نے پختگی اور بالیدگی اختیار کر لی دوبارہ امریکہ کی زندگی میں غدر پارٹی کے رفقا کے ساتھ

عملی سرگرمیاں باقاعدہ شروع کر دی گئی تھیں اس وقت تک مولانا کا سیاسی پوزیشن ایک حد تک شخصی و مقامی تھا لیکن اب امریکہ کو خیر باد کہہ کر وہ بین الاقوامی سیاست کے میدان میں داخل ہو چکے تھے ان کا محبوب نصب العین آزادئ ہند بن چکا تھا لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے بین الاقوامی طاقتوں سے ان کے باہمی رقیبانہ تعلقات کی بنیادوں پر تعاون حاصل کرنا ان کے پروگرام کا ایک جزبن گیا اس لیے انھوں نے نئی دنیا کو چھوڑ کر پرانی دنیا کی پرانی عظیم سلطنت ترکی کو اپنی منزل بنایا ان کو خلافتِ ترکیہ کے ماحول میں شعاعِ امید نظر آئی مولانا جب قسطنطنیہ پہنچے ہیں تو ترکوں کے سروں سے مصائب کا طوفان گذر چکا تھا ۱۹۱۳ء بہت سی شورشوں کا پیش خیمہ بن کر آیا طرابلس میں مغربی حکومتوں کے اشاروں پر عربوں اور اطالویوں میں ٹھن گئی تھی جنگِ بلقان کے شعلوں نے ترکی کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا امرا کی غداریوں نے ایڈریانوپل کو دشمنوں کے ہاتھوں میں دے دیا تھا شاہِ یونان نے صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا اور مسجدِ صوفیہ پر عیسائی دنیا کے دلوں میں صلیب نصب کرنے کی تمنائیں پرورش پانے لگیں وزیر اعظم برطانیہ نے سالونیکا کی فتح یابی پر اظہارِ مسرت کیا اور کہا کہ یہی وہ دروازہ ہے جس سے مسیحیت یورپ میں داخل ہوئی تھی مولانا محمد علی نے کامریڈ اور ہمدرد" کے ذریعہ خلافتِ ترکیہ کی امداد کی تحریک اٹھائی اور ایک طبی وفد ڈاکٹر انصاری کے ہاتھوں روانہ کیا گیا یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا جنون و دیوانگی کی دروازے میں داخل ہو چکی تھی یورپی قوموں کی جوع الارضی اور ہوس ملک گیری کی وجہ سے مشرق و مغرب کے سروں پر سے ایک قیامت گذرنے والی تھی آئرستان کی سرحد پر آسٹریا کا شہزادہ جو ۱۹۱۴ء میں قتل کیا گیا جنگ عظیم کے لیے بچھائی ہوئی بارود کے لیے یہ واقعہ فتیلہ ثابت ہوا ۱۴/ اگست ۱۹۱۴ء کو یورپ کی تمام حکومتیں بے محابا میدانِ کارزار میں کود پڑیں حکومت جرمنی برٹش امپائر کے خلاف خم ٹھونک کر عرصۂ جنگ میں اتر آئی قیصر جرمنی نے اپنی حکمتِ عملی سے حکومت ترکیہ کو اپنا

حلیف بنالیا اس لیے مولانا کو وہاں شاہدِ مقصود سے کامیابی کے امکانات روشن معلوم ہوئے اس لیے انھوں نے دوبارہ ترکی کے ساحل پر اپنے سفینۂ مقاصد کو لنگرانداز کردیا کہ چونکہ ترکی اور جرمنی اتحاد پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا تھا مولانا نے ایک منصوبہ ترکی حکومت کے سامنے پیش کیا جس کا مشن حکومتِ ترکیہ و جرمنی و ایران کے ساتھ تجدید تعلقات تھا یہ تجویز منظور ہوئی اور دو مشن قسطنطنیہ سے جانا طے پائے

مولانا برکت اللہ جرمنی میں آئے ۱۹۱۴ء

جو مشن حکومتِ جرمنی کے لیے تجویز ہوا اس کا مولانا کی سرکردگی میں روانہ ہونا طے پایا جولائی ۱۹۱۴ء میں جب جنگِ عظیم کے شعلے بھڑکے تو ایک قابل انقلابی نوجوان چمپاکرامن پلّے نے سوئٹزرلینڈ سے جرمنی پہنچ کر برلین انڈین نیشنل پارٹی قائم کی جہاں یورپ امریکہ کے تمام ہندوستانی محبانِ وطن انقلابی رہنما اور طالب علم اس کو آزادئ ہند کا مرکز سمجھ کر ہر طرف سے سمٹ سمٹ کر جمع ہوگئے۔ لالہ ہردیال بھی سوئٹزرلینڈ سے برلن پہنچ گئے وریندر چٹوپادھیائے (سروجنی نائیڈو کے بھائی) جو کرشن ورما کے بعد انڈین سوشیالوجسٹ کو ایڈٹ کرتے اور انڈین ٹائمس اور ڈیلی میل میں ہندوستان کی تحریک آزادی پر مضامین لکھا کرتے تھے وہ بھی لندن چھوڑ کر برلن آگئے راجہ مہیندر پرتاپ جنیوا پہنچ کر شیاماجی سے ملے انھوں نے راجہ صاحب کو جرنل کونسل سے ملادیا جس کی وجہ سے راجہ صاحب کو برلن پہنچنا آسان ہوگیا یہ عجیب وغریب واقعہ حسنِ اتفاق کی شکل میں ظاہر ہوا کہ جنگ عظیم کے شروع ہونے پر جس قدر بھی ہندوستان کے آزادی خواہ افراد یورپ میں تھے وہ کسی نہ کسی طرح برلن پہنچ گئے جس کے اندر مولانا برکت اللہ (بھوپالی)، راجہ مہیندر پرتاپ (یوپی)، چمپاکرامن پلّے (مدراس)، وریندر ناتھ چٹوپادھیائے (حیدرآباد)، ڈاکٹر مورسور بربھاکر (مہاراشٹر)، ڈاکٹر حفیظ (پنجاب)

ترمول آچاریہ، (مدراس)، ڈاکٹر اے منصور (یوپی)، عبدالوحید (یوپی)، کھری ناس پارسی (بمبئی)، ڈاکٹر تارک ناتھ داس، چندرا کے چکرورتی، ہریندر ناتھ گپتا۔

یہی ہریندر ناتھ گپتا جی مولانا کے پرائیویٹ سکریٹری تھے جنھوں نے سب سے پہلے راجہ صاحب کو مولانا سے ملایا اور ان کا تعارف کرایا راجہ صاحب کی اس ملاقات نے ایسا مضبوط رشتۂ اتحاد و محبت قائم کیا کہ پھر وہ عمر بھر نہ ٹوٹ سکا۔

آزادیٔ ہند کے لیے جرمنی کا منصوبہ [۱۷]!

اس تاریخی حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ دولِ یورپ میں برطانیہ اور فرانس کے گٹھ جوڑ نے حکومتِ جرمنی کی اس طرح سیاسی و اقتصادی ناکہ بندی کر رکھی تھی کہ اس کو ایشیا میں پھیلنے اور پھولنے پھلنے کا موقع نہیں مل سکا ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے جرمنی کے عزائم ملک گیری کے لیے سنہرا موقع عطا کیا جرمنی مصنف برن ہارڈی نے اپنی کتاب "جرمنی اور آئندہ جنگ" مطبوعہ ۱۹۱۱ء برٹش امپائر کے خلاف اشارہ کیا کہ بنگال کی ہندو آبادی میں انقلابی فوجی جذبات زبردست پائے جاتے ہیں جو مسلمانوں سے رابطۂ اتحاد قائم کر کے حکومتِ برطانیہ کے لیے بے پناہ طوفان بن کر اس کے عالمگیر اقتدار کی بنیادیں نہ صرف ہندوستان بلکہ مشرقِ وسطیٰ تک ہلا سکتی ہے غالباً اس مضمون میں تقسیم بنگال اور اس سے پیدا شدہ برطانوی مخالف تحریک کی طرف اشارہ ہے جنگ عظیم سے پیشتر مارچ ۱۴ء میں ایک اخبار نے انگلستان کے لیے ہندوستان کی مصیبت کے عنوان سے ایک مضمون لکھا کہ ہندوستان میں چاروں طرف خفیہ انقلابی جماعتوں کا جال بچھا ہوا ہے اور بیرونی ممالک میں ان کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے خاص طور پر کیلوفورنیا میں تو ایک ایسی جماعت قائم ہو گئی ہے جو اس مقصد کے لیے ہندوستان کو ہتھیار و آتش گیر سامان فراہم کرے گی اس جماعت سے مراد غدر پارٹی ہی ہو سکتی ہے جس کا آتشیں لٹریچر مولانا برکت اللہ وغیرہ کی سرکردگی میں ملکوں ملکوں پھیلایا جا رہا تھا بہر حال حکومتِ جرمنی نے ہندوستان میں انقلاب کے امکانات

کا جائزہ لے کر اس کے لیے عملی کارروائی بھی شروع کر دی اور جہاز میورک اور ہنری ایس کے ذریعہ رائفل، کارتوس، مارٹن پستول وغیرہ کا بہت بڑا میگزین ساحلِ بنگال اور کراچی پر اتارنے کی کوشش کی لیکن برطانیہ کی بحری طاقت نے اس پلان کو ناکام بنا دیا اور ہندوستانی انقلابی محبانِ وطن کی بغاوت کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے جرمن حکومت کا دوسرا منصوبہ وہ تھا جو ہندوستانی جنگی قیدیوں کے متعلق تھا یہ ہندوستانی جرمنی و ترکی اور عراق کے محاذ پر گرفتار ہوئے تھے ان کے دلوں میں برطانوی حکومت کی طرف سے نفرت پیدا کر کے ایک رضا کار فوج بنانا اور برطانوی فوج کے خلاف عرب اور ایرانی قوم پرستوں کے ساتھ شریک ہو کر جنگ کرنا اور افغانستان کے شریک جنگ ہونے پر ہندوستان پر حملہ کر کے مادرِ وطن کو آزاد کرانا تھا یہ منصوبہ چونکہ خود مولانا کے زرخیز دماغ کی پیداوار تھا اس لیے یہ اہم و دشوار پسند مہم انہی کے سپرد کی گئی چونکہ مولانا کی طلسمی شخصیت کا جادو بیانی و افراد و اشخاص پر اثر اندازی سب کے نزدیک مسلّم تھی غدر پارٹی اور تمام محبانِ وطن ہندوستانیوں کے دلوں میں ان کی عظمت بیٹھی ہوئی تھی لہٰذا مولانا نے ان ہندوستانی جنگی قیدیوں میں اپنا کام شروع کر دیا قیدیوں کو بتایا کہ ایک چھوٹے سے جزیرہ (برطانیہ) کے لوگوں نے کس طرح آپس میں لڑا بھڑا کر ہندوستان جیسے عظیم ملک کو غلام بنا لیا اور غاصبانہ طرزِ عمل سے ملک کو کنگال بنا کر اپنے تاج و اقتدار کی حفاظت ہی ہمارے ہی ہاتھوں (ہندوستانی فوجیوں سے) کر رہے ہیں اور ہم چند سکوں کی خاطر دوسروں کو غلام بنانے کی کارروائیاں کر رہے ہیں اب قدرت نے موقع دیا ہے کہ اس اجنبی راج کے خلاف جاں بکف میدان میں کود پڑیں کیوں نہ ان کے دئیے ہوئے ہتھیاروں کو ان کے خلاف استعمال کر کے مادرِ وطن کو آزاد کرائیں مولانا کی اس تقریر نے جادوئی اثر کیا کہ وہ فوجی جو میدانِ جنگ کے بہادر سپاہی تھے بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور سب نے انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے اور جب تک جان میں جان ہے اس عہد و پیمان کے نہ توڑنے کا وعدہ کیا

اور حلف اٹھایا چنانچہ مختلف میدانی وریگستانی محاذِ جنگ ہونے کی بنا پر ان کی ٹریننگ جرمنی ماہرینِ فن کے ہاتھوں شروع کردی گئی اور اس کے ساتھ انقلابی محبانِ وطن کی ڈیوٹی لگادی گئی تاکہ وہ انگریز دشمن جماعتوں سے ربط وضبط پیدا کرکے انگریزوں کے لیے اندرونی وبیرونی مشکلات کھڑی کردیں انگریزی فوجوں پر کاری ضرب لگاکر ان کی پیش قدمی کو روک دیا جائے اس برلن کمیٹی نے نائب وزیر خارجہ مسٹر زمرین سے برطانوی دشمن لٹریچر شائع کرنے کی اجازت بھی حاصل کرلی تاکہ برطانیہ پر بھرپور حملہ کیا جائے پھر جرمن وزیر خارجہ بیرن فارن نے برلن کمیٹی کے ارکان کو مشرقی محاذِ جنگ پر اپنی آنکھوں سے جرمن کی عسکری قوت کے دیکھنے کی دعوت بھی دی چنانچہ مولانا برکت اللہ بھوپالی، لالہ ہردیال، وریندرناتھ چٹوپادھیائے اور راجہ مہیندر پرتاپ وغیرہ جرمن قونصل کراچی مسٹر نیوین ہوفر کے ہمراہ محاذ جنگ پر پہنچے اور برطانوی فوجوں کے خون کے فوارے اڑتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھے اس وقت مجاہد ریف غازی عبدالکریم نائب صدر پارلیمنٹ ترکی آئے ہوئے تھے ان سے مولانا کی ملاقات اور تمام مسائل پر تبادلۂ خیالات عربی زبان میں ہوا اور طے پایا کہ برلن کمیٹی کا ایک وفد حکومت ترکی پہنچ کر خلیفۃ المسلمین سے مسلمانانِ عالم کے لیے عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے خصوصاً انگریزوں کے خلاف سلطانی فرمان اور شیخ الاسلام ترکیہ کا فتویٰ جہاد حاصل کرکے آزادئ ہند کے لیے امیر افغانستان کو اس پر رضامند کرلے کہ وہ جرمن ترک فوج کے ساتھ ہندوستانی قیدیوں کی رضاکارانہ فوج کو اپنے علاقہ سے گزرنے کی اور ہندوستانی شمالی مغربی علاقوں پر نیا محاذ کھولنے کی اجازت دے دے مولانا کا یہ مشن فیلڈ مارشل میک کیزن سے ملاقات کرکے پولینڈ سے جرمنی واپس ہوا چونکہ مولانا برکت اللہ خود ترکیہ سے اسی مشن پر آئے تھے اس لیے ان کی قیادت میں اس وفد کا قسطنطنیہ جانا طے ہوا لیکن بعد میں یہ مسئلہ ارکانِ کمیٹی کے سامنے آیا کہ راجہ مہندر پرتاپ سے اس موقع پر والیانِ ریاست کو انگریزوں کے

کے خلاف بغاوت کرنے کا پیغام کیوں نہ پہنچایا جائے کہ وہ ہندوستانی انقلابیوں کے ساتھ مل کر اپنے وطن کو آزاد کرنے کی طرف پیش قدمی کریں لہٰذا جرمن چانسلر کی طرف سے چھتیس[۳۶] والیانِ ریاست کے نام خریطہ لکھے گئے جن کے اندر مہاراجہ نیپال بھی شامل تھے جن کو ہز میجسٹی کے لقب سے مخاطب کیا گیا اس لیے اس خصوصی معاملہ کی وجہ سے راجہ جی کی شمولیت بھی اس وفد میں ضروری سمجھی گئی اور خود مولانا نے قومی نظریہ کے ماتحت راجہ صاحب کو اس وفد کا قائد بنانا تجویز کیا حالانکہ اس وقت سب سے زیادہ بزرگ عمر رسیدہ اور جہاں دیدہ شخصیت انہی کی تھی۔

مولانا کی قیصر جرمنی سے ملاقات!

جب یہ منصوبہ برلن کمیٹی اور حکومت جرمنی کے درمیان طے پایا کہ ایک مشترک وفد جو ہندوستان کے انقلابی وطن پروروں اور حکومت جرمن کے مشیروں پر مشتمل ہو پہلے ترکیہ جائے اور پھر افغانستان پہنچے تو اس وفد کو روانگی سے پہلے قیصر جرمنی ولیم ثانی نے شرفِ باریابی بخشا جب مولانا صاحب اور راجہ صاحب وغیرہ پہنچے تو قیصر جرمنی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چند قدم آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا زمرین وزیر خارجہ پیچھے تھے رسمی مزاج پرسی کے بعد قیصر نے کہا کہ چند سالوں کے اندر ہندوستان سے برطانوی اقتدار کا خاتمہ ہو جانا چاہئے اور ہندوستانیوں کو اس سے بہتر سنہری موقع کبھی ہاتھ نہ آئے گا کہ غلامی کے لائے ہوئے بوجھ کو اٹھا کر پھینک دیں ان ظالموں اور خونخواروں کے ہاتھ کاٹ ڈالیں جو دو سو برس سے آپ کی قوم کے خون سے ہاتھ رنگتے چلے آرہے ہیں۔

مولانا نے جرمن زبان میں جواب دیا کہ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا قیصر ولیم نے کہا آپ لوگ ہمارا پیغامِ محبت سلطان المعظم اور امیر افغانستان کو پہنچانا نہ بھولیں گے نہایت خوشگوار ماحول میں یہ ملاقات کھڑے کھڑے رہی اور قیصر نے ان کو الوداع کیا۔

انڈو جرمن مشن!

راجہ مہیندر پرتاپ ۱۹۱۵ء میں برلن پہنچے تھے ان کی آمد سے پہلے ہندوستانی انقلابیوں نے آزادیٔ ہند کے لیے پندرہ نکاتی پروگرام تیار کرلیا تھا جس کے اندر ہندوستان پر حملہ کا پروگرام خصوصی اہمیت کا حامل تھا وفد کی روانگی سے پہلے طے پایا کہ مولانا برکت اللہ پہلے جاکر اس مشن کے لیے زمین ہموار کریں اس مشن میں ان ہر دو اصحاب کے سوا افغانی آفریدی پلٹن بھی شامل تھی جو جنگی قیدی بن کر جرمنی آئے تھے اور مولانا کی فہمائش سے برطانوی حکومت سے برگشتہ ہوکر اب محافظ دستہ بن گئے تھے انڈو جرمن مشن میں ہندوستانی انقلابیوں کے علاوہ حکومت جرمنی کے ڈپلومیٹ ڈاکٹر فان ہینگ اور ان کے سکریٹری رور، ڈاکٹر بارکر اور دیگر فوجی افسر بھی تھے اس مشن کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا ایک وفد مولانا کی قیادت میں دوسرا راجہ صاحب جو چند جرمنی افسران پر مشتمل تھا مولانا ۱۵ر اپریل ۱۹۱۵ء برلن سے جب روانہ ہوئے تو الوداع کہنے کے لیے برلن کمیٹی کے ارکان کے علاوہ جرمن حکام بھی تھے جب مولانا ویانا پہنچے تو وہاں سابق خدیو مصر عباس حلمی پاشا بھی اسی ہوٹل میں تھے جہاں یہ وفد ٹھہرا تھا جن کو جرمن دوستی کی بنا پر برطانیہ نے معزول کرکے حسین کو خدیو مصر بنادیا اور ۱۹۱۴ء میں مصر پر برطانوی عملداری کا اعلان کردیا گیا مولانا کی حلمی پاشا سے اس دو تین روز کے قیام میں مسلسل ملاقاتیں رہیں وہ انگریز دشمنی میں آگ بگولا ہو رہا تھا مولانا نے ان کو یقین دلایا کہ ہندوستان اور مشرق وسطیٰ میں برطانوی اقتدار کے خاتمہ کا ایسا پروگرام بنالیا گیا ہے کہ جس کی کامیابی پر مصر بھی کامیاب ہوجائے گا اس کے بعد ہنگری، بدھاپسٹ، بخارسٹ اور بلغاریہ کی راجدھانی صوفیہ ہوتے ہوئے ہزارہا صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے بحیرہ

عافیت قسطنطنیہ پہنچ گئے اور جرمن دشمن علاقوں سے گذرنے میں ان آفریدیوں کی وجہ سے کوئی دقت نہیں پیش آئی چونکہ وہ سب انگریزی ڈریس پہنے ہوئے تھے جب یہ وفد قسطنطنیہ پہنچا تو اس کا قیام پیرا پیلس ہوٹل میں ہوا وزیر جنگ غازی انور پاشا وزیر اعظم حلمی پاشا ولی عہد سلطان وحید الدین سے ملاقاتیں ہوتیں اور پھر خود سلطان معظم سلطان محمد خامس نے شرف باریابی بخشا مولانا نے اپنا منصوبہ پیش کیا سلطان نے خندہ پیشانی سے ہر ایک کا استقبال کیا اور ترکی زبان میں گفتگو کرتے رہے جس کا جواب دیا جاتا رہا پندرہ منٹ ملاقات کے بعد سلطان نے اس دعا کے ساتھ وفد کو رخصت کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو اس نیک مقصد میں کامیابی عطا فرمائے اور چند قدم چل کر فی امان اللہ کہہ کر الوداع کہا اس شرف باریابی کے بعد مولانا اور راجہ صاحب نے وزیر جنگ انور پاشا سے مل کر اس کی درخواست کی کہ سلطان المعظم کا ایک خط امیر افغانستان کے نام تحریر کیا جائے تاکہ امیر حبیب اللہ افغانستان کو غیر جانب داری سے ہٹا کر جرمنی و ترکی کے ساتھ شریک جنگ کردے اور وزیر اعظم حلمی پاشا سے بھی چند خطوط ان والیانِ ریاست کے نام لکھوانے کی استدعا کی جن کے علاقے شمالی مغربی سرحد کے قریب واقع ہیں تاکہ یہ سب تحریک آزادی میں شریک ہو کر انگریزوں کے خلاف عوام کو طاقت پہنچائیں اس کے بعد طلعت پاشا اور ولی عہد سلطنت وحید الدین سے ملاقات کی اس وقت امیر فیصل بھی وہاں موجود تھے شیخ الاسلام سے بھی ملاقات کی گئی دوسرا گروہ بریندر ناتھ داس (جو مولانا کے پرائیویٹ سکریٹری تھے) کی قیادت میں روانہ کیا گیا جو انقلابی محبانِ وطن پر مشتمل تھا وہ حلب، دمشق، یروشلم، صحرائے سینا کے علاقہ سے لے کر نہر سوئز تک پھیل گئے تاکہ یہ ہندوستانی مصری و عرب انقلابیوں کیساتھ شریک ہو کر برطانوی فوج کا مقابلہ کرسکیں اور مصر اور نہر سوئز کو برطانوی تسلط سے آزاد کرلیں جس پر برطانیہ نے محض ہندوستان کے لیے قبضہ جما رکھا ہے ۔

بہر حال مولانا کے وفد کی جب تشکیل ہو چکی تو انڈو جرمن مشن نے انور پاشا سے

ایک ترکی افسر کو بھی شریک مشن کرنے کی درخواست کی تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ اس وفد کی پشت پر خلافت اسلامیہ ترکیہ ہے اور فوجی حکام کے نام احکام جاری کر دئے جائیں کہ وہ اس مشن کو ہر طرح کی سہولتیں فراہم کریں چنانچہ ترک کپتان کاظم بے کی معیت میں یہ وفد روانہ ہو کر قونیہ پہنچا مولانا روم کے مزار پر فاتحہ خوانی کی اس وقت مولانا روم کے اس شعر نے ارکانِ وفد کو بے حد متاثر کیا جو مولانا برکت اللہ نے سنایا اور لوگ جھوم اٹھے ۔

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو   در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

یعنی ہمارا مزار ہمارے مرنے کے بعد زمین میں تلاش مت کرو چونکہ ہر عارف درد آشنا دلوں میں ہمارا مزار ہے۔

اب حلب کے راستہ سے بغداد پہنچنا اس قافلہ کی منزلِ مقصود تھا جب وفد کوہِ طارطوس سے گذر رہا تھا تو امیر فیصل دوبارہ ملے یہ ملاقات محض حسنِ اتفاق کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ شریف حسین والئ حجاز نے ترکوں کے خلاف برطانیہ سے جو خفیہ معاہدہ کر رکھا تھا اس کی بنا پر قسطنطنیہ کی ترکی قوت اور جنگی کارروائیوں اور ترک و جرمن نقل و حرکت کی خوشبو سونگھنے کے لیے اس ذاتِ شریف (امیر فیصل) والی حجاز نے بھیج رکھا تھا۔

حلب سے بغداد کا سفر دریائی تھا بادبانی کشتیاں دن ہی دن دریائے فرات میں چلتیں اور رات میں آرام کے لیے ٹھہر جاتیں فرات کے کناروں پر عرب بدؤں سے رسد کا سامان (دودھ مکھن) ہاتھ لگتا چودہ دن بعد بغداد پہنچنا ہوا بغداد کی سیر کر کے اب گھوڑ گاڑیوں میں سوار ہو کر اصفہان کی طرف کوچ کیا گیا جب ایرانی علاقوں میں وفد پہنچا تو راستہ کے تنگ اور پر پیچ ہونے کی بنا پر گھوڑوں پر سوار ہو کر آگے کا سفر جاری رکھا گیا جب ایران کی پلیٹو پر پہنچے تو ترکی کمانڈر رؤف بے چند ہزار فوج کے ساتھ اس لیے خیمہ زن ہو گئے تھے کہ ان کو ایرانی حکومت نے افغانستان جانے کی اجازت نہیں دی تھی یہیں مولانا برکت اللہ

اور راجہ صاحب کی ملاقات مشہور انقلابی مولوی عبد الرب اور عبد الرحمان پشاوری سے ہوئی جو پہلے سے ترکی فوج کے ہمراہ ہندوستان کی سرحد پر مورچہ لگانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے رؤف نے وفد کی جو آؤ بھگت کی اور یہاں سے وفد چل کر کرمان شاہ پہنچ کر جرمن قونصل خانہ میں ٹھہرا راجہ صاحب بیمار ہو گئے اس لیے ایک ہفتہ کے بعد اب پھر گھوڑا گاڑیوں کے ذریعہ سفر کا آغاز ہوا پہلے چٹیل وادیوں اور پہاڑیوں سے گذر کر حسین سبزہ زاروں، آبشاروں اور قدرتی چشموں سے ہوتا ہوا اصفہان پہنچا لطیفہ یہ پیش آیا کہ مولانا کی گاڑی کا پہیہ ٹوٹ گیا اس لیے مولانا اور راجہ صاحب ان ہی گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر اصفہان شہر داخلہ ہوا اصفہان کے بعد ایک صحرا سے گذرتا ہوا جہاں ایک طرف سورج کی تمازت دھوپ کی تیزی پریشان کر رہی تھی دوسری طرف دشمن کی جاسوسی کا جال بچھا ہوا ہر طرف خطرہ کا اعلان کر رہا تھا کیونکہ مرو کی جانب سے روسی اور کوئٹہ کی طرف سے انگریزی افواج بڑھ رہی تھیں اور باہمی تجویز طے ہوئی تھی کہ ایک جگہ دونوں فوجیں مل جائیں ایران و افغانستان دونوں غیر جانبدار تھے وفد کا جرمن رئیس تنیگ اور مولانا ہندوستانی وفد کے رئیس تھے فان ہن تیگ نے ان خطرات کے پیش نظر وفد کو واپس لوٹ جانے کو کہا لیکن مولانا نے اسکی مخالفت کی اور اس کو آگاہ کیا کہ ایک لشکری سڑک کوئٹہ اور مرو کو جوڑنے کے لیے بن رہی ہے اس کے درمیان کا ٹکڑا ایسا ہے کہ اس کی ناکہ بندی پہرہ بھی سخت نہیں ہے بظاہر یہ کہا گیا کہ وفد واپس ہو رہا ہے اور اندرونی طور پر راتوں رات سفر شروع کر دیا گیا جاسوسی کے شبہ سے کسی رہبر کو بھی ساتھ نہیں لیا بقول صدیقی صاحب مولانا نے نقشے دیکھے اور ان کی ہیئت دانی اس وقت کام آئی مولانا گھوڑے پر آگے آگے تاروں سے سمت کا اندازہ لگاتے ہوئے اندھیری رات میں اپنے ساتھیوں سمیت افغانی حدود میں داخل ہو کر ہرات پہنچے جہاں ان کا گورنر ہرات نے شاہانہ استقبال کیا وہ خود آیا ارکان وفد کی مزاج پرسی کی وہ

ایک عمر رسیدہ مگر زندہ دل و بذلہ سنج ظریف و شریف انسان تھے اپنے لطائف و ظرائف سے راستہ کی تمام کلفتوں کو دور کر دیا ارکانِ وفد کے لیے عمدہ خوراک و پوشاک کا انتظام کیا گیا پھر ہرات سے یہ وفد ضلع ہزارہ کی سرد پہاڑیوں کے دشوار گذار راستوں سے گذرتا ہوا ایک ماہ بعد ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۵ء دارالحکومت کابل پہنچا وہاں کی ساری مخلوق استقبال کے لیے امنڈ آئی۔

بہرحال بقول راجہ صاحب یہ ترکی جرمنی ہندوستانی وفد کابل پہنچا ریل کا سفر، گھوڑوں کا سفر، ناؤ کا سفر، گھوڑا گاڑی اور پھر کئی سو میل گھوڑوں کی سواری ان تمام مشکلات کو میرے بڑے رفیق سفید ریش مولانا برکت اللہ بھوپالی نے خوشی خوشی تکلیفوں کو برداشت کیا۔

افغانستان کی سیاسی تاریخ!

ملک افغانستان جو پہلے خراسان کہلاتا تھا حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں اسلامی ملک بنا افغان قوم نسلی اعتبار سے کس نسل سے ہے ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے زیادہ تر مورخوں نے ان کو بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں سے رشتہ جوڑا ہے بخت نصر کے حملہ میں ان کے شور و فغاں کی بنا پر افغان کا لقب پایا۔ بخت نصر کی نسبت کی وجہ سے ان کو پچتو یا پختو یا پشتو (پٹھان) کہا جانے لگا چنانچہ پشت فلسطین میں ایک گاؤں بھی ہے خود افغانوں کا دعویٰ بھی یہی ہے اور شاخ شجر بھی ہے اور بعض ماہرین اقوام نے ان کو ایرانی الاصل اور ان کی زبان کو ژند اوستا سے جوڑا ہے جو قدیم فارسی سے اور علم الالسنہ سے اس کی تائید ہوتی ہے علامہ افغانی نے اسی کو ترجیح دی ہے۔۔ بہرحال افغانی قوم کو مستقل قوم کی حیثیت دینے کا احمد شاہ درانی کے سر سہرا ہے جو صاحب نسبت اور ہمدرد خلق پادشاہ تھا اس کے مورث اعلیٰ عبد علی تھے اس لیے عبدالی اور اپنے مربی بادشاہ کے حق کو ادا کرنے کی بنا پر درانی بھی کہلایا جس نے آخری پانی پت کی جنگ میں مغلیہ حکومت کے بجھتے ہوئے چراغ کو بچالیا اس کی حکمتِ عملی و حسنِ تدبیر سے ایک عظیم سلطنت (پنجاب و کشمیر و سندھ و مکران) کی داغ بیل پڑی اس کے انتقال ۱۸۰۵ء سے خانہ جنگی کا دروازہ کھل گیا اور اس کے لڑکے تیمور شاہ نے پھر شیرازہ بندی کی لیکن ۱۲۰۷ء اس کے انتقال پر وہ شیرازہ پھر بکھر گیا شاہ زماں، شاہ شجاع نے پھر اس کے حصول کی کوشش کی لیکن اب ڈپلومیسی ایرانی و افغانی میں پھوٹ پیدا کی شاہ شجاع اور دوست محمد خاں کو ایسی روپہلی سنہری زنجیروں

میں باندھنا چاہا کہ وہ برطانوی حکومت کا صوبہ بن گیا لیکن افغانی غیرت نے اس داغ محکومی کو گوارا نہ کیا اور خون کے چھینٹوں سے اس کو دھوتے رہے پھر امیر شیر علی کے زمانہ میں ۱۸۸۹ء میں انگریز بہادر نے ان کی باہمی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھا کر اس پر قبضہ کر لیا اور غازی کرنل محمد جان کے ہاتھوں پھر شکست کھائی آخر میں امیر عبدالرحمان کو بادشاہ تسلیم کر لیا گیا جنھوں نے برطانوی و روسی تعلقات کو برابر رکھ کر ملک کو نئی بنیادوں پر اٹھایا ان کے انتقال ۱۳۱۹ھ میں امیر حبیب اللہ جو ولی عہد تھے بادشاہ بن گئے لیکن ابتدا ہی سے ان کا جھکاؤ انگریزوں ہی کی طرف رہا جس کی بنا پر ایک پارٹی ان کی مخالف ہو گئی خلافت ترکیہ نے بہت کچھ اتحاد کی کوشش کی لیکن امیر اپنی پالیسی پر جمے رہے اور ۱۹۱۹ء میں میں گولی کے شکار ہوئے۔ امان اللہ خاں نے برسر اقتدار آکر افغانستان کو داخلی و خارجی ہر طرح ایک آزاد ملک کی حیثیت سے قائم کیا غرض یہ حالات تھے جن کے اندر ترکی جرمن ہندوستان مشن ۳ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں کابل پہنچ کر باغ بابر میں اتارا گیا جو شاہی مہمان خانہ قدرتی مناظر سے شاداب و عالیشان عمارات پر مشتمل تھا تمام انتظامات اعلیٰ پیمانہ پر سرکاری تھی لیکن نقل و حرکت پر پابندی تھی جب دو ماہ نظر بندی پر گذر گئے تو مولانا برکت اللہ نے ترک شاہی ڈاکٹر منیر بے کے ذریعہ اپنا پیغام صاحبزادہ نصر اللہ خاں کو جو وزیر اعظم بھی تھے پہنچایا جن سے مولانا کی لندن میں ملاقات ہو چکی تھی چنانچہ امیر صاحب پر انھوں نے زور دے کر کہا کہ یہ بات حکومت کے شایان شان نہیں امیر صاحب نے وفد کو اپنے گرمائی محل قصر دلکشا میں مدعو کیا جب یہ وفد پہنچا تو سردار نصر اللہ خاں نے مولانا برکت اللہ بھوپالی کو دیکھتے ہی آگے بڑھ کر معانقہ کیا اور اسی جوش و مسرت میں ہر ایک کا استقبال کیا صبح سے دوپہر تک گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہا امیر حبیب اللہ کو فارسی و عربی اشعار کا بڑا ذخیرہ نوک بر زبان تھا اس لیے ہر جملہ میں ایک دو شعر فارسی کے بڑھ دیتے اس کے جواب میں مولانا

برکت اللہ بھی برجستہ جوابی اشعار پیش کر دیتے اس طرح یہ سیاسی مجلس ایک ادبی محفل بن گئی۔ جب مولانا نے امیر کے دل میں جگہ پیدا کرلی تو حرفِ مطلب زبان پر لائے کہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں ترکی و جرمنی افغانستان کی کیا مدد کرسکیں گے مولانا نے ڈاکٹر فان ہنگ کی جرمنی کی طرف سے ترجمانی کی کپتان فان نیڈر مائر اور کاظم بے فارسی جانتے تھے اس لیے وہ بھی برابر حصہ لیتے رہے امیر حبیب اللہ نے آخر میں کہا کہ آپ نے اپنا جامہ ہمیں دکھا دیا ہے اب ہمارا کام ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ وہ ہمارے جسم پر چست ہوتا ہے یا نہیں۔

یہ پہلی ملاقات امید افزا رہی اور امیر انقلابی مشن کے گرویدہ ہو گئے پھر دوبارہ ارکانِ وفد کو علیحدہ علیحدہ گفت و شنید کے لیے بلایا چنانچہ جرمن ارکان نے اس امر کا یقین دلایا کہ افغانستان میں جو متوازی حکومتِ ہند قائم ہو گی قیصر جرمنی کی حکومت اس کو تسلیم ہی نہیں کرے گی بلکہ ہر طرح کے ہتھیار اور مالی امداد بھی دے گی اگر افغانستان پر برطانوی حکومت نے حملہ کیا تو ترکی و جرمنی دونوں حکومتیں افغانستان کی مدد کریں گی تیسرے دن ترک نمائندہ کیپٹن کاظم بے نے امیر صاحب سے تنہا ملاقات کی جب امیر حبیب اللہ نے ہر طرح اپنی بات کھری پکی کرلی تو نصر اللہ خاں اور قاضی القضاۃ عبدالرزاق خاں وفد کا مشیرِ اعلیٰ مقرر کیا۔

مولانا عبید اللہ سندھی سے اشتراک

اس اثنا میں جبکہ یہ ترکی جرمنی ہندوستانی وفد کابل میں امیر صاحب سے گفتگو کر رہا تھا حضرت شیخ الہند کے معتمد و رازدارِ خاص مولانا عبید اللہ سندھی اس اسکیم کے ماتحت جس کو بعد میں ریشمی سازش کا پرفریب۔ نام دیا گیا کابل سنہ ۱۹۱۵ء میں پہنچ گئے جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جنگِ عظیم سنہ ۱۴ء کے شروع ہوتے ہی حضرت شیخ الہند نے سرحد کے مرکز یاغستان میں اپنے مخلصوں مولانا سیف الرحمٰن حاجی ترنگ زئی وغیرہ کو پیغام پہنچایا کہ اب سکون سے کام کا وقت نہیں رہا اب سربکف میدان میں کود پڑنا ضروری ہے ان سب کی خواہش ہوئی کہ حضرت شیخ تشریف لاکر اپنے ہاتھ میں جہاد کی کمان لے لیں لیکن حضرت نے مالی امداد اور دیگر مصالح کے پیشِ نظر سرحد یاغستان جانا مناسب نہیں سمجھا جب انگریزوں نے مجاہدین کے اجتماع کو دیکھا تو انھوں نے سخت حملہ کر دیا مجاہدین نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور پلٹنوں کی پلٹنیں صاف کر دیں انگریزوں نے اس عظیم خطرہ کو دیکھ کر پوری فوجی قوت جھونک دی اب ایک منظم حکومت سے بے یار و مددگار اور نادار مجاہدین کب تک مقابلہ کر سکتے تھے اس لیے ان کی درخواست شیخ کے یہاں پہنچی جب تک کسی منظم حکومت کی پشت پناہی نہ ہو ہماری جاں بازی بے نتیجہ رہے گی۔ شیخ الہند نے اس مقصد کے لیے مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل بھیجا اور خود ترکی حکومت سے ربط ضبط پیدا کرنے اور اس سے فوجی امداد حاصل کرنے

کے لیے سفرِ حجاز اختیار کیا۔

(نقش حیات ص ۱۴۵)

مولانا سندھی شیخ کا جو مشن لے کر کابل پہنچے تھے وہ آزادئ ہند کی ایسی ہی اسکیم تھی جیسے سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج کے ذریعہ برطانوی سامراج کا تختہ الٹنے کا منصوبہ تھا۔

۱۹۱۴ء کا زمانہ وہ تھا جب کہ برطانوی گورنمنٹ ہر سیاسی و نیم سیاسی اشخاص اور جماعتوں کو کڑی نظر سے دیکھ رہی تھی مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد گرفتار کیے جا چکے تھے یکایک مولانا سندھی کو شیخ الہند کا حکم پہنچتا ہے کہ میں حجاز جاتا ہوں تم کابل پہنچو مولانا سندھی کے جاں باز رفیق سفر شیخ عبدالرحیم سندھی (آچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی تھے) دونوں سانڈنیوں پر سوار ہو کر بلوچستان کے راستہ سے ریگستان اور پہاڑی دروں کو طے کرتے ہوئے ۲۲ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کو شہر کابل پہنچے مولانا نے نہایت محتاط اور رازدارانہ انداز میں کام شروع کیا سردار سپہ سالار افواج چونکہ بزرگانِ دیوبند کا معتقد تھا اس لیے مخلصانہ طریقہ سے پیش آیا اور قاضی عبدالرزاق دارالعلوم دیوبند کے فاضل محکمۂ عدلیہ کے افسرِ اعلیٰ تھے جو سردار نصر اللہ خاں سے وابستہ تھے اس لیے مولانا کا سردار موصوف سے خصوصی تعلق ہو گیا مولانا کی جو گفتگو ہوئی وہ قابل اطمینان ثابت ہوئی۔ سردار صاحب نے اپنے مقصد کو فارسی زبان میں ترتیب دینے کا حکم دیا تاکہ وہ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ کی خدمت میں پیش کیا جائے چنانچہ مولانا سندھی کو امیر صاحب کے یہاں شرف باریابی بخشا گیا اور وہ بھی مولانا کی طرف سے مطمئن ہو گئے اس عرصہ میں مہاجرین طلبہ کے ساتھ تحریک شیخ الہند کے دو اور ارکان مولانا منصور انصاریؒ اور مولانا سیف الرحمٰن یاغستان سے ہوتے ہوئے کابل پہنچ گئے مولانا سیف الرحمٰن حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

شاگرد تھے شیخ الہندؒ کے حکم سے انھوں نے راہِ ہجرت میں قدم رکھا تھا ان کے وکیل مولانا محمد بشیر جو خود مردِ مجاہد تھے اور مجاہدین کے گروہ میں رہتے تھے نوجوانوں کی تحریکِ ہجرت میں زبردست معاون تھے۔

حکومت موقتہ ہند کا قیام

امیر حبیب اللہ خاں جیسا کہ لکھا جاچکا ہے ایک کمزور طبیعت اور حیلہ جو مزاج کے آدمی تھے۔ اپنے والد صاحب امیر عبدالرحمٰن کی طرح صائب الرائے اور پختہ عزم کے مالک نہ تھے۔ برطانیہ کی قوت قاہرہ کا بھوت اُن کے دماغ پر سوار تھا۔ اور انگریزوں کی روپہلی اور سنہری بارش اُن کو انگریزوں کے خلاف کسی سخت اقدام سے باز رہنے کی دعوت دیتی رہتی تھی۔ اُنکے مقابلہ میں سردار نصر اللہ خاں مخالفت برطانیہ کے جذبہ کے حامل تھے۔ لیکن ایک چنا بھاڑ کہاں جھونک سکتا تھا۔ سردار موصوف مولانا برکت اللہ اور مولانا سندھی سے بہت قریب اور انکی ہر تجویز پر کامل اتفاق رکھتے تھے لیکن خود امیر اور اُنکے ولیعہد عنایت اللہ برطانیہ کے زیر اثر تھے۔ مولانا عبداللہ سندھی اپنے پروگرام کو تحریری شکل میں امیر صاحب کے سامنے پیش کیا جو پسند خاطر ہوا۔ اِدھر مولانا برکت اللہ بھوپالی نے اپنی جوش بیانی و طلاقت لسانی سے مجوزہ پروگرام کی تائید کی۔ تیسری طرف مولانا محمد بشیر نے سرحدی قبائیل کی طرف سے بیعت نامے امیر کی خدمت میں پیش کردئے غرض ہر طرف سے اُن کو مطمئن کر دیا گیا۔ چنانچہ امیر نے اسلحہ فیکٹری کے تمام انگریز ملازموں کو برطرف کر دیا۔ یہ ہندوستان کی طرف سے حملہ کیلئے پہلا اقدام تھا۔ لیکن ظاہر ہے فرنگی اِن حالات سے آنکھیں بند کئے ہوئے نہیں تھے۔ اُنھوں نے ایک ایسے پیر کو اپنا ہمنوا بنالیا۔ جسکو امیر کی طبیعت میں اور افغانی عوام پر اثر ورسوخ حاصل تھا۔ جب امیر نے دعائے خیر کے لئے پیر صاحب کا ذکر کیا تو انھوں کہا ٹھہرو۔ میں استخارہ کروں گا۔ چھوتھے روز بتایا کہ ہندوستان پر حملہ افغانستان کی تباہی کا پیش خیمہ ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ پیر صاحب کو انگریزوں نے پچاس لاکھ روپیہ اور امیر صاحب کو آٹھ کروڑ روپیہ کا لالچ دیا تھا (مشاہدات باغستان صفحہ (۳۴-۳۵) اُمید کی کلیاں شگفتہ ہوگئیں۔ مگر امیر صاحب نے اپنے اس اقدام کے لئے یہ شرط پیش کر دی کہ حملہ کے لیے انڈین نیشنل کانگریس سے معاہدہ ہونا چاہیے۔ اور اس کے لیے مولانا محمد علی یا حکیم اجمل خاں یا پنڈت موتی لال نہرو جیسے کسی لیڈر کو کابل آنا چاہیے (مشاہدات کابل صفحہ ۲۲) یہ شرط اصولی طور پر معقول تھی کہ ہندوستان کی کوئی ایسی

جماعت امیر کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ نہ ہو جسے یہاں کی بڑی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو تو یہ اقدام افغانستان کیلئے خطرناک پیچیدگیاں پیدا کر سکتا تھا۔ اس لیے سب اس پر متفق ہو گئے کہ حکومت موقتہ ہند قائم کر لی جائے جسکی تائید انڈین نیشنل کانگریس سے حاصل کی جائے۔ چنانچہ مولانا سندھی نے ملک کے باہر کانگریس کی شاخ قائم کی اور وہ اُسکے پہلے صدر ہوئے (کابل میں سات سال)، جب ہندوستانی مشن کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی تو حکومت کا قیام ۲۹ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کو قاضی القضاۃ عبدالرزاق خاں کے دولت کدہ پر عمل میں آیا۔ چنانچہ مولانا برکت اللہ بھوپالی وزیر اعظم، صدر راجہ صاحب، ہیں مولانا عبیداللہ سندھی وزیر داخلہ، ڈاکٹر خوشی محمد اور اللہ نواز خاں سکریٹری ہوئے حکومت موقتہ کے ارکان میں ہندوستان کی آزادی خواہ افراد جمع ہو گئے تھے۔ (کابل میں سات سال صفحہ ۶۱)، راجہ صاحب اور مولانا صاحب تو غدر پارٹی امریکہ اور امن کمیٹی کے ممبر تھے اور مولانا عبیداللہ سندھی تحریک شیخ الہندؒ کے معتمد خصوصی تھے۔ اسوقت افغانستان میں مطلق العنان حکومت تھی دربار میں مصاحب خاص کے نام سے سردار آصف جان، محمود جان، سردار محمد نادر خان وغیرہ تھے۔ خارجہ پالیسی انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ حکومت کسی غیر ملک سے بغیر اجازت خط و کتابت نہیں کر سکتی تھی۔ امیر صاحب عیش پرستی میں مگن تھے۔ ولیعہد سردار عنایت اللہ خاں انگریزوں کا طرفدار تھا۔ البتہ سردار نصر اللہ خاں اور غازی امان اللہ خاں آزاد خیال اور تحریکِ آزادیٔ ہند سے دلچسپی رکھتے تھے۔

حکومتِ موقتہ کے وفود کی ۱۶ء میں روانگی: —— حکومتِ موقتہ نے آزادیٔ ہند کے پروگرام بروئے کار لانے کے لئے دو مشن بھیجنے کا فیصلہ کیا ایک مشن روس کے لئے زار روس نکولس دوم اور گورنر روسی ترکستان کو روانہ کئے جائیں کہ وہ برطانوی حکومت سے اتحاد ختم کریں اور آزادیٔ ہند کے لیے امداد کریں۔ چنانچہ اس مشن کے قائد ڈاکٹر متھرا سنگھ اور ڈاکٹر ممبر خوشی محمد تجویز ہوئے۔ جنکو مرزا محمد علی فرضی نام دیا گیا۔ زار روس کو متاثر کرنے کے لیے سونے کے تپر پر اس خط کو لکھا گیا۔ جس کے اندر راجہ صاحب کے دستخط بحیثیت صدر

راستہ کی خدمت کے لئے سرنام سنگھ (سکھ) اور ایک افغان ساتھ کئے گئے۔ چنانچہ ۱۶ء سرحد ہوتے ہوئے یہ لوگ تاشقند پہنچے۔ گورنر سے وہ خط زار کی خدمت میں روانہ کردیا۔ زارِ روس چونکہ اس وقت اقتصادی بدحالی کا شکار تھا۔ اس لئے زار نے برطانوی حکومت سے اس خط کے بہانہ سودے بازی شروع کردی۔ لارڈ کرزن کو اس کی تفتیش کے لئے روس بھیجا گیا۔ اور وفد کی گرفتاری کا حکم دیدیا گیا۔ مگر گورنر تاشقند کی مداخلت سے یہ وفد بچ نکلنے میں کامیاب ہوا جب وفد کابل واپس پہنچا تو راجہ صاحب سردار نصراللہ خاں کے حضور میں گئے۔ سرنام سنگھ نے مختصر "صاحب بخیر رفتم و بخیر باز آمدم" کہا۔ جب تفصیلی بیان کے لئے مولانا سندھیؒ نے اشارہ کیا۔ تو ڈاکٹر خوشی محمد نے راستہ میں جو نوٹ لکھے تھے اس کی روشنی میں بہت اچھے طریقہ سے سیاست کا حال بتایا۔ جس کی وجہ سے مولانا سندھیؒ اور مولانا برکت اللہ بھوپالی کے اثر ورسوخ افغانی حکومت میں بڑھ گیا۔ دوسرا مشن جاپان کے لئے حسب تجویز مولانا برکت اللہ طے پایا۔ جو روس کے راستہ سے جاپان پہنچے اور ایک مولانا سندھیؒ کی تجویز پر ایک وفد استنبول کے لئے جانا طے پایا۔ جاپانی مشن میں شیخ عبدالقادر اور ڈاکٹر متھرا سنگھ نامزد ہوئے۔ اور ترکی مشن میں عبدالباری اور شجاع اللہ مقرر ہوئے لیکن یہ دونوں مشن بھی ناکام رہے۔ زار روس نے انگریزوں سے پہلے ہی سازش کر رکھی تھی۔ لہٰذا وفد کو انگریزوں کے سپرد کردیا۔ ڈاکٹر متھرا سنگھ پھانسی پر چڑھا دیئے گئے اور شیخ عبدالقادر جیل میں فوت ہوگئے۔

دوسرا مشن جو ترکی بھیجا گیا تھا۔ وہ مشہد میں روسیوں کے ہاتھ پڑ گیا۔ دونوں کو سخت اذیتیں دے کر انگریزوں کے حوالہ کیا۔ زار شاہی نے ان انقلابی محب وطن کے بین الاقوامی قانون کی ہی خلاف ورزی نہیں کی بلکہ چند سکوں کے خاطر دشمن کے سپرد کردیا گیا۔ جسکی بنا پر برطانوی حکومت کو ان انقلابی سرگرمیوں کا پتہ چل گیا۔ اور اس نے افغانی حکومت سے احتجاج کیا۔ جس کے نتیجہ میں ہندوستان کے شیخ محمد ابراہیم اور مولانا محمد علی قصوری جو حبیبیہ اسکول میں ملازم تھے ان کو برطرف کرکے کابل چھوڑنے کا حکم دیدیا گیا۔ ان حالات کی بنا پر شیخ محمد بشیر جو مجاہدین کے نمائندہ تھے وہ بھی کابل چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ جب پہلی بار راجہ صاحب نے کابل چھوڑا تو حکومت موقتہ کے تین مرکز انہوں نے تجویز کئے۔ کابل، نیپال، مشرقی بنگال،

مرکز کا کام مولانا سندھی کے سپرد ہوا۔ جب امیر امان اللہ خاں ۱۹۱۹ء میں برسر اقتدار آئے تو توحکومت موقتہ کے نمائندہ کی حیثیت سے مولانا سندھی کو شریک رکھا۔ چنانچہ افغانستان کے استقلال میں حکومتِ موقتہ کا زبردست ہاتھ ہے۔

ریشمی سازش کی حقیقت

حضرت شیخ الہند اپنے مخلص جاں نثاروں سے جو بیعت فرماتے تھے وہ بیعت جہاد لیتے تھے۔ مولانا الیاس بانی تبلیغی جماعت حضرت کے مرید تھے۔ حضرت شیخ کی رگ و پے میں جذبہ جہاد موجزن تھا۔ حضرت شیخ الہند نے جو تحریک منظم کی تھی اس کے اندر پچھلی تحریکات کے تجربوں کو سامنے رکھ کر اسکیم بنائی تھی جس طرح سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید ابتدائی سرگرمیوں کے لئے سرحد یاغستان کو منتخب کیا۔ چونکہ وہ ایسا مقام تھا جہاں بین الاقوامی پیچیدگیوں سے علاحدہ رہ کر ہر طرح کی تیاری کی جاسکتی تھی۔ شیخ الہند عملی زندگی کے آغاز سے نقشہ تیار کر چکے تھے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع کی۔ جن کی ہندوستان کے اندر سیاسی سرگرمیاں برائے نام تھیں۔ اس وقت کے حالات کسی تیز تحریک کے سازگار نہ تھے۔ اور مخلص افراد کمیاب تھے۔ اس لئے اسلامی درسگاہوں کے ذریعہ تربیت دینے کا انتظام کیا گیا۔ بزرگانِ دیوبند کا جو اصلی نصب العین تھا اس پر صرف شیخ الہند ہی سرگرمِ عمل ہوئے تاکہ انقلابی مساعی کے ساتھ ساتھ عوام کی صحیح تربیت کے کام بھی انجام پذیر ہوتا رہے۔ دریاؤں کا پانی نہروں کے ذریعہ کھیتوں میں پہنچتا ہے۔ تو زمین کی اندرونی صلاحیتیں پیداوار کے انبار فراہم کر دیتی ہے۔ لیکن وہ پانی اگر بے پناہ سیل کی شکل اختیار کرلے تو بستیوں کی ویرانی اور فصلوں کی بربادی کے نتیجہ نکل سکتا ہے۔ (سرگزشت مجاہدین ص۵۵۲)

حضرت شیخ الہند کے پروگرام کے سلسلہ کی اہم کڑی حزب اللہ کی تشکیل ہے۔ حزب اللہ در اصل خدمتِ خلق کے لئے ایک رضاکارانہ تنظیم تھی۔ اس کا کام یورپی سامراج کو ایشیا کی سرزمین سے بنیاد سے اکھاڑ پھینکنا اور صحیح اصولوں پر حکومت قائم کرنا مقصد تھا۔ حضرت شیخ کے شاگرد معتقد ہند و بیرون ہند باغستان، افغانستان، بلخ و بخارا اور مشرقی وسطیٰ تک پھیلے ہوئے تھے اس لئے اس کی شاخیں بے نام ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ جب مولانا

سندھی کو کابل میں پاؤں جمانے کا موقع ملا تو انہوں نے جنود اللہ کی تشکیل کی۔ حضرت شیخ الہند نے جو طویل المیعاد منصوبہ سامراج سے لڑائی کے لئے بنا رکھا تھا وہ صبر آزما و دیر طلب تھا۔ لیکن جنگ عظیم ۱۹۱۴ء نے جس نے اک دم ساری دنیا کو جنگ کے دہانے پر لا کر کھڑا کر دیا اور یورپ کے موذی جو آپس میں برسرپیکار ہو گئے۔ تو حضرت شیخ کے دامن صبر و شکیب ہاتھ سے چھوٹ گیا شیخ نے خیال کیا کہ انگریزی افواج جب کہ متعدد و مختلف محاذوں پر اپنی طاقتوں کو بکھیرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ ایسا نادر موقع صدیوں میں ہاتھ آیا ہے۔ اس لئے خود حضرت نے حجاز کا رُخ کیا اور مولانا سندھی کو کابل روانہ کیا۔ حضرت شیخ نام و نمود سے دور اور شہرت و ناموری سے نفور رہے۔ وہ ایسے برگزیدہ بزرگ تھے۔ جنھوں نے اپنی شخصیت کو پردہ گمنامی میں ڈال رکھا تھا جو اپنی جدوجہد کو پاک وصاف رکھنا جانتا تھا۔ پرائے تو پرائے تھے اپنوں نے بھی ان کو نہ پہچانا تھا۔ وہ رازدارانہ طور پر تحریک کو چلا رہا تھا۔ سڈیشن کمیٹی کی رپورٹ تیار کرنے والوں کی نادانی اور بھول ہے کہ اس تحریک کا بانی مولانا عبید اللہ سندھی کو سمجھتے رہے۔ حالانکہ مولانا سندھی تو (نظارۃ المعارف قرآنی) دہلی میں نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو حکمت قرآنی سکھانے کا دینی کام انجام دے رہے تھے۔ یہ شیخ الہند تھے جنہوں نے مولانا سندھی کے جوہر قابل کو پہچانا اور ان کو سیاست کے تپتے ہوئے میدان میں ڈال دیا جہاں وہ تپ تپا کر کندن بن کر ایک بین الاقوامی شخصیت بن گئے۔

جو نقشہ فوری ترتیب دیا گیا تھا اس کا صدر مقام مدینہ منورہ رکھا گیا تھا۔ اور قسطنطنیہ، تہران، اور کابل اس کے مرکز قرار دیئے تھے۔ خود شیخ سالار اعظم (کمانڈر انچیف) ہوئے۔ کابل کے سالار مولانا سندھی اور یاغستان کے سالار مولانا سیف الرحمٰن بنائے گئے۔ حاجی ترنگ زئی اور ملا سنڈر کے مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری، مولانا فضل محمود، مولانا فضل الٰہی، مولانا محمد اکبر ان کے مخلص کارکن تھے۔ ہندوستان کے جملہ مسلم زعماء حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام، نواب وقار الملک اور مولانا محمد علی وغیرہ حضرت کے معاون تھے۔ اسکیم یہ تھی کہ ایک مقررہ دن (۱۹ فروری ۱۹۱۷ء) میں ہندوستان کے اہم فوجی وسیاسی مقامات پر منظم بغاوت کر دی جائے۔ ٹھیک اسی تاریخ، اسی دن، اسی وقت ہندوستانی انقلابیوں کے ساتھ

ترک و افغان فوجیں ہندوستان پر حملہ ہوں۔ اس طرح اندرونی و بیرونی محاذون کے کھل جانے پر برطانوی نظام حکومت کو معطل کر دیا جائے۔ اس اچانک اندرونی بغاوت اور یکایک بیرونی حملہ سے انگریزی اقتدار کا خاتمہ ہوکر برسوں کی آزادی کا خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے گا۔ انکی فہرست میں تین کمانڈر، بارہ فیلڈ مارشل اور حسب مراتب عہدہ دار مقرر کیئے گئے۔ جنود اللہ کی یہ اسکیم کابل کی سرزمین میں تو سرسبز نہ ہوسکی لیکن عرصہ بعد خاں عبدالغفار خاں نے خدائی خدمت گار کے نام سے اپنے پیر و مرشد اور حضرت شیخ کی تحریک کو زندہ کیا جس نے آزادی ہند کے لئے کانگریس کے شانہ بشانہ رہ کر اہم رول انجام دیا۔ یاد رہے کہ حضرت شیخ سے اس اسکیم کے سلسلہ میں لوگوں کو جو اشارات و ہدایات دیئے گئے تھے وہ زرد ریشمی حروف میں کشیدہ کاری کی شکل میں لکھے گئے تھے۔ یہ تمام ہدایات زعفرانی رنگ کے ریشمی کپڑے پر خوبصورت بیل بوٹے کی شکل میں لکھی جو ایک مربع گز نفیس کپڑا تھا۔ سنڈیش رپورٹ ناقص معلومات پر مبنی ہے۔ درحقیقت یہ تحریک آزادی کی اسکیم تھی جو ہندوستان کی آزادی کے اس پیدائشی حق کے لئے جاری کی گئی تھی۔ جسکو فرنگی سامراج نے رسوائے زمانہ عنوان "ریشمی سازش" کا نام دیا ہے گویا حصولِ آزادی کی کوشش کو سازش کہا گیا۔ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

شیخ الہند کا سفر حجاز ۱۹۱۵ء

اپنے پروگرام کے مطابق شیخ الہند نے ماہ شوال ۱۳۳۳ھ میں حج کا قصد فرمایا۔ ڈاکٹر انصاری نے جو حضرت کے مخلص مرید اور تحریک کے رازدار تھے اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالرزاق کے ذریعہ سفر کے سارے انتظامات فرمائے۔ حکیم صاحب مہینوں حضرت کے پاس دیوبند رہتے تھے۔ جب کہ اس سفر کی خبر معتقدوں کو پہنچی اور یہ بھی کہ حضرت ہجرت کر رہے ہیں۔ لوگ جوق در جوق دیوبند پہنچنے لگے۔ والیہ بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم جو شیخ کے پیر و مرشد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے رشتہ بیعت رکھتی تھیں۔ انہوں نے حضرت شیخ کو بھوپال کی طرف

سے گذرنے کا دعوت نامہ بھیجا لیکن سیاسی مصالح کے پیش نظر شیخ نے انکار فرما کر بمبئی کیلئے راستہ بدل دیا۔ غرض بمبئی سے بحری جہاز میں سوار ہوکر جدہ اور مکہ معظمہ بخیر و عافیت پہنچ گئے۔ مکہ معظمہ میں حاجی عبدالجبار صاحب دہلوی کے ذریعہ گورنر حجاز غالب پاشا سے ملے، اور اپنے مقصد سفر کو پیش کیا۔ دوسرے دن حضرت کے مقام و مرتبہ کو معلوم کرکے پرتپاک طریقہ پر ملاقات کی۔ حضرت نے انور پاشا سے ملنے کی خواہش کی۔ غالب پاشا نے ایک تحریر گورنر مدینہ گورنر پاشا کے نام لکھ دی کہ شیخ معتمد شخص ہیں۔ ان کے مطالبات کی تکمیل کی جائے۔ اور اس پر زور دیا کہ تمام ہندوستانیوں کو آزادیٔ کامل سے کم کسی بات پر راضی نہ ہونا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ اقتدارِ ماتحتی پر وہ راضی ہو جائیں اس مقصد کے لئے آنجناب کو ہندوستان جانا ضروری ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ میرا ہندوستان پہنچنا خالی از خطرہ نہیں میں گرفتار کرلیا جاؤں گا۔ اپنے ساتھیوں کو اس کام کے لئے بھیجتا ہوں۔ میں یہاں سے شمال مغربی علاقہ میں پہنچ کر اپنے مشن لوگوں کے ساتھ مل کر کام کروں گا۔ پھر غالب پاشا سے دو تین خفیہ ملاقاتیں رہیں۔ حضرت کا پروگرام مدینہ کے بعد استنبول جانے کا بنا تھا۔ حضرت شیخ ان کارروائیوں کے بعد مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔ ۱۵ ر نومبر ۱۹۱۵ء مدینہ منورہ سے قریب پہنچے تو حضرت کے شاگرد رشید مولانا حسین احمد مدنی رح نے مدینہ کے علماء فضلا کے جلو میں شاندار استقبال کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ چند ماہ قیام رہا۔ حضرت کی خوش قسمتی سے خود انور پاشا اور جمال پاشا کا دورہ مدینہ منورہ کا ہوا۔ جس مقصد عالی کے لئے استنبول کے سفر کا قصد کر رہے تھے وہ گھر بیٹھے مدینہ منورہ میں حاصل ہوگیا۔ یہ دونوں وزراء چونکہ سرکاری دورہ پر آئے ہوئے تھے اس لئے ان کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ دوسرے دن مسجد نبوی میں علماء سے ملاقات اور ان کی تقاریر سننے کے لئے خاص مجلس منعقد کی گئی۔ جس کے اندر شیخ العلماء مفتی مامون (شاگرد شاہ عبدالغنی دہلوی) اور مولانا مدنی کی تقاریر ہوئیں۔ جن کا خوشگوار اثر مرتب ہوا۔ پھر حضرت شیخ الہند کا تعارف ہر دو وزیروں سے کرایا گیا۔ پھر غالب پاشا کے خط پیش کرنے پر شیخ کی تنہائی میں ملاقات اور آزادیٔ ہند کے پروگرام پر گفتگو کرنے کے لئے وقت دیا گیا۔ ان وزراء نے بھی ہندوستانیوں

سے کامل آزادی کے موقف پر جمے رہنے اور اس کے لئے ہر طرح کا امداد دینے کا وعدہ کیا۔ اور یہ بھی وعدہ کیا کہ تمام مسلمانوں کے نام خطوط شام پہنچ کر ترکی، عربی، فارسی میں بھیج دیئے جائیں گے۔ پھر حسب وعدہ وہ خطوط شام سے بھیج دیئے گئے۔ شیخ الہند نے غالب نامہ مولانا محمد میاں کو دے کر ہندوستان مع دیگر رفقاء کے روانہ کر دیا۔ اس خط کو ان کی اہلیہ کے آئینہ کے ڈھکنے کے پیچھے چھپا کر رکھ دیا۔ جو سلامتی کے ساتھ ہندوستان پہنچ گیا۔ برطانوی حکومت کو اس کی سن گن مل چکی تھی۔ اس لئے مولانا محمد میاں خفیہ پولس کو جو ان کے سایہ کی طرح ان کے پیچھے لگی ہوئی تھی چھپتے چھپاتے انبیٹھ، بروٹ، میرٹھ، لاہور، پشاور پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہاں مولانا عبدالرحیم پوپل زئی کے مکان کے بیچ کھوکھلی دیوار میں تیس دن روپوش ہو کر افغانی بھیس بدل کر رات کے اندھیرے میں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ جب کہ سی، آئی، ڈی اس مکان کے چاروں طرف سے محاصرہ کئے ہوئے تھی۔ اس طرح دیگر تحریرات ایک صندوق میں بند کر کے مولانا ہادی حسن خاں جہانپوری حاجی شاہ بخش سندھی کے ہاتھ روانہ کر دیا گیا تاکہ وہ اس کے فوٹو کروا کر مختلف مقامات پر پہنچا دیں۔ جب یہ حضرت بمبئی پہنچے تو سی، آئی، ڈی، شیخ کی تفتیش میں لگی ہوئی تھی اور وہ صندوق قلیوں کے ذریعہ جا چکا تھا حالانکہ ہاتھوں کی چھڑیاں توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئی تھیں۔ پھر یہ صندوق جاجہانپور پہنچ کر باوجود پولس کی زبردست تفتیش کے بچ نکلا اور فوٹو کاپیاں بھی بھیج دی گئیں۔ جو حملہ کا پلان تھا وہ اس طرح تھا کہ (۱) قلات و مکررہ کے قبائل ترک فوج کی قیادت میں کراچی پر حملہ کر دیں۔ (۲) کوئٹہ کے محاذ پر غزنی و قندہار سے قبائل ترک فوج کے زیر کمان حملہ کریں۔ (۳) پشاور کے محاذ پر کوہستانی قبائل کی مدد سے حملہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ یہ ہدایت بھی تھی کہ یکم جنوری ۱۹۱۷ء کو معاہدہ کی توثیق کی اطلاع کابل سے دی جائے گی۔ ۱۹ فروری ۱۹۱۷ء کو حملہ کر دیا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ اپنوں کے ذریعہ یہ راز فاش ہو گیا تھا جس کی وجہ سے سی، آئی، ڈی، سرگرم عمل رہی۔

ترکوں سے شریف حسین کی بغاوت ۱۹۱۶ء

ادھر ہندوستان کے محبانِ وطن اس غلامی کی زنجیر کو توڑنے کے لئے فرنگی سامراج کے خلاف مردانہ وار میدانِ جہاد میں کود پڑے ادھر شریفِ مکہ حسین بن علی نے انگریزوں سے ساز باز کر کے خلافتِ اسلامیہ کے خلاف ٹھیک اس وقت بغاوت کا جھنڈا لہرایا جب کہ حکومتِ موقتہ آزادی ہند کا پروگرام طے کر چکی تھی۔ شیخ الہند طائف میں محصور تھے۔ جب کہ مکہ معظمہ واپس ہوئے تو حضرت کی گرفتاری کا حکم صادر ہو گیا۔

ریشمی رومال کی تحریک کے افشا ہونے پر کرنل لارنس منتظم امورِ جنگ برطانیہ شریف حسین سے مل کر یہ حکم لے لیا کہ ہندی عالم کو جدہ پہنچا کر برطانیہ کے حوالہ کر دیا جائے۔ چنانچہ ۱۷ دسمبر ۱۹۱۶ء کو مولوی عزیز گل (جو ابھی بقیدِ حیات ہیں) مولوی وحید احمد جدہ روانہ کر دیئے گئے۔ بعد مولانا حسین احمد مدنی رح کو گرفتار کر کے قاہرہ بھیج دیا گیا۔ اور پھر سب کو ۲۱ فروری ۱۹۱۷ء کو مالٹا میں قید کر دیا گیا۔ حضرت شیخ اور ان کے ساتھیوں کو جب مالٹا میں نظر بند کیا گیا تو شروع شروع میں اقبالِ جرم کیلئے ایسی چھوٹی سلاخوں والی کوٹھریوں میں رکھا گیا جہاں انسان صرف کھڑا ہی رہ سکتا ہے۔ ہلنے جلنے سے وہ سلاخیں نیزہ کی نوکوں کی طرح جسم کو زخمی کر دیتی تھیں۔ اور پھانسیاں بارکوں کے سامنے لٹکا دی گئی تھیں تاکہ وہ سختیوں سے تنگ آ کر اپنے جرم کا اقرار کر لیں۔ مولانا کے رفقاء ان سولیوں کو اپنی گردنوں میں لٹکا کر مشق کیا کرتے تھے لیکن حضرت کے بے مثال عزم و استقامت سے دشمنوں کے دل بھی پگھل کر رہ گئے اور پھر پوری طرح ان کو شاہی قیدیوں کی طرح رکھا گیا۔ اور حضرت کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کیا جانے لگا۔

مشن کابل کی ناکامی کے اسباب

امیر حبیب اللہ سے جرمن ترک ہندوستانی مشن سے ابتداً جو بات چیت ہوئی وہ کافی حوصلہ افزا تھی۔ امیر حبیب اللہ مولانا برکت اللہ کے وفد اور مولانا سندھی کو طفل تسلیاں دیتے رہے جن سے روشن مستقبل کی سنہری توقعات قائم کی جانے لگیں۔ لیکن جوں جوں وقت بڑھتا جا رہا

تھا۔ دھوپ چھاؤں کی طرح رنگ بدلتا گیا۔ بقول مولانا مہر معاملہ کی حیثیت ایسی تھی جیسے کسی کو بزور کھینچ کر اندر سے باہر تک لانے کی کوشش کی جائے۔ امیر حبیب اللہ عزم و ہمت کا آدمی نہ تھا۔ اس نے اپنی زندگی ایسے سانچہ میں ڈھالی تھی۔ جہاں عیش ہی عیش تھا۔ اپنی زندگی جہاں ہر قدم پر محنت و جفاکشی یا چرچل کے تاریخی الفاظ میں خون اور آنسوؤں کو قبول کئے بغیر چارہ نہ ہو۔ اس کے لئے ممکن نہ تھی۔ بیشک اس اقدام سے افغانستان کیلئے ہی بہتری کی توقعات وابستہ نہیں کی جاسکتی تھیں۔ بلکہ ہندوستان اور پورے ایشیاء کے لئے انگریزوں کے تسلط سے نجات پانے کے امکانات بھی تھے۔ لیکن ایسے منصوبہ کے لئے جس قسم کی جواں مردی کی ضرورت تھی وہ مفقود تھی۔ جہاں اغراض کی محبت مقاصد پر غالب آجائے وہاں کامیابی کے نتائج کی کیا امید ہوسکتی ہے۔ امیر کے دوسرے بھائی نصراللہ خاں کے دل میں انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ موجود تھا۔ اکیلا چنا کیا بھاڑ بھون سکتا تھا۔ مولانا محمد رشید نے اس کیلئے جملہ قبائل کی طرف سے بیعت نامہ لاکر کچھ آمادہ بھی کر لیا تھا۔ لیکن عیش و ہوس میں ہمیشہ ابہام رہے گا۔ (سرگذشت مجاہدین ص۵۱۷)

اس وقت ہندوستان میں برطانوی فوج گیارہ ہزار سے پندرہ ہزار کے درمیان تھی۔ اگر افغانوں و مجاہدوں کو اسلحہ مل جائے تو یقیناً معاملہ دگرگوں ہوجاتا لیکن تقدیر بھی تدبیر کے پردہ میں ظاہر ہوا کرتی ہے۔ مولانا سندھیؒ نے جرمن و ترک مشن کی ناکامی کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ (۱) جرمن و ہندوستانی ممبر آپس میں یکجہتی قائم نہ رکھ سکے۔ جو ایسی مہمات کے لئے ضروری ہے۔ (۲) ہندوستانی ممبر سارا الزام جرمنوں پر تھوپتے تھے جرمن ممبر شکایت کرتے تھے کہ برلن و استنبول میں جو سبز باغ دکھائے گئے تھے ان کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا تھا۔ (۳) مولانا سندھیؒ نے راجہ مہندر پرتاب کی بعض کوتاہیوں کی طرف متوجہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا جرمن چانسلر نے توجہ دلائی تھی اور میرے لئے آسانی پیدا کرنا چاہی تھی۔ مگر اسے خلافِ شان سمجھ کر انکار کر دیا۔ (ذاتی ڈائری ص۵۲، ۵۳)

مولانا سندھی نے جن فروعی واقعات اور غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اپنی جگہ صحیح بھی ہوں تب بھی اصل وجہ امیر حبیب اللہ کی دولت پرستی و عیش پسندی اور تن آسانی

ہے۔ اگر امیر میں اولوالعزمی، بلند حوصلگی اور موقع شناسی کا جوہر ہوتا تو بقول مولانا نہ جرمنوں اور ہندوستانیوں میں اختلاف پیدا ہوتا اور نہ وہ ایک دوسرے پر الزام تراشنے کیلئے مضطرب ہوتے۔ (سرگذشت مجاہدین ص ۵۱۹)

جب حالات نے اپنا رنگ دکھایا اور مشن ناکام ہو گیا تو امیر حبیب اللہ نے راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ بھوپالی کو افغانستان سے جانے کا مشورہ دیا۔ یہ واقعہ اپریل ۱۹۱۷ء کا ہے جرمن مشن پہلے ہی جا چکا تھا۔ اور مولانا منصور انصاری کابل سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ راجہ صاحب مزار شریف چلے گئے تاکہ روس کی سرحد پار کر سکیں۔ اور کاظم بے ہرات جانا پسند کیا تاکہ براہ ایران قسطنطنیہ جا سکیں۔ (برکت اللہ ص ۹۱۳) کچھ دنوں بعد ۱۹۱۷ء میں مولانا سندھی کو گرفتار کر لیا گیا۔ پھر جب امیر حبیب اللہ ۱۹۱۹ء میں شہید ہو چکے اور غازی امان اللہ خاں اسیر بنا دئے گئے۔ چونکہ غازی امان اللہ خاں نے اپنی قوم سے دو باتوں کا وعدہ کیا تھا ایک حبیب اللہ کے قاتلوں کو معلوم کر کے ان کو کفرِ کردار کو پہنچانا۔ دوسرے انگریزوں کی ماتحتی سے افغانستان کو چھڑانا۔ چنانچہ انہوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور ہرات سے مولانا برکت اللہ بھوپالی کو کابل طلب کیا۔ مولانا سندھی اور مہاجر طلبہ کو قید و بند کی زندگی سے نجات ملی۔ جب مولانا حاضرِ دربار ہوئے تو غازی امان اللہ خاں نے کہا میں سیوں ستم میں تو دینی ہوں بھی وہ زمانہ ۱۹۱۹ء جب کہ ہندوستان میں جرنل وائر کی سفاکی کی وجہ سے جلیانوالہ باغ کے سانحہ نے پورے ملک میں ایک آگ لگا رکھی تھی۔ اگرچہ جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی لیکن برطانوی افواج کے مختلف محاذوں پر بکھرے ہونے کی وجہ سے ہندوستان فوجی اعتبار سے کمزور تھا۔ اس لئے مولانا برکت اللہ بھوپال غازی امان اللہ خاں کو اپنا خصوصی سفیر بنا کر روس بھیجا تاکہ وہ کامریڈ لینن سے مل کر اس امر پر آمادہ کر لیں کہ جب افغانستان برطانوی ہند پر حملہ کرے تو سرخ روس اس کی امداد کرے۔ کیونکہ افغانستان کی خودمختاری کیلئے اس سے بہتر موقع نہیں آسکتا تھا۔ دوسری طرف مولانا سندھی کو افغانی امور میں شریک کر کے اعزاز بخشا اور حکومت موقتہ ہند کی نمائندہ کی حیثیت سے جنگ و صلح کے موقع پر شریک بنایا۔

فرانسسکو کا تاریخی مقدمہ اور مولانا برکت اللہ بھوپالی

اس سے پہلے کہ مولانا برکت اللہ بھوپالی کی ان مجاہدانہ سرگرمیوں سے اس کتاب کے صفحات کو زینت دی جائے جو حضرت شیخ الہند کے رولٹ ایکٹ کی روشنی میں حضرت مولانا سندھی کے اشتراک سے عمل میں آئیں جس کو ہندوستان پر افغان حملہ کے بھیانک روپ میں برطانوی مورخین نے برادرانِ وطن کے سامنے پیش کیا اس جگہ سان فرانسسکو کے اس بین الاقوامی تاریخی مقدمہ کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جس کے اندر مولانا کی ذات ہندوستانی انقلابیوں کے درمیان ایک ہیرو کی حیثیت سے مطلع سیاست پر چمکی یہ بغاوت کا مقدمہ جرمنی اور امریکی اور ہندوستانی انقلابیوں پر ۲۰ نومبر ۱۹۱۷ء سے شروع ہو کر ۲۱ اپریل ۱۹۱۸ء کے فیصلہ پر اختتام پذیر ہوا کل مجرموں کی تعداد ایک سو پانچ پر مشتمل تھی۔ جس کے اندر جرمنی کے اعلیٰ عہدیدار بھی تھے۔ اور امریکی شہری اور ہندوستانی انقلابی بھی۔ جس کے ایک زبردست مجرم مولانا برکت اللہ بھوپالی بھی تھے۔ ان مجرموں پر فرد جرم لگائی گئی تھی کہ انھوں نے برطانوی شہنشاہیت کے خلاف مسلح کارروائیوں کے لئے رضاکار دستے تیار کئے تھے اور ان کو باضابطہ ٹریننگ دی گئی تھی۔ امریکہ کے سرکاری وکیل جان پرسٹن نے یہ الزام لگایا تھا کہ حکومت جرمنی نے انگریزوں کے خلاف اپنے جنگی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہندوستان میں مسلح بغاوت کے لئے انقلابیوں کے لئے امدادی فنڈ قائم کیا تھا جس سے مالی امداد اور مفت ہتھیار مہیا کئے جاتے تھے۔ ان سازشوں کا مرکز سان فرانسسکو جس کی

شاخیں میکسیکو، چین، جاپان، بٹاویا، اور دوسرے مقامات پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ہندوستانی انقلابیوں کی تعداد ۱۶ سولہ، سترہ ۱۷ افراد، رام چندر، بھگوان داس، امام الدین وغیرہ تھے۔ اس سازش کے اہم ارکان۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی، بھگوان سنگھ اور رام چندر تھے۔ انھوں نے آٹھ ہزار ہندوستانیوں کو منظم کیا اور ،، ایک برلین انڈین کمیٹی ،، قائم کی گئی تھی۔

رپورٹ میں یہ ہے کہ ملزم برکت اللہ بھوپالی نے اپنی چرب زبانی سے ہندوستانی قیدی فوجیوں کو جرمنی کی فوج میں شامل ہونے کا مشورہ دیا اور غدر پارٹی نے باغیانہ لٹریچر قیدیوں میں ہوائی جہازوں سے برسایا اور تقسیم کیا۔ اس منصوبہ میں یہ پلان طے ہوا کہ ہندوستان پر دونوں طرف سے ہلہ بول دیا جائے، رنگون، برما، بٹاویہ کے انقلابیوں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ اور جرمنی جہازوں سے ہتھیار مختلف مقامات پر اتارے گئے۔ مگر یہ منصوبہ راز فاش ہو جانے پر ناکام ہوگیا۔ دوران مقدمہ ملزموں نے مزید افشائے راز کی کوشش کی۔ جس پر انقلابی ملزم رام سنگھ نے رام چندر کو گولی مار دی، یہ دیکھ کر امریکی مارشل جیمز ہالو نے رام سنگھ کو گولی مار دی۔ اس مقدمہ میں انتالیس ۳۹ انقلابی سزایاب ہوئے۔ بہر حال مولانا برکت اللہ بھوپالی پر بھی اس مقدمہ میں بغاوت کی فرد جرم لگا دی گئی۔ (اخبار سان فرانسسکو انگیز امیر بحوالہ برکت اللہ ص۱۲۶)

ہندوستان پر افغان حملہ کی حقیقت

مولانا برکت اللہ بھوپالی کی مولانا عبید اللہ سندھی کے اشتراک سے جو حکومت موقتہ قائم کی تھی اس سے مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے۔ اس لئے کہ امیر حبیب اللہ نے اپنی فطری کمزوری، یا برطانوی سامراج کی غلبہ و بالادستی سے متاثر ہو کر اس ترک جرمنی ہندی وفد کو یہ جواب دیا کہ جب تک ترکی و جرمنی فوجیں افغانستان نہ پہونچ جائیں اسوقت تک روس و برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ خلاف مصلحت ہے البتہ جس وقت مذکورہ افواج کا پیش خیمہ افغانستان پہونچ جائے گا اعلان جنگ کر دیا جائے گا۔ مزید یہ کہ ہندوستان

کی قومی جماعت (کانگریس) کی معاہدہ گارنٹی ضروری ہے۔ جس کے لئے حکیم اجمل خان جیسا ذمہ دار افغانستان اگر اس معاہدہ کی توثیق کرے۔ ظاہر ہے کہ اس پُر خطر ماحول میں کھلے بندوں کسی بھی ہندوستانی رہنما کا کابل پہونچنا بہت مشکل تھا۔

ایک طرف امیر کی طرف سے یہ بہانہ سازیاں تھیں تو دوسری طرف روسیوں اور انگریزوں نے ترکی فوجوں کے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ چنانچہ انگریزی فوجوں کی عراق کی طرف پیش قدمی اس سلسلہ کی ایک کڑی تھی لیکن حکومت افغانستان کے ہندوستان پر حملہ کی جو توقعات قائم کی گئی تھیں وہ سب ناکام ثابت ہوئیں۔ جو برادران وطن کے ذہنوں پر ایک عرصہ تک بھوت بن کر مسلط رہا۔ البتہ امیر حبیب اللہ کی شہادت ۲ر فروری ۱۹۲۹ء کے بعد جب غازی امان اللہ خاں تخت کابل پر بیٹھے تو انھوں نے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کرنے کا فیصلہ کیا اور جنگ کی تیاری شروع کردیں جس میں مولانا برکت اللہ بھوپالی کو طلب کیا۔ ان کی آمد پر مولانا سندھی اور مہاجر طلبہ رہا کردیئے گئے۔ جو امیر حبیب اللہ کے دور میں نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ جب مولانا سندھی اور مولانا برکت اللہ صاحب امیر کے دربار میں پہونچے تو امان اللہ خاں نے ان سے کہا کہ "من ہموں ہستم" میں اب بھی وہی ہوں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ پنجاب میں جلیانوالہ باغ کے سانحہ سے پورے ملک میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اگرچہ جنگِ عظیم ختم ہوچکی تھی۔ لیکن اُس وقت انگریزی افواج مختلف محاذوں پر بکھری ہوتی تھیں۔ اور ہندوستان میں انکی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ چنانچہ ایک طرف افغانستان کے ہندوستان پر حملہ کی تیاریاں شروع ہوگئیں اور دوسری طرف مولانا بھوپالی کو حکومتِ افغانستان نے اپنا خاص سفیر بنا کر روس بھیجا کہ وہ کامریڈ لینن سے ملاقات کرکے اس کو اس پر رضامند کرلیں کہ جب افغانستان ہندوستان پر حملہ آور ہو تو سرخ روس ان کی مدد کرے تاکہ افغانستان انگریزوں کی بالادستی سے آزاد ہوسکے۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی ۱۹۱۹ء موسم بہار کے ابتدائی دور میں روس روانہ ہوکر اپریل ۱۹۱۹ء میں ماسکو پہونچ کر سرکاری مہمان ہوئے ادھر افغانستان کی جنگی تیاریاں

زور شور سے ہونے لگیں، دوسری طرف مولانا عبید اللہ سندھی نے افغانی فوجوں کے حملہ کی خبر دینے کے لئے ایک اعلان کا خاکہ ہندوستانیوں کے نام جاری کر دیا۔ جس پر بحیثیت وزیر موقتہ کے دستخط تھے اور ظفر حسین نے بحیثیت اسسٹنٹ ان اعلانات کو ہندوستان پہونچانے کے لئے اپنے بھتیجے محمد علی اور اللہ نواز خاں کو روانہ کر دیا محمد علی تو حیدر آباد دکن تک ان اعلانات کو پہونچانے گیا اور اللہ نواز خاں نے پنجاب میں اس اعلان کو پھیلا دیا۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی کے ماسکو روانہ ہونے کے بعد ہی مولانا سندھی بحیثیت ایکٹنگ وزیر اعظم حکومتِ موقتہ کابل پہونچ گئے اس وقت ہندوستان میں افغانی جاسوسوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ جو کابل کی خبریں پہونچا رہے تھے کہ بس حملہ ہونے کی دیر ہے کہ پورا ہندوستان مسلح بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہوگا۔ رولٹ ایکٹ کی وجہ سے پورے ملک میں بے اطمنانی کی لہریں پھیلی ہوئی ہیں اور حکومت برطانیہ کی عبادت گاہوں پر پابندی عائد کر دینے کی بنا پر عوام میں سخت جوش و اشتعال اور غم و غصہ ہے۔ اس لئے اس وقت کا حملہ ہندوستانیوں کے تعاون سے کامیاب ہوگا۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی ابھی ماسکو پہونچ بھی نہ پائے تھے اور وہ کامریڈ لینن کو افغانی پیغام پہونچانے بھی نہ پائے تھے کہ حکومتِ کابل نے جنگ کے تین محاذ کھول دیئے۔ مشرقی محاذ کے سپہ سالار محمد صالح خاں تھے۔ یہاں سے لنڈی کوتل اور جمرود جیسے مستحکم انگریزی قلعوں اور چھاؤنیوں پر حملہ کا پروگرام تھا۔ دوسرا محاذ جنوبی جس کے سالار جنرل نادر خاں تھے، جو کوتل پیواڑ سے وزیرستان کے قلعہ داناتک پھیلا ہوا تھا۔ یہ محاذ کابل کے جنوب میں وزیرستان کوہاٹ اور کرم کے انگریزی فوج کے مقابلہ کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ جس کو پھر تین حصّوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ وزیرستان کے کمانڈر سردار شاہ ولی خاں اور باقی حصّے بھی کرم کے شمالی حلقہ کے سردار شاہ محمود خاں تھے۔ یہ دونوں نادر خاں کے بھائی تھے۔

(۳) مغربی محاذ کابل کے مغرب میں قندھار میں کوتہ کے مقابل قلعہ جدید کے

اردگرد بنایا گیا تھا۔

افغانی قبائل کے سردار گردیز پہونچکر اپنے اپنے رضاکاروں کے ساتھ جوق در جوق جمع ہو رہے تھے۔ جس کے اندر مشہور قبائل مینگل اور جدران پیش پیش تھے۔ یہ امر ملحوظِ خاطر رہے کہ ان قبیلوں کا طریقہ جنگ گوریلا جنگ تھا۔ باقاعدہ میدان میں جم کر مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ غرض اس سے پہلے کہ سوویت روس سے تعاون کا معاہدہ طے پائے ۲۰/اپریل ۱۹۱۹ء کو روسی امداد کے بھروسہ پر افغانی کمانڈر نادر شاہ نے درۂ خیبر پر ہلّہ بول دیا، اور ڈک پہونچ کر اعلانِ جہاد کر دیا۔ جب برطانوی حکومت نے اس کی طرف سے توجہ دلائی تو ۱۷/مئی ۱۹۱۹ء کو کابل سے جواب دیدیا گیا کہ ہمارا اقدام صحیح ہے۔ اور ہم ہندوستان پر برطانیہ کے ظالمانہ اقتدار کو ختم کر دینا چاہتے ہیں چنانچہ مئی ۱۹۱۹ء کو افغانی فوج نے لنڈی کوتل کی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔ ادھر غلام حیدر خاں نے پشاور میں برطانیہ کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ جس کو گرفتار کر کے ملک بدر کر دیا گیا۔ جرنل نادر خاں نے دوسرا حملہ ٹھلی پر کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں مہاجرین بھی دوش بدوش مجاہدین کے ساتھ تھے۔ ظفر حسن نے توپ کے زاویوں کو درست کر کے شعلہ افشانیوں سے برطانوی افواج میں انتشار سراسیمگی پیدا کر دی۔ یہ ظفر حسن جن کے والد حافظ عظیم الدین پانی پتی بھوپال میں ملازم تھے۔ یہ بھی راہ ہجرت میں گامزن ہو کر کابل پہونچ گئے۔ جب امیر کی طرف سے اعلان جنگ ہوا تو بقول مولانا مہر ”امید کی کلیاں پھر شگفتہ ہو گئیں“، امیر نے اپنے میگزین سے تمام انگریزوں کو برطرف کر دیا۔ جو پہلا قدم تھا۔ لیکن فرنگی سامراج بھی اپنی کارستانیوں سے غافل نہ رہا۔ اس نے ایک بڑے پیر صاحب کو ہمنوا بنا لیا جسکے امیر بھی معتقد تھے۔ امیر نے دعائے خیر کے لئے اس حملہ کا ذکر کیا انھوں نے جواب دیا کہ تین دن استخارہ کے بعد بتاؤں گا۔ چوتھے روز بتایا کہ ہندوستان پر حملہ افغانستان کی تباہی کا سبب ہو گا“ (بحوالہ مشاہدات کابل ص ۳۶)

بہر حال جس دن ٹھل پر قبضہ ہوا اُسی شام کو کابل سے امیر امان اللہ کا فرمان

پہونچاکر انگریزوں سے (۲۷ / مئی ۱۹۱۹ء) سمجھوتہ ہو گیا۔ اور برطانیہ نے افغانستان کی خود مختاری کو تسلیم کر لیا ہے۔ بہر حال امیر امان اللہ کی اس عجلت بازی نے افغانستان کو ضرور نفع پہونچایا جس کا کریڈٹ حکومتِ موقتہ کو ملتا ہے۔ لیکن ہندوستان کی آزادی کے تمام منصوبوں پر پانی پھر گیا۔ جب دوبارہ ہندوستان پر حملہ کے لئے مولانا برکت اللہ کابل پہونچے اور امیر کو روسی امداد کا یقین بھی دلایا تو امیر اس مہم کے لئے آمادہ نہ ہو سکے اور ہمت ہار دی۔ یہ واقعہ موسم خزاں ۱۹۲۰ء کا ہے۔

آزاد قبائل کی اسکیم:۔ جب افغانی حملہ کی اسکیم بھی شرمندہ عمل نہ ہو سکی اور یہ عظیم منصوبہ بھی ناکام ثابت ہوا تو مولانا کے زرخیز دماغ اور انقلاب انگیز ذہن نے آزاد قبائل کو مرکز بنا کر آزادیٔ ہند کا پروگرام شروع کرنے کی تجویز پیش کی اور اس کے لئے ایک اخبار کو آرگن بنایا جانا طے پایا۔ چنانچہ یہ خفیہ کام خان اکبر خاں اور محمد علی جیسے جانفروش ہندوستانیوں کے سپرد کیا گیا۔ لیکن اکبر خاں کی گرفتاری و دستیابی سے یہ اسکیم بھی ناتمام رہی۔ اگرچہ اکبر خاں پھر بھی اپنی پارٹی کو جیل سے خفیہ ہدایات بھیجتے رہے۔ جب افغانی حملہ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور آزاد قبائل کے ذریعہ آزادیٔ ہند کی کوششوں پر پانی پھر گیا تو مولانا برکت اللہ بھوپالی افغانستان کو خیر باد کہہ کر روس چلے گئے۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی سوویت روس میں ۱۹۱۹ء

۱۹۱۸ء کا سال اتحادیوں کے لئے عالم گیر فتح کا پیغام لے کر آیا۔ ہندوستان کے جلاوطن آزادی خواہ انقلابیوں کا ایک سہارا ٹوٹ گیا اس وقت کی دو عظیم طاقتوں ترک و جرمن کا اس ناگہانی شکست سے شیرازہ بکھر گیا۔ ہندوستان کی آزادی کے لئے ان انقلابیوں نے جو ذہنی خاکے تیار کئے تھے۔ وہ ہوا میں اڑ گئے۔

ایسے حالات میں بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ گئے۔ بہت سے شیر دل

وپر حوصلہ محب وطن ناامیدیوں کے سمندر میں ڈوب گئے۔ مولانا برکت اللہ جیسے انقلابی انسان کے لئے یہ سخت آزمائش کا مرحلہ اور زبردست کشمکش کا دور تھا۔ برطانیہ کی جس جابر و ظالم حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے انھوں نے سر دھڑ کی بازی لگادی تھی ان سب کوششوں پر پانی پھرتے ہوئے اور انگریزی پرچم کو پہلے سے زیادہ وسیع رقبہ پر لہراتے ہوئے دیکھ کر سینہ پر سانپ لوٹ گیا۔ لیکن جو مردانِ کار ایک عظیم مقصد کے عشق میں قربانیوں کے خارزار میں قدم رکھتے ہیں ان کے لئے راستہ کے یہ کانٹے پھول بن جاتے ہیں اور خستہ پاؤں کا ہر آبلہ چراغِ راہ۔ ان کی انقلابی فطرت شکست کو کبھی قبول نہیں کرتی۔ وہ مایوسیوں کے آگے کبھی ہتھیار نہیں ڈالتے ناامیدیوں کے اندھیروں میں مستقبل کی صبح امید انکو دمکتی ہوئی دکھائی دیتی اور ناکامیوں کے پس پردہ کامیابی کا چہرہ ہنستا ہوا نظر آتا ہے۔

ایک تازہ عزم اور نئے حوصلہ کے ساتھ مولانا برکت اللہ بھوپالی نے زندگی کے اس نئے موڑ پر اپنی سرگرمیوں کے قافلے کا رُخ بدل دیا۔ چوں کہ بقول صدیقی صاحب افغانستان کی سیاسی ہوا میں مولانا کا اب دم گھٹنے لگا تھا۔ جو شخص دنیا کی سیاست میں حصّہ لے چکا ہو اس کے لئے ہمالیہ اور ہندوکش کے درمیان کی گھاٹیاں بہت تنگ تھیں آخر افغانستان کو الوداع کہہ کر ماسکو پہونچ گئے۔ اگر کابل میں ٹھہرتے تو ان کا بھی وہی حشر ہوتا جو مولانا سندھی اور اُن کے ساتھیوں کا ہوا۔ اس وقت کے بین الاقوامی حالات عالمی سیاسی تغیرات اور جنگ عظیم کے نتیجہ میں جو نئے انقلابی رجحانات پیدا ہو چکے تھے اس کے لئے نیا لائحہ عمل تجویز کرنے کی ضرورت تھی۔ اس لئے مولانا کی نظر روس پر پڑی۔ جو اتحادیوں کا زارِ روس کا ملک نہ تھا۔ وہ ایک نئے انقلاب ایک نئے دور کا نقیب بن کر پردۂ دنیا پر نمودار ہوا تھا۔

۲۷ / فروری ۱۹۱۷ء کی شام کو زار شاہی کا جنازہ اس سرزمین سے نکالا جا چکا تھا۔ اور ملک میں دو انقلابی جماعتیں بولشویک کرنسکی وزیر اعظم کی قیادت میں حکومت قائم کی جس کا تختہ کامریڈ لینن اور کامریڈ ٹروٹسکی نے ۷/ نومبر ۱۹۱۷ء کو الٹ دیا اور پیٹروگراڈ کی بجائے ماسکو کو ملک کی راجدھانی بنایا۔ اس عوامی انقلاب

نے صدیوں کے دبے، پسے، فاقہ کش بھوکے ننگے عوام کو دونوں وقت کھانے کو روٹی اور تن کو پہننے کو کپڑا اور رہنے کے لئے ٹھکانا مہیا کیا۔ جو روسی عوام کیلئے نعمت غیر مترقبہ تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے عوام کی اصلی دولت (محنت) کی حقیقی قیمت کا سب سے پہلے اقتصادی نکتہ پیدا کر کے مارکس نے اس کو عملی جامہ پہنا کر مغرب کی سرمایہ داری کی چولیں ہلا دیں اور اس کے نوآبادیاتی نظام کی جڑوں پر کلہاڑی چلا دی۔ ایشیائی ملکوں خصوصیت سے ہندوستان کی غلامی دراصل فرنگی سامراج کی اقتصادی منافع خوری کی بنیادوں پر تھی۔ ایک طرف برطانوی سامراج نے ہندوستان جیسے زرعی ملک کو بندوبست آراضی کی ایسی زنجیروں میں جکڑ بند کیا کہ زمینداروں جاگیرداروں اور ساہوکاروں کو ہندوستانی کسانوں پر مسلط کر دیا کہ وہ ان کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر اپنے عشرت کدوں کو سجائیں۔ اور دوسری طرف پرانے اہل ہنر پر اور گھریلو صنعتوں پر ایسی پابندیاں عائد کیں اور سستا خام مال لے کر انگلستان کے کارخانوں سے اس کی مصنوعات بنا کر اور کم داموں میں بیچکر ہندوستان کی قدیم دستکاریوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ انگریزوں نے اپنے حمایتی نئے طبقوں کو جنم دیا راجہ، مہاراجہ، نواب، رئیس، سیٹھ، ساہوکار اور زمیندار و تعلق دار۔ اس لئے اب محاذ جنگ بھی بدل گیا۔ اور عوامی جدوجہد کے طریقے بھی تبدیل ہو گئے۔

چنانچہ خود ہندوستان میں بہادر سنتھالی کسانوں بنگال کے تیل کے کارخانوں کے مزدوروں نے ۱۸۶۰ء میں مکمل کامیاب ہڑتال کی تھی۔ موپلا کسانوں کی بغاوت جو بار بار ۱۸۹۶ء تک ہوتی رہی اور بنگالی کسانوں کی بغاوت ۷۶-۱۸۷۵ء فرائضی تحریک کے ذریعہ اصل حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ روس اس انقلاب کے بعد دنیا کے غریب عوام کا نجات دہندہ بن کر نمایاں ہوا اس لئے دنیا بھر کے انقلابیوں کا مرکز بن گیا۔ ۱۹۱۸ء سوویت روس کے انقلاب کی کامیابی کا افتتاحی دور تھا۔ انقلاب کی اچانک کامیابی نے جس کا کوئی نشان و گمان تک نہ تھا۔ عزائم کو بلند کر رکھا تھا۔ بین الاقوامی انقلاب کی امیدیں روسی رہنماؤں کے ذہنوں میں

پرورش پا رہی تھیں۔ روسی خزانہ کا منہ ہر ایک کے لئے کھلا ہوا تھا۔ اس لئے اس گنگا میں نہانے اور مالی امداد حاصل کرنے کے لئے دنیا کے ہر خطے کے روس نواز لیڈر اکھٹے ہو گئے تھے۔ مولانا برکت اللہ کو آزادیٔ ہند کے لئے اپنے مشن کی تکمیل کے لئے روسی انقلاب ناکامیوں کے اندھیروں میں صبح کا ستارہ بن کر نمودار ہوا۔ جب مولانا برکت اللہ بھوپالی دوبارہ ۱۹۱۹ء میں روس پہونچے تو ان کی انقلاب پسندی کی وجہ سے گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ موسیولینن اور روسی لیڈروں سے مختلف اوقات میں ملاقاتوں اور باہمی تبادلہ خیالات نے ان کے لئے خوش آئند توقعات کا دروازہ کھول دیا۔ ان کو روس کی انقلابی حکومت آزادیٔ ہند کی کامیابی کیلئے آخری امید گاہ نظر آئی۔ مولانا کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی، جس کے اوراق مغربی سامراجیوں کے معرکہ آرائیوں کے واقعات سے معمور اور روشن تھے، چنانچہ مولانا کی صداقت پرستی اور انقلاب پسندی کا گہرا نقش موسیولینن کے دل پر ثبت ہوا۔ اسی طرح خود مولانا برکت اللہ بھوپالی نے موسیولینن کے خطوط پیشانی سے اس کے انقلابی حوصلوں اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف اس کے بلند عزائم کو پڑھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے ایشیا کے مسلمانوں کے متعلق سوویت روس کی پالیسی کو سراہتے ہوئے ایک مضمون ۱۹۱۹ء میں تحریر کیا تھا کہ:۔

روس کے افق پر بنی نوع کی آزادی کا سویرا طلوع ہو رہا ہے۔ عالم انسانیت کی مسرت آگیں دن کی بشارت دینے والا سورج لینن ہیں، اس موقع پر مولانا برکت اللہ بھوپالی نے اپنے ایک بیان جو ترکی زبان میں مسلمانان عالم کو دعوتِ جہاد کے نام سے جاری کیا گیا۔ جس کا متن درج ذیل ہے۔

"اے سخنورانِ دین واسلام! انگلستان وفرانس، جرمن جہانگیری اور ہوس ملک گیری اور امریکہ جو سرمایہ داری کے گڑھ ہیں۔ انھوں نے باہمی سازش کر کے دولت عثمانیہ کو تباہ وبرباد کر ڈالا۔ اور اس کی دولت وثروت کو لوٹ لیا۔ جو عالم اسلامی کا دارالخلافہ تھا اس کو مٹا ڈالا۔ اور مسلمانوں کے قابل احترام مقدس

مقامات مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بیت المقدس، بغداد، نجف شرف، کاظمین کربلائے معلیٰ معصومہ قم مشہد مقدس اور استانبول کے تمام متبرک دینی مقامات جلا کر خاکستر اور تودہ خاک بنا ڈالا، ایران، ہندوستان اور مصر کے مسلمانوں کا عبادت کرنا اور فرائض دینی انجام دینا نہ صرف دشوار و مشکل بلکہ ناممکن کر دیا ہے۔ اور جب کہ ترکستان اور روس کے علاقوں میں مسلمانوں کو وہ تمام آسانیاں حاصل اور سہولتیں فراہم ہیں جس نے زار شاہی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اور وہ مسلم ممالک اور عالم اسلام کی جانب دوستی و ہمدردی کے جذبات و خیالات رکھتا ہے۔ فرانس و انگلستان اور امریکہ مفت دولت و ثروت کے اور سرمایہ داری کی ہوس کاری میں گرفتار ہیں اور دنیا کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں، جب کہ روس میں بسنے والے مسلمان چین و سکون سے رہتے ہیں اور خوش حال ہیں۔ اے مسلمانو! امریکہ انگلستان و فرانس کی حکومتوں کے کسی قول و قرار کا اعتبار نہ کرنا، عثمانی حکومت، ایران و افغانستان کے ملکوں کی تقسیم اور استانبول پر قبضہ و تصرف سے ان کی دغابازی و مکاری صاف ظاہر ہے۔ سابق زار شاہی اور کرنسکی حکومتوں پر برطانیہ و فرانس نے کیا خفیہ معاہدہ کر رکھا تھا لیکن وہ بہادر قائد لینن ہے، جس نے اس زار شاہی حکومت اور کرنسکی حکومت اور اس کے مکار و حریص ساتھیوں کے فسق و فجور کی سازش کا پردہ فاش کیا اور بھانڈا پھوڑ کر رکھ دیا۔ اور اس معاہدہ کو شائع کر کے سارے مسلمانوں پر آشکارا کر دیا ہے۔ اب قائد لینن نے اس سابق روس شاہی حکومت اور کرنسکی کے حکومت کے فسق و فجور کو باطل قرار دیکر خاتمہ کر دیا ہے اور روس میں عوامی حکومت کا قیام عمل میں آنے کے بعد عوام کو دائمی نجات اور ہر قسم کی آزادی نصیب ہو گئی۔

اے برادران اسلام اب جملہ مسلمانوں کا فرض ہے اور ان پر واجب ہے کہ وہ روسیوں کی مثال سامنے رکھ کر سب مل کر اور متحد ہو کر اٹھیں اور ہجوم کر کے ترکی کا ایران اور افغانستان کے رہنے والے مسلمان شامل ہو کر اس سامراجی

اقتدار پر حملہ بول کر اس کا خاتمہ کر دیں تاکہ ان کی ہوس ملک گیری اور استحصال دولت اور پنجہ استبداد سے نجات حاصل کر سکیں اور چین وسکون نصیب اور فارغ البالی و خوش حالی کی مسرت حاصل ہو۔ والسلام علی من اتبع الہدی

الشیخ محمد برکت اللہ

مولانا برکت اللہ بھوپالی نے اپنے بیان میں اس وقت جب کہ اتحادیوں نے ترکی خلافت اور عالم اسلامی کے حصے بخرے کرنے کا معاہدہ کر رکھا تھا اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مولانا کے نزدیک روس کی انقلابی حکومت آزادیٔ ہند کے لئے آخری امید گاہ تھی، وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رح کے اس نظریہ کے قائل تھے کہ انگریزوں کے نکالنے کے لئے برادرانِ وطن تو کیا اگر گدھوں کتوں سے اشتراک ضروری ہو تو ان سے اشتراک کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان کی غلامی کی زنجیر سے آدھے ایشیا کی غلامی بندھی ہوتی ہے۔ اس زنجیر کے ٹوٹ جانے سے پورا ایشیا اور اسلامی ممالک آزاد ہو جائیں گے۔

بہر حال جب مولانا ماسکو پہونچے تو سب ہندوستانی آزادی کے خواہاں جلا وطن لیڈر وہاں موجود تھے۔ جن میں ہر ایک اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ الاپ رہا تھا مقصد کے اشتراک کے باوجود اغراض کے اختلاف نے ان کو تین گروپوں میں بانٹ دیا تھا۔ باہمی رسہ کشی جاری تھی۔ وہ تین گروپ یہ تھے۔

(۱) ایم این رائے، مکرجی، شفیق ڈاکٹر وغیرہ (۲) مولوی عبد الرب جنکے ساتھ لاہور کے مہاجر طلبہ تھے (۳) عبد الوحید چٹو پادھیا اچاریہ کنکھوجی وغیرہ۔ مولانا برکت اللہ ڈاکٹر منصور کے ساتھ جو کسی گروپ سے تعلق نہیں رکھتے تھے مسلسل ہفتوں ان سب کو ایک سلسلہ میں جوڑنے کی سعی کرتے رہے۔ لیکن اختلاف کی گرہ نہ کھل سکی بقول رفیق بھائی چٹو پادھیا گروپ کی یہ ضد تھی کہ برلن پارٹی کی حساب فہمی کرائی جائے۔ ایم۔ این۔ رائے اس کے لئے قطعاً تیار نہ تھے۔ غرض یہ سب

بہانہ بازی تھی۔ مولانا کی انقلاب پسندی نیک نیتی اور سیاست دانی کا ہر طبقہ کو اعتراف تھا۔ ہر ایک مشورہ کے لئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اصابت رائے کا پائیدار نقش دل لیکر واپس ہوتا چونکہ مولانا کی زندگی قلندرانہ تھی وہ کسی کے پاس ذاتی غرض لے کر کبھی نہیں گئے۔ لیکن دراصل یہ لڑائی اقتدار پرستی کی لڑائی تھی۔ اس جنگ زرگری کو ختم کرنا مولانا کی نیک نیتی و صلح پسندی کے دائرے سے باہر تھا۔ چنانچہ ایک پارٹی برلن چلی گئی۔ جب ہندوستان کے ان جھگڑوں سے فرصت ملی تو ایرانی لیڈروں کے جھگڑے کیطرف توجہ دی۔ ایک پارٹی کے لیڈر احسان اللہ خاں تھے۔ جو لمبے لمبے بال مقطع داڑھی والے بلند قامت درویش صفت انسان تھے دوسری پارٹی کے لیڈر رضا نو خاں مارشل ٹائپ کے تھے۔ مولانا نے ثالث بن کر اِن دونوں لیڈروں کو سمجھا بجھا کر گلے ملوایا۔ ہندوستان وایران وغیرہ کے سیاسی رہنماؤں کا ماسکو میں یہ اجتماع درحقیقت تھر انٹرنیشنل پہلی کامنٹرل

دجس کا مارچ ۱۹۱۹ء کانگریس کا قیام ہوا) کے اجلاس میں شرکت کے لئے ہوا تھا۔ ہر ایک خود کو اپنے اپنے ملک کا نمائندہ قرار دیتا تھا۔

نے ہندوستانی مندوب کی حیثیت سے ماسکو میں منعقدہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کی دوسری کانگریس میں شرکت کی تھی۔ اچاریہ جی کے ساتھ ہندوستان کے بنگالی مندوب ربانی مکرجی نے کانگریس میں شرکت کی تھی۔ اور مکرجی نے ہندوستان کے سیاسی وعوامی مسائل پر لینن کے ساتھ دو کتابیں تصنیف کی تھیں۔

برکت اللہ بھوپالی اور لینن کی ملاقات

مولانا برکت اللہ بھوپالی کی روسی دستاویز کی روشنی میں ۷ رمئی ۱۹۱۹ء کامریڈ لینن سے ملاقات کا ذکر ہے۔ جس کے اندر دوران گفتگو میں مشرق وسطیٰ ممالک کے اس وقت کے حالات اور افغانستان کی امداد و تعاون کے امکانات جو برطانوی استعمار سے برسرِ پیکار تھا بات چیت ہوئی۔ پھر اوائل ماہ جون اسی کامریڈ وی۔ لینن نے ایک نوٹ لکھ کر مسٹر جی۔ وی۔ جیمرین کے نام جو اس وقت روس کے وزیر خارجہ تھے، ہدایت کی تھی کہ اس معاملہ میں بھرپور امداد کریں کہ وہ اپنا ایک مضمون مولانا برکت اللہ بھوپالی نے اسکی کوشش کی تھی کہ" وہ بالشویک تحریک کے مفہوم و مقاصد کی صحیح ترجمانی کر کے مسلمانوں کو سمجھا سکیں۔ اور اس کو برطانوی سامراج کے خلاف ایک زبردست تحریک کا ذریعہ بنا سکیں"

راجہ صاحب نے اس ملاقات کا اس طرح تذکرہ کیا ہے۔ "موسم بہار میں ۱۹۱۹ء مجھے ماسکو کی اجازت مل گئی۔ میں حکومت کا مہمان تھا۔ یہاں پہنچکر مجھے میرے وزیر اعظم مولانا برکت اللہ بھوپالی مل گئے، جو پہلے سے آکر اچھی طرح جم گئے تھے اور انہوں نے بہت اچھے تعلقات پیدا کر لئے تھے اور رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ وہ بھی حکومت کے مہمان تھے۔ ہم اکٹھے ایک عمارت میں جو ایک شکر ساز بادشناہ کا محل تھا، ٹھہرے۔ روس کے وزیر اعظم اور اختیارات کلی کے مالک رہنما کامریڈ لینن کریملن میں ملاقات کا دن مقرر ہو گیا۔ دفتر خارجہ کے پروفیسر وزینا کی ہم کو کریملن لے گئے۔ میرے ہمراہ مولانا برکت اللہ، مولوی عبد الرب، مسٹر آچاریہ، مسٹر دلیپ سنگھ گل اور (مولانا کا) ملازم ابراہیم تھے۔ ہم بالائی منزل کے وسیع ہال میں داخل ہوئے، لینن سامنے بیٹھے تھے، ہم کو دیکھتے ہی وہ فوراً کھڑے ہو گئے، اور نہایت پھرتی سے

ایک کونے میں جاکر ایک چھوٹی سی کرسی اٹھالائے۔ اور اس کرسی کے قریب رکھدی۔ اس اثنار میں ہم اُن کے قریب ہوگئے۔ انھوں نے ہم سے بیٹھنے کی درخواست کی لیکن ایک لمحہ کے لئے میں رُکا کہ میں کس کرسی پر بیٹھوں۔ جس کو وہ اٹھاکر لائے تھے لیکن جلد ہی فیصلہ کرلیا۔ اور اسی کرسی پر بیٹھ گیا جس کو وہ اٹھا کر لائے تھے۔ اور میرے ساتھی بڑی بڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ لیکن پروفیسر درمیان میں ہی کھڑے رہے اور ابراہیم بھی۔ لینن نے انگریزی میں مجھ سے سوال کیا کہ میں آپ سے کس زبان میں گفتگو کروں۔ آیا جرمن، فرنچ یا روسی زبان میں۔ میں نے کہا اس قدر بہتر اور نفیس انگریزی بولتے ہیں۔ لہٰذا ہم انگریزی میں بات چیت کریں۔ میں نے کہا۔ قدرت ان کو محنت کشوں کی خدمت گذاری کے لئے استعمال کر رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ان کا خیال ہے۔ میں نے اپنی احتیاسی سکے جاری کرنے والی تجویز اُن کے سامنے پیش کی۔ کہ گورنمنٹ کو چاہیئے کہ وہ گیہوں، چاول، مکھن، کوئلہ وغیرہ کے نوٹ چھاپے اور چاندی، سونے کے سکوں کی بجائے رائج کیا جائے۔ انھوں نے فرمایا میں اس پر غور کروں گا۔ اس کے بعد دوسرے احباب کی طرف مخاطب ہوئے وہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ کون ہیں؟ اور کیا ہیں؟ پروفیسر وزینا کی نے انھیں کچھ سمجھایا، انھوں نے ہم سب سے ایک ایک دو دو سوالات کئے۔ جب انہوں نے ابراہیم سے سوال کیا تو اس نے روسی زبان میں جواب دیا۔ لینن اس کی ٹوٹی پھوٹی روسی زبان سُن کر بے حد خوش ہوئے، اور بڑی مسرت سے کہا۔ "اور تم روسی زبان بول لیتے ہو"۔ ہم تقریباً بیس منٹ تک کامریڈ لینن کے پاس ٹھہرے۔ اور رخصت کے وقت انہوں نے ہر ایک سے مصافحہ کیا پھر ہم چلے آئے۔

مضمون نگار نے اپنے مضمون کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ مئی ۱۹۱۹ء اخبار ازوستیا نے ایک مختصر خبر یہ شائع کی کہ "اس ملاقات میں برکت اللہ نے لینن کو افغان حکومت کی غیر سرکاری یہ پیغام پہنچایا تھا کہ وہ برطانوی سامراج خلاف افغانی جدوجہد میں امداد کریں"۔

مولانا برکت اللہ آزادی ہند کے جس مشن پر نکلے تھے حکومتِ موقتہ ہند کے ذریعہ جب زار روس کو وفد بھیجا گیا تھا تو اس نے ان سفیروں کو برطانیہ کے سپرد کر کے اپنی کم مائیگی

اور حرص پسندی، و پست اخلاقی کا ثبوت دیا تھا۔ لیکن انقلاب ۱۹۱۷ء میں سامراجی طاقتوں کے برخلاف سوویت یونین نے تمام مظلوموں، محکوموں کی آزادی و برابری کا اعلان کر کے مولانا کے دل میں ایک نئی امنگ پیدا کر دی۔ فرنگی سامراج کے خلاف روس کے دعوتِ تعاون نے مولانا کے اندر نئے جوش و خروش کو ابھارا اور وہ کامریڈ لینن کی دعوت پر برطانیہ و فرانس کی ہوس ملک گیری اور مشرق وسطیٰ، شمالی افریقہ و ایشیا کے مسلم ممالک پر ان کے غاصبانہ تسلّط اور امریکی سرمایہ داری کے تباہ کن نتائج کا باعث قرار دیتے ہوئے ایک بیان کے ذریعہ ترکی زبان میں دعوت جہاد کے نام سے شائع کیا۔ اس بیان میں جس خفیہ معاہدہ کا اشارہ ہے وہ سالکسی سکوریکیف ۱۹۱۶ء ہے۔ جو انگلستان و فرانس اور زار شاہی روس کے درمیان ہوا تھا کہ ترکوں پر فتح حاصل ہو جانے کے بعد فرانس کو یہ حق ہو گا کہ وہ شام کا علاقہ اپنے قبضہ میں لے گا۔ اور برطانیہ فلسطین وغیرہ کا عرب علاقہ پر اپنا تصرّف رکھے گا۔ انقلاب روس میں زار کے محل شاہی کے دستاویزات میں یہ خفیہ معاہدہ بعبکوں کے ہاتھ لگا۔ اور لینن نے اس کو شائع کر دیا۔ ترکی حکومت نے اس کی نقل عربی و ترکی میں طبع کرا کے مشتہر کیا۔ جس کی وجہ سے عربوں کے جذبات انگریزوں کے خلاف بھڑک اٹھے۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ عربوں کو اس کا خمیازہ تقسیم فلسطین کی شکل میں بھگتنا پڑا۔ اور اسرائیل کا بچھڑا ان پر مسلط کر دیا گیا۔ جو عربوں کی سیاست کے سینہ کا رِستا ہوا ناسُور رہے۔

ماسکو میں ایشیائی آزادی کانگریس ۱۹۱۹ء میں مولانا کی شرکت

ماسکو میں دسمبر ۱۹۱۹ء میں ایک کانگریس منعقد ہوئی۔ جس کا مقصد اتحاد برائے آزادی ایشیا تھا۔ برطانوی سامراج سے ایشیائی ملکوں کو آزاد کرانے پر غور و خوض کیا گیا۔ جو ,,یونین فار دی فری ڈم آف دی اورینٹ،، کے نام سے موسوم ہوئی۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی نے اپنے خیالات ہندوستان ایمان پر کہکر انقلابیوں کے سامنے پیش کیا۔ جس سے مولانا پہلے سے واقف تھے۔ اسی طرح دسمبر ۱۹۲۰ء میں باکو میں ایک مشرق کے محب وطن ملکوں کی کانگریس کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس میں مولانا برکت اللہ بھوپالی اور دوسرے ایشیائی لیڈروں نے شرکت کی سوویت یونین کے اسماعیل حقی، سلمان نوری، پاشا الدین شاکی شریک تھے۔ اس کا مرکز باکو قرار دیا ایک شاخ تاشقند میں قائم کی گئی اتحاد میں کی تجویز کو مسترد کر دیا گیا۔

کامریڈ لینن کو مولانا برکت اللہ بھوپالی نے خصوصی تحفہ راجہ صاحب کے لئے صندل کی چھڑی پیش کی تھی۔ لینن نے ۲۳/ نومبر ۱۹۱۸ء کو کریملن میں اس ہندوستانی وفد سے ملاقات کی جو روس سے ہندوستان کی جد و جہد آزادی میں امداد کے لئے گیا تھا۔ جس کے اندر محمد ہادی آل روس سینٹرل کمیٹی کے سامنے ۲۵/ نومبر ۱۹۱۸ء کو ہندوستانی عوام کی روسی عوام کے نام پیغام سنایا۔ ہادی اور احمد حارث کے نام غالباً فرضی ہیں جو برطانوی سراغرسانہ کو دھوکے میں رکھنے کے لئے لیا تھا۔ (پیغام رسانی ص ۱۸)

۱۹۲۰ء کے دوران مولوی عبدالرب نے کریملن میں لینن سے ملاقات کی تھی اس ملاقات کے ایک سال بعد پرتی وادی آچاریہ نے ہندوستانی مندوب کی حیثیت سے کمونسٹ انٹرنیشنل کی دوسری کانگریس میں شرکت کی تھی۔ آچاریہ کے

ساتھ ایک دوسرے مندوب بنگال کے مندوب کے ایا تی مکرجی بھی کانگریس میں شریک ہوئے تھے۔ انھوں نے روس میں اپنے ہم وطنوں کی زندگی اور انکی جدوجہد پر بے شمار مضامین لکھے اور لکچر دیئے۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی اور روسی ترکستانی بغاوت

مولانا برکت اللہ بھوپالیؒ کی روس کی آمد کا بنیادی مقصد افغانستان کی ہندوستان پر حملہ کے وقت روسی امداد کا تھا۔ جس کے اندر وہ کامیاب ہوئے لیکن امیر کابل کی جلد بازی نے اس کو ناکام بنادیا۔ موسیولینن سے مولانا کی ملاقات نے روسی لیڈر کے دل میں ان کی سیاست وعظمت کا نقش دل میں بٹھادیا اس لئے اس نے ترکستان کی بغاوت کے فرو کرنے میں مولانا کا تعاون حاصل کرنا چاہا چونکہ یورپ کی نوآبادیاتی نظام اور مغربی سامراج کے خلاف روس کا رویہ مشرقی اقوام کے حق میں ہمدردانہ وموافقانہ تھا۔ اور وہ غلام اقوام کی آزادی کا حامی بن کر ابھرا تھا۔ اس لئے مولانا نے ترکستانی بغاوت کے فرو کرنے میں اس سے ہاتھ ملایا۔

مولانا برکت اللہ جب روس میں تھے تو ترکستان میں بغاوت کے شعلے پھوٹ پڑے۔ چنانچہ مولانا کو تاشقند روانہ کیا گیا۔ جہاں ایک طرف انھوں نے ترکستان کے لیڈروں سے رابطہ قائم کیا، اور دوسری طرف عوام سے تعلق بنائے رکھنے کے لئے پریس اور پلیٹ فارم دونوں کو استعمال کیا۔ ادھر روس نے فوجی طاقت سے بغاوتوں کو دبادیا، جس کے نتیجہ میں وہ طوفان فرو ہوگیا۔ البتہ فرغنہ، ایدعان کوقند میں بغاوتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ جو بخارا تک پھیلا ہوا تھا۔ ادھر بلقان میں انگریزوں کے اشارہ پر ترکی ویونانی حکومتیں باہم دست وگریباں ہورہی تھیں۔ اور خلیل پاشا امدادی مشن کے ساتھ تاشقند میں مقیم تھے۔ مشن کی کامیابی کی صورت نظر نہ آتی تھی، اس گفتگو کے لئے ماسکو پہونچے اور فرغنہ کے کام کو چھوڑ دیا، روسی رہنماؤں سے مل کر اپنے مشن میں کامیاب ہوکر

واپس ہوئے۔ جب موسم سرما ۱۹۲۱ء تھا تو دوبارہ ماسکو ایک پروگرام کے تحت پہونچ گئے۔ جہاں غازی انور پاشا اور روسی لیڈروں کے درمیان طے پایا کہ پہلے بخارا اور فرغنہ کی بغاوتوں کو دبایا جائے اور پھر انھیں قبائل کے رضا کاروں کو لے کر ہندوستانی سرحد کی طرف مارچ کیا جائے۔ اور قبائلیوں کی رہنمائی میں گوریلا جنگ شروع کر دی جائے۔ اس جنگ میں روس پوری مدد کرے گا۔ چنانچہ انور پاشا کی پارٹی کی فوجیں جو ماسکو میں مختلف مقامات سے آکر اکھٹا ہو گئی تھیں۔ اُن میں سے فوجی افسروں کو بخارا بھیج دیا گیا تاکہ وہ بخارا کی فوجوں کو جدید نظم سے مسلح کر دیں۔ موسم سرما گذرنے پر انور پاشا بخارا بھیج دیئے گئے۔ اور ایک ہفتہ مقیم رہے۔ ایک پہلے سے طے شدہ اسکیم کے تحت بخارا کی فوجوں کو سرداروں سمیت راتوں رات فرار ہو کر باغیوں میں شامل ہو کر اس شدت کے ساتھ حملہ کیا کہ ترکستانی روسی حکومت کی چولیں ہل گئیں۔ بغاوت کی آگ سب مقامات پر بھڑک اٹھی۔ چوں کہ ۱۶/ مارچ ۱۹۲۰ء کو باغیوں نے غازی مصطفیٰ پاشا کی جمہوریہ ترکیہ کو تسلیم کر لیا۔ اس لئے انور پاشا نے طے شدہ پروگرام کے برخلاف امیر بخارا سے مل کر وسط ایشیا میں ایک اسلامی حکومت کے قیام کا منصوبہ تجویز کیا اور "دنیا کے محنت کشو ایک ہو جاؤ" روسی نعرہ کی بجائے "مسلمانان عالم متحد ہو جاؤ"، پیغام سب کو دیا، ازبک، قازق، کرغیز قبائل روسیوں سے اس وقت برسر پیکار تھے۔ اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ مولانا برکت اللہؒ تاشقند پہونچے اور برطانوی سامراج کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تلقین کی جس نے مسلم ممالک کو غلام بنا رکھا تھا۔ لیکن انور پاشا اتاترک دشمنی سے اس بات کو قبول کرنے کا موقع نہیں دیا۔ بگڑے ہوئے حالات نہ درست ہو سکے اور نہ خیالات میں کوئی تبدیلی ہو سکی ایک سخت گھمسان کی جنگ میں ۵/ اگست ۱۹۲۲ء کو شہید ہو گئے۔ اور بغاوت ناکام ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اختلافات کو ہوا نہ دی جاتی اور بخارا کے سردار منظم ہو کر متحدہ محاذ بنانے میں

کامیاب ہوتے تو نقشہ بدلا ہوا ہوتا۔ مگر انور پاشا کی اس کارروائی سے مولانا کے اعتماد جو روسی زعماء کے نظروں میں متزلزل ہو گیا۔ مولانا کے دل و دماغ پر اس سانحہ سے گہرا اثر پڑا۔ روسی امداد سے آزادئ ہند کا خیالی قلعہ ڈھ گیا اور وہ بجھ سے گئے۔

ایرانی مرکز کی اسکیم

افغانی حملہ، قبائلی تنظیم کے ذریعہ فرنگی سامراج سے جنگ کے جب سارے منصوبے نقش بر آب ثابت ہوئے تو مولانا کے نہ شکست کھانے والے عزم و حوصلہ نے ایک اور نئی اسکیم کا خاکہ تیار کیا کہ ایران کو مرکز بنا کر ہندوستان میں انقلابی لٹریچر بھیجا جائے۔ اس کے لئے چند جانباز معتمد آزمودہ کار ساتھیوں کو منتخب کیا چنانچہ اس کا پہلا گروپ (جس کے ارکان بھائی رفیق احمد بھوپالی اور حبیب احمد شاہجہاں پوری تھے) تیار کیا گیا۔ اور منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن ابھی مقام اتنزلی (ایران کی چھوٹی بندرگاہ) تک پہونچے تھے کہ خود ایران بغاوت کے لپیٹ میں آگیا اور راستے بند ہو گئے۔ مجبوراً اس گروپ کو واپس ہونا پڑا۔ اس کے بعد پامیر مقستان، رسکاشم، خاروق، چترال و دیر میں چوکیاں قائم کرنے کی اسکیم تیار کی گئی۔ اور گروہ بندی کے ساتھ روانگی طے ہوئی۔ پہلے گروپ میں ایم۔ اے مجید فیروزالدین اور بھائی رفیق بھوپالی و حبیب احمد شاہجہاں پوری تھے۔ اس کے ذمہ یہ کام سپرد تھا کہ اکبر خاں کے چھوڑے ہوئے کام کی تکمیل کی جائے۔ چنانچہ اس پہلے گروپ نے چند پمفلیٹ لیتھو کے روانہ کئے جب بعد کی کھیپ گرفتار ہوئی تو پہلا گروپ بھاگ نکلا۔ اور چترال میں رات میں پکڑا گیا۔ دوسرا گروپ (جو سلطان محمد، فدا علی، عبدالقادر پر مشتمل تھا۔ کچھ افراد سرحد پار کرتے ہوئے افغانی فوج کی گولیوں کے نشانہ بنے جو باقی رہ گئے وہ کوہ ہندوکش سے اترتے

وقت پکڑے گئے۔ جن پر پشاور تاشقند، ماسکو سازش کیس چلایا گیا۔ اور سخت سزائیں دی گئیں ابھی یہ لوگ پچھلی سزا بھگت رہے تھے کہ ان پر دوسرا مقدمہ پرلیس کا کھڑا کر دیا گیا۔ ان میں سے کسی کے خلاف ثبوت فراہم نہ ہو سکا، صرف اکبر خاں کی چند تحریری ہدایات جو اس نے جیل سے ارسال کی تھیں دستیاب ہوئیں۔ اس کی سزا سات سال سے بڑھا کر دس سال کر دی گئی اور چھاپے کے پتھر منتقل کرنے والوں کو پانچ پانچ سال کی سزائیں ہوئیں۔

تیسرا گروپ شوکت عثمانی بھوپالی مسعود علی شاہ اور اس کا دوسرا حصہ اکبر شاہ اور گوہر رحمن کا تھا۔ شوکت عثمانی کانپور میں گرفتار ہوئے۔ پھر پشاور لا کر مقدمہ چلایا گیا۔ پھر جھانسی جیل بھیجدیا گیا۔ مسعود علی خاں راہ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہوئے، اکبر شاہ اور گوہر رحمانی فرینٹیر میں گرفتار ہو کر قید کر دیئے گئے ان گرفتاریوں اور سزایابیوں پر بھی مولانا برکت اللہ بھوپالی کے فولادی عزم و ہمت نے ہار نہ مانی۔ اور ارانی بغاوت فرو ہو جانے پر پھر پیہم دو گروپ روانہ کئے۔ جو جان جوکھم میں ڈال کر منزل مقصود کے لئے روانہ ہوئے۔ اور سزائیں ہوئیں۔ یہاں اس واقعہ کا اظہار ضروری ہے کہ جب ہندوستان کے آزادی خواہ افراد کے لئے افغانستان میں کام کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تو ان میں تعلیم یافتہ طبقہ (مہاجرین) نے حکومت موقتہ کے وزیر داخلہ مولانا عبید اللہ سندھی کی قیادت میں سوویت روس کی طرف رخت سفر باندھا۔ چونکہ روس و افغانستان کے تعلقات استوار ہو چکے تھے۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی کی مساعی بحیثیت سفیر خاص افغانستان، ان دونوں ملکوں سے کے رشتہ اتحاد قائم کرنے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ راجہ مہندر پرتاپ کے ساتھ روسی نمائندہ سوڑتس امیر کابل سے مل کر باہمی دوستی کا پیغام پہونچانے تھے اس لئے مولانا سندھی اپنے بھتیجے، عزیز احمد، خوشی محمد ظفر حسن، ڈاکٹر نور محمد، اقبال شیدائی، عمر ظفر، مسعود، عبد الرشید،——
عبد العزیز اور جفہ اسکول کے ماسٹر سیناتھ بنرجی ۱۵ ر اکتوبر ۱۹۲۲ء کو کابل سے

روانہ ہوئے مزار شریف کے راستہ سے دریائے اموں کو پار کر کے شہر مٹیا سکر (ترمذ) پہونچے۔ چوتھے دن ترکی پہونچنے کا پروگرام تھا لیکن ترکستانی جس کو باہماچی کہا جاتا تھا۔ ان کے حملوں سے بچتے بچتے کرکی (کرسی یا فرنٹ) میں فروکش ہوئے یہاں سے روسی حکومت کے مہمان بن کر رکے۔ بخارا پہونچے۔ یہاں اور مہاجر۔ بن حافظ عبدالمجید فقیر شاہ بھی اس قافلہ میں شامل ہو گئے۔ جب تاشقند پہونچے تو روسی مشرقی یونیورسٹی کا معائنہ کیا جہاں مختلف قوموں کے لوگوں کو کمیونزم کی تعلیم دیکر حقیقتاً دوسرے ملکوں میں کمیونسٹ انقلاب کیلئے تیار کر رہے تھے اور ایک دن یہاں ٹھہر کر ۱۰ر نومبر ۱۹۲۲ء کو ماسکو پہونچے۔ یہاں رحمت علی زکریا خلف بخش آکر مل گئے اور عبدالہادی خاں بھی جو مولانا سندھی کے شاگرد تھے۔ عبدالوارث بھی انھیں لوگوں میں تھے، جو کابل سے ہجرت کر کے اس قافلے مہاجرین کے ساتھ جن کی تعداد اسّی، نوے کے قریب تھی، بڑی مصیبتوں راستہ کی غیر معمولی صعوبتوں کے ساتھ باہماچیوں سے لڑتے بھڑتے ماسکو پہونچے تھے۔ جس کے اندر اکبر خاں ہزاروی فضل اللہ قربان شوکت علی بھوپالی وغیرہ تھے۔ اس قافلہ کے کچھ لوگ کرکی میں ٹھہرے۔ وہاں سے ترکیہ جانے کے لئے بالونگ پہونچے اور اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ جس کے اندر عبدالوارث بھی تھے جو تاشقند واپس ہو کر کابل واپس ہو گئے دوسرا جتھہ تاشقند چلا گیا۔ آپ بیتی از ظفر حسن ص ۱۷-۱۸

کابل سے عبدالوارث کے سوا دوسرے لوگ ہندوستان لوٹ گئے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کچھ عرصہ روس میں قیام کر کے اور اپنے مشن کی تکمیل کا جائزہ لے کر ترکیہ روانہ ہوئے اور مصطفیٰ کی ترکیہ میں ٹھہر کر جوار حرم میں مقیم ہوئے یہاں تک ۱۹۳۸ء طویل جلاوطنی کے بعد اپنے وطن ہندوستان واپس ہوئے اور حکمت ولی اللہی کی اشاعت کا کام بیت الحکمت، جامعہ ملیہ سے کیا۔ لیکن لیگ و کانگریس کی سیاسی کشمکش میں ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی بہر حال ان ہزارہا گمنام مجاہدین کا کیا حشر ہوا خدا ہی کے علم میں ہے۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی

دوبارہ یورپ میں ۱۹۲۲ء

روسی سیاست کی طرف سے دل گرفتہ ہونے کے بعد اور آپس کی خانہ جنگیوں سے تنگ ہو کر مولانا نے روس کو چھوڑا اور ۱۹۲۲ء میں پھر پرانے مرکز برلن کے لئے تیار ہوئے۔ بقول صدیقی صاحب لینن نے مولانا کو روکنے کی بہت کچھ کوشش کی لیکن وہ اس قدر دل برداشتہ ہو چکے تھے کہ پھر نہ رُکے لینن کہا کرتا تھا کہ پروفیسر برکت اللہ کی شخصیت روزانہ کے سیاسی جھگڑوں سے بالاتر ہے ایسے اشخاص کو تو کسی قوم میں، کسی ملک میں موجود ہونا ہی باعث برکت و رحمت ہے لینن مولانا کو اپنے ساتھ رکھ کر وسط ایشیا اور مسلم حکومتوں کے ساتھ روسی سیاست کے لئے مشورہ وہدایت لینا چاہتا تھا۔ روس میں رہ کر مولانا نہ بالشویکی ہوئے اور نہ کمیونسٹ، برسوں کے دیس نکالا کے باوجود سچے ہندوستانی اور پکے مسلمان رہے۔ زندگی بھر کبھی کسی غیر ہندی یا غیر مسلم گروہ یا حکومت سے اپنے لئے ایک پائی تک نہ لی۔ ماسکو میں حکومت مشاہرہ لینا۔ یا کسی

صورت سے مالی امداد لینا اپنی آزادیٔ رائے فروخت کرنا تھا۔ جو مولانا کو کسی طرح گوارا نہ تھا۔ یورپ کی دنیا میں دوبارہ داخل ہو کر اپنے ہندوستانی مسلمان دوستوں سے مل کر ان امیدوں کو پھر سے تازہ کرنا اُن کا مقصد تھا جو خاک میں مل چکی تھیں مستقبل کے لئے از سرِ نو لائحہ عمل تیار کرنا تھا (ارد و ص ۳۹۸) لیکن جب برلن پہونچے تو یہاں کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ برلن کے ہندوستانیوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ جس درخت پر یہ ہندوستانی بیل چڑھانا چاہتے تھے وہ درخت ہی کھوکھلا ہو گیا اور بیل خشک ہو گئی تھی۔ جرمنی کی شکست نے ہندوستانیوں پر برے اثرات مرتب کئے تھے۔ ایک دوسرے کے درپے آزار ہو گئے تھے۔ مولانا ثالث بالخیر بن کر اتحاد و اتفاق قائم کرنے کی پوری کوشش کی لیکن یہ سعی رائیگاں ثابت ہوئی۔ بہرحال برلن کو مرکز بنانے کا خواب بھی شرمندہ تعبیر اس لئے نہ ہو سکا کہ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔ کچھ دن بعد راجہ صاحب بھی برلن پہونچ گئے۔ راجہ صاحب تو جاپان، چین اور تبت کے دورے پر چلے گئے اور مولانا برلن ہی میں رہے۔ (میری کہانی ص ۵۶)

برکت اللہ بھوپالی سوئیزرلینڈ میں ۱۹۲۳ء

برلن کے ہندوستانیوں کی چپقلشوں اور کشمکشوں نے ان کو وہاں سے آزردہ خاطر کر دیا اور اب برلن چھوڑ کر پیرس کو مرکز بنانے کا پروگرام بنایا۔ چونکہ پیرس کی بہت سی خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی رہی کہ اس انقلابی شہر میں جہاں روسو نے حریت کا نعرہ بلند کیا تھا، جہاں عوام نے سب سے پہلے جمہوریت کا پرچم لہرایا، یہاں دنیا بھر کی قومی تحریکیں آکر پناہ گزیں ہوتی تھیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جبکہ اتحادی جنگ عظیم کے فتح کے نتیجہ میں قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے سوئزرلینڈ کے شہر لوزان میں جمع ہو رہے تھے۔ دراصل اُس وقت مغربی سامراج کی صدیوں کی تمنا برآئی تھی یورپ کا وہ کانٹا ہمیشہ ان کی نگاہوں میں کھٹکتا رہتا تھا

اس کو صاف کر دینے اور یورپ کے مردِ بیمار (ترکیہ) کو اس کی آخری منزل (قبر) تک پہونچانے کے لئے یہ کفن چور لوزان میں مل بیٹھے تھے۔ دولت عثمانیہ کو حصے بخرے کرنے کی غرض سے یہ کانفرنس منعقد کی گئی جو نومبر ۱۹۲۲ء سے جولائی ۱۹۲۳ء تک چلتی رہی۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی برلن میں ذیابطس اور دیگر امراض کا شکار ہو گئے تھے لیکن اس مردِ بیمار نے۔ اس معاملے کو سن کر پھر ایک جھرجھری لی اور اس وقت ترکی کے زعماء کے باہمی اختلافات کو دیکھ کر لوزان جا پہونچے چونکہ حکومت ترکیہ کی شکست نے اور اتحادی طاقتوں کے بیجا دباؤ نے ذہنوں میں ایسا خلفشار پیدا کر رکھا تھا کہ وہ خلافت اور سلطنت کے بوجھ اٹھانے کے لئے خود کو عاجز و قاصر پا رہے تھے اس لئے مولانا کو اندیشہ پیدا ہوا کہ وہ کہیں ایسا فیصلہ نہ کر بیٹھیں جو عالم اسلام کے لئے مستقل ہی نقصان دہ ثابت ہو مولانا نے مسئلہ خلافت پر ایک عالمانہ مضمون لکھا۔ جس کو ترکی اور عالم اسلامی کے نمائندوں میں تقسیم کیا۔ جس سے ان کی اسلام دوستی کا ثبوت ملتا ہے۔ مغربی سامراج نے ترکوں اور عربوں کے درمیان جو اختلافات کی خلیج پیدا کی تھی جس کی وجہ سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے تھے۔ اور ہر اک دوسرے کی بات سننے کا روادار نہ تھا۔
مولانا برکت اللہ نے اس خلیج کو کافی حد تک پاٹا۔ اور ترک و عرب کی مفاہمت کا دروازہ کھولا۔ چنانچہ ہاشمی نمائندہ ڈاکٹر نجی الفیصل کا ترکی وزیر خارجہ عصمت انونو ۹ فروری ۱۹۲۳ء کو ملاقات کرا دینا مولانا ہی کی زبردست شخصیت کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ عصمت پاشا ہاشمی نمائندہ کو صیغۂ راز ملاقات کی بجائے سرکاری طور پر شرف ملاقات بخشا اور سابقہ اختلافات کو بھلا کر اسلامی اخوت کے رشتہ کو از سرِ نو تازہ کیا۔ لیکن افسوس ہے کہ ہاشمی نمائندے نے اس راز کو فاش کر دیا۔ اور گورنمنٹ برطانیہ سے سودے بازی کرنا چاہا۔ اس موقع پر وہ مشہور واقعہ پیش آیا کہ لارڈ کرزن، نے صلح کانفرنس کی منبر پر ایک مکا مار کر ترکوں کو چیلنج دیا کہ وہ واضح جواب دیں ورنہ سب کو اختیار ہوگا کہ ترکیہ کا بٹوارہ کر دیں۔ عصمت پاشا نے جو بہرہ سنتے تھے۔ سب

باتیں سن رہے تھے ایک دم آگ بگولہ ہوگئے اور اس منبر پر مسلسل مکا مار کر کہا کہ اگر تم ایک مکا مار سکتے ہو تو میں سو مار سکتا ہوں جب تک ترکی کا ایک متنفس بھی زندہ ہے وہ حصے بخرے نہیں ہونے دیگا۔ چنانچہ برطانیہ کے کرزن کے بجائے سورس ڈبلیو یڈ کو بھیجا اور صلح نامہ لوزآن پر دستخط ہو کر ترکیہ نے اپنے قومی وجود کو دول یورپ سے منوالیا۔ اس دوران مولانا برکت اللہ بھوپالی نے روسی وفد کے قائد جے جے۔ این اور ترکی زعماء سے برابر رابطہ قائم فرماتے رہے اور روسی و ترکیہ کے اختلافی مسائل کو حل کر ناخن فکر سے سلجھاتے رہے۔

خلافت کا خاکہ اور مولانا برکت اللہ بھوپالی ۱۹۲۴ء

اس سے پہلے کہ خلافت کے مسئلہ کی اسلام میں اہمیت و عظمت اور اس کی جلالت کو آشکار کیا جائے اس امر کو ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ ہماری بیسویں صدی جو مادیت و روحانیت کی ابدی معرکہ آرائی میں مادیت کی فتح اور کامرانی کو لیکر آئی۔ جس نے ملت اسلامیہ کو جو ایک ہزار سال سے زائد سے دنیا کی مادی و روحانی قیادت کرتی چلی آرہی تھی، اس کو قیادت و سیادت کے اس بلند مقام سے گرا کر مغربی سامراج کی غلامی اور مغربی شیطانی تہذیب کورانہ تقلید کی پستیوں میں لاکر کھڑا کر دیا۔ اسلام کے روحانی نظام کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا۔ جو اسلامی تہذیب اپنی عالم گیر انسانی قدروں سے فیاضی و فراخ دلی کے ساتھ پورے عالم کے ساتھ پورے عالم کے جیب و دامن کو بھر رہی تھی اور جو تہذیب روحانیت و اخلاق کے بیش بہا جواہرات کو تمام انسانوں میں تقسیم کر رہی تھی اس کے حامل مادی قدروں کے کنکر پتھر کو سمیٹنے لگے اور روحانیت کے علمبردار مادیت کے آگے کاسۂ گدائی کو لئے ہوئے ہاتھ پھیلانے لگے۔

اس حقیقت کا اعتراف نہایت ضروری ہے اس روحانی محکم نظام کے توڑ پھوڑ میں غیروں سے زائد اپنوں کا ہاتھ ہے خلافت کی وہ نورانی زنجیر جو

مسلمانانِ عالم کو اپنی روشن و مضبوط کڑیوں میں جوڑ کر ایک سنہری حلقہ بنائے ہوئے تھی مادیت کے تابڑ توڑ حملوں سے بکھر کر رہ گئی۔

منصب خلافت کی اہمیت

اسلام میں مسئلہ خلافت کی اہمیت و عظمت کس درجہ میں ہے وہ اس حقیقت سے آشکارا ہے کہ دین اسلام فرد کی آزادی کا اس کے حدود کے اندر لحاظ رکھتے ہوئے اصلاً اجتماعیت کا داعی ہے۔ اگرچہ اس کی دعوت کا اصل مقصد ارشاد و ہدایت ہے لیکن جب احکام اسلامی پر اس کے ماننے والوں کی جماعت عمل پیرا ہوتی ہے تو خود بخود اسلامی معاشرہ منصہ شہود پر جلوہ گر ہوتا اور خارجی طور پر ظہور میں آتا ہے۔ جس کے نظم و نسق چلانے اور افراد کے حقوق و فرائض کے انجام دینے کے لئے ریاست یا مملکت (اسٹیٹ) عالم وجود میں آتی ہے۔ جو ریاست کسی فرد واحد (بادشاہ و آمر مطلق) ڈکٹیٹر یا چند افراد (جمہور عوام) کے خود ساختہ قوانین و احکام کے ماتحت انسانوں پر اپنا حکم نہ چلائے بلکہ قانون الٰہی پر عمل پیرا ہو اور ان قوانین و احکام کا بحیثیت نائب کے نافذ کرنے والا ایک امیر ہوتا ہے وہ خلافت کہلاتی ہے یہی حکومتِ الٰہیہ انسانی ترقی کی معراج ہے بشرطیکہ خلیفہ راشد ہو یعنی خدا کے احکام کا سچا فرماں بردار اور احساس ذمہ داری سے گرانبار اور مخلوق خدا کا خدمت گار و غم گسار ہو۔ اس ریاست میں اس خدائے وحدہٗ لاشریک کے قانون نافذ اور اس کے احکامات جاری ہوتے ہیں جس نے خود انسان کو اور ساری مخلوقات کو پیدا کیا اور جس کے دست قدرت سے خود انسانی فطرت کی تشکیل عمل میں آئی۔

جس قادر مطلق اور حاکم برحق نے انسانی مشین ایجاد کی اسی نے اس عجوبہ روزگار مشین کے کل پرزوں کو صحیح طور سے استعمال کرنے کے طریقوں کو اپنے برگزیدہ سفیروں کے واسطہ سے بنایا اور ہر رسولؐ و نبیؑ کے ہاتھوں نسخہ

استعمال عطا فرمایا۔ جن کو صحیفہ یا کتاب کہا جاتا ہے۔ سو صحیفے اور بیس کتابوں کے بعد آخری صحیفہ اور آخری کتاب پیغمبرؐ ہادیٔ اعظم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر آخری امت کے لئے نازل فرمائی جس کے اندر اصول و کلیات کے طور پر اس دنیا میں زندگی گزارنے کے طریقے اور حیات واخروی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے سلیقے بتائے اس الہٰی دستوری کتاب کا عملی نمونہ رسول مقبولؐ کی زندگی اور خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کی زندگیوں کے ذریعہ پیش کر دیا۔ اس لئے اس ریاست میں شاہ و گدا۔ امیر و فقیر راعی و رعایا تمام احکام کی تعمیل میں یکساں ہیں۔ دنیا کی تمام حکومتوں کی طرح آمر صدر، یا وزیر اعظم ان قوانین سے مستثنیٰ نہیں۔ اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت اس سے آشکارا ہے کہ وہ سفر ہو یا حضر ہر ایک حالت میں ایک امیر کا قائل ہے۔

جب تین انسان جمع ہوں تو ایک امیر ہونا چاہئے اس طرح اسلام اجتماعیت کو کسی حالت میں ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ عبادت جو اصل میں خدا بندہ کے درمیان راز و نیاز کا معاملہ ہے اس کے اندر بھی جماعت کو ضروری قرار دیا ہے زکوٰۃ کے فریضہ کی ادائیگی بھی حکومت کے ماتحت ہے۔ جو بیت المال میں جمع کی جا کر اجتماعیت پر خرچ کی جاتی ہے۔ روزہ جو تزکیۂ نفس کے لئے ہے اس کو بھی ایک مخصوص مہینہ میں اجتماعی طور سے ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور حج تو چند مخصوص ارکان کی ادائیگی کے لئے ایک بین الاقوامی اجتماع ہے۔ بہر حال نماز جو ایک جامع عبادت ہے امامت پر ہی موقوف ہے، یہ امامت صغریٰ امامت کبریٰ کی فرع و شاخ ہے۔ پیغمبر اسلام اس امت کے اولین امام اور پہلے امیرؐ ہیں۔

امام الاولین و الآخرین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے پر تمام صحابہ کرامؓ نے اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین نہ فرمائی جب تک خلیفہ کا انتخاب عمل میں نہ آیا۔ اس لئے خلافت اسلام کے اہم مقاصد میں سے ہے۔ بقول اکبرؔ

ع
نہ ہو مذہب میں جب زورِ حکومت
وہ کیا ہے فقط اک فلسفہ ہے

اسلام ایک فلسفہ یا صرف فکری نظام نہیں ہے۔ بلکہ فکری نظام (عقائد و ایمانیات) کے ساتھ زبردست عملی پروگرام بھی ہے حضور علیہ السلام کے چاروں خلفاء کی خلافت راشدہ عالم انسانیت کے لئے ایک مثالی حکومت تھی۔ اموتی و عباسی خلافت آٹھ سو سال تک نظام اسلامی کو چلاتی رہی ان کے اندر اچھے اور برے خلفاء پیدا ہوتے رہے۔ لیکن جیسا کہ مستشرقین اور ان کے اندھے مقلدین نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ نبوت کے بعد تیس سال تک اسلام اپنی اصلی شکل میں جلوہ گر رہا۔ پھر معاذاللہ نظام اسلامی نے دم توڑ دیا۔ یہ بیہودہ و باطل خیال اسلامی نظام کے حیات ابدی پر حملہ اور دین قیم کے تسلسل کے ساتھ قائم رہنے کے خلاف ایک افتراء ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام کو ظاہری سطح پر فقہائے کرام اور باطنی سطح پر صوفیاء عظام۔ اپنی جد و جہد اور مساعی جمیلہ سے برابر قائم رکھتے رہے اور خلفاء اسلام اقتدار و حکومت کی علامت کی حیثیت سے رہے۔ ظاہری خلافت تو خلفاء اسلام کے ہاتھ میں اور باطنی خلافت صوفیاء کے حصہ میں آئی۔ جب بھی خلفاء نے نظام اسلامی کے خلاف قدم اٹھایا تو علماء حق میدانِ مقابلہ میں اترے۔ حق و باطل کی معرکہ آرائی میدان کربلا سے لے کر آخر تک قائم رہی اور رہے گی۔ پیغمبر اسلام نے قریش کی امامت کی پیش گوئی اس وقت کی ضرورت کے اعتبار سے فرمائی۔ لیکن خلیفہ کے لئے قریشی ہونا کیا لابدی شرط ہے؟ اس پر جملہ ائمہ متفق نہیں چونکہ آں حضرت صلعم کا ارشاد یہ بھی ہے کہ اپنے امیر کا کہنا مانو اگرچہ ایک حبشی کو تم پر امیر بنا دیا جائے (بخاری)

خلافت عثمانیہ کا قیام

جب عباسی خلافت کا خاتمہ خلیفۃ المعتصم باللہ کی شہادت پر ہوا تو کچھ عرصہ تک سلاطین مملوکیہ کے زیر سایہ عباسی نسل کے باقیماندہ خلفاء قاہرہ میں شان و شوکت

کے ساتھ زندگی گزارتے رہے یہاں تک کہ آخری خلیفۃ المتوکل سے حکومت عثمانیہ ترکیہ کے اولوالعزم سلطان سلیم خان (المتوفی ۱۵۲۰ء) اپریل ۱۵۱۷ء میں حرمین شریفین پر مصر کے بعد قبضہ کر لیا شریف مکہ برکات حسین نے اطاعت قبول کر لی۔ سلطان نے جو وظیفہ مصر سے ملتا تھا اس کے اندر پانسو دینار کا اضافہ کر کے ان کے بیٹوں کو بیش بہا خلعت انعام میں دیئے۔ ایسے ہی آخری خلیفہ کو بھی نوازا متوکل نے تمام تبرکاتِ نبوی (تلوار علم اور چادر مبارک) اور مقامات مقدسہ کی کنجیاں سلطان کے سپرد کر دیں۔ اسطرح سلطان سلیم سب سے پہلے خلیفۃ المسلمین سلطان المعظم کے لقب سے مشہور ہوا۔ اور اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا اس طرح خلافت عثمانیہ نے عالم اسلام پر اپنا سکہ جمایا۔ پورے یورپ میں خلفاء عثمانیہ کا دبدبہ ایسا چھایا رہا کہ ہر ملک نے ان کی عظمت کے آگے سر جھکایا۔ لیکن مغربی سامراج کو عالم اسلام سے دشمنی حروب صلیبیہ کی میراث میں آئی تھی اس لئے ترکوں کے خلاف اندرونی سازشوں کا جال بچھا دیا گیا۔ سب سے پہلے سلطان محمود خاں کے دور حکومت (۱۸۰۸ - ۱۸۳۹) عیسائی رعایا کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے کر یونان کو خودمختار بنایا اس کے بعد سوڈانیہ اور سر دیہ خلافت عثمانیہ سے مغربی حکومتوں کے شہ پر کٹ گیا۔ یہاں تک سلطان عبدالعزیز (۱۸۶۱ - ۱۸۷۶ء) کے عہد حکومت میں صوبہ بوسینا اور بر ریگوینا نے علم بغاوت بلند کیا۔ اور عثمانی خلافت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا سلطان عبدالعزیز کے دور سے خلفاء میں مطلق العنانی کا دور دورہ ہوا۔ اس لئے ترکی میں مدحت پاشا کی قیادت میں احرار پارٹی وجود میں آئی اور اس نے ایسا دستور بنانا چاہا جس کے اندر رعایا کے جملہ طبقات میں عام تعلیم، آزادی، مساوات و اخوت کی بنیادوں پر ہو۔ یہ دستور خلیفہ کے کلی اختیارات کے خلاف ایک چیلنج تھا۔ جب کہ یورپی حکومتوں نے باہم طے کیا تھا کہ دولت عثمانیہ کو ایسا دستور مہیا کیا جائے کہ اقتدارِ اعلیٰ یورپ کے ہاتھ میں ہو اور وہ نیم آزاد ریاست ہو۔ اس کے نتیجہ میں سلطان عبدالعزیز کو معزول کر کے ان کے بیٹے سلطان مراد خاں کو خلیفہ احرار پارٹی نے بنایا۔ لیکن

یورپ کے پیدا کئے ہوئے انقلاب کے وہ شکار رہے۔ اور مغربی حکومتوں کی ریشہ دوانی سے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ سلطان عبدالحمید خاں جو نہایت ہوشیار و چالاک مدبر تھا اس نے احرار کو ایسا دستور مرتب کرنے کا وعدہ کر کے ۳۰ / اگست ۱۸۷۶ء میں مسند نشین خلافت ہوا اور دستور کا اعلان بھی کر دیا۔ لیکن ۱۸۷۷ء میں زار روس کے اعلان جنگ پر سلطان نے مطلق العنانی کا رویہ اختیار کیا اور اس جنگ میں آثار فتح یابی نمودار ہونے پر اپنے تینوں جرنلوں عبدالکریم، رؤف پاشا اور محمد پاشا کو برطرف کر کے پورا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی نے اپنی کتاب الخلافہ میں لکھا ہے کہ آج سے اکیس[۲] سال قبل ۱۹۰۳ء کے موسم بہار میں ہمارے قدیم دوست مسٹر جارج فری مین باشندہ نیویارک نے ہم پر عثمانی فوجوں کی دشواریوں کو واضح کیا تھا۔ گو عثمان پاشا شر پلونا نے مردانگی کے بڑے جوہر دکھائے لیکن ترکوں کو سان اسٹیانو مقام میں روسیوں کے ساتھ ذلت آمیز شرائط کے ساتھ صلح کرنا پڑی۔ اس حیرت ناک انجام اور تباہ کن شکست نے خلافت ترکیہ کی چولیں ہلا دیں۔ سلطان عبدالحمید نے احرار پارٹی کے لیڈروں کو چن چن کر صاف کر دیا۔ اس طرح اپنی حکمت عملی سے تیس سال تک وہ ترکیہ کا مطلق العنان بادشاہ بنا رہا۔ لیکن ظلم و ستم کی یہ ناؤ کب تک چلتی؛ آخر میں انجمن واتحاد و ترقی کے رہنما شیخ الاسلام ضیاء الدین کے فتویٰ کی بنا پر ۲۷ / اپریل ۱۹۰۹ء کو معزول ہو کر پرنس محمود پاشا ان کے چھوٹے بیٹے محمد خامس محمد ارشاد خاں کے لقب سے تخت نشیں ہوئے مولانا برکت اللہ بھوپالی[۳] ان کے دور میں پہلی بار قسطنطنیہ فروکش ہوتے تھے وہی دستوری حکومت کے پہلے خلیفہ تھے۔ غازی انور پاشا ان کے داماد وزیر جنگ تھے۔ ان کے زمانہ میں جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کا آغاز ہوا اور جرمنی و ترکی کے ساتھ صبر و ضبط کی کوئی انتہا نہ تھی، ظاہر ہے کہ اس کا پیمانہ صبر کہاں تک نہ چھلکے آخر پیمانہ شکیب چھلک گیا۔ اور انگورہ کی گرانڈ نیشنل اسمبلی نے خلافت کی سیادت کو سلطنت کی امارت سے جدا کر دیا اور ترکی کے جدید دستور کے ماتحت خلافت کے

خاتمہ کا اعلان کردیا۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی "الخلافۃ" لکھتے ہیں "بروز شنبہ یکم مارچ ۱۹۲۴ء مطابق ۸ رجب المرجب ۱۳۰۲ھ شمسی ہجری مطابق ۲۶ رجب ۱۳۴۲ھ قمری ہجری مصطفےٰ کمال پاشا صدر جمہوریہ انگورہ کی تجویز کے مطابق اعزاز خلافت کا خاتمہ کردیا گیا۔ دو روز بعد مجلس وطنی کرنے اس مسودہ قانون کو بھاری اکثریت سے منظور کرلیا۔ خاندان خلیفہ کو جلاوطن اور ان کی جائداد و مال کا بحق عوامی حکومت ضبط کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ سلطان عبدالمجید خاں ثانی جو خاندان عثمانی کے چھتیسویں سلطان اور اٹھا تیسویں خلیفہ تھے۔ حدود ترکیہ سے باہر نکال دیئے گئے (خلافت صفحہ ۱۳۰) جو صدیوں کی عظیم اسلامی روایات کی عظمت کا امین بنا ہوا تھا جو مغربی اقوام کی نظروں میں ایشیائی شان و شوکت اور جاہ و جلال کا عظیم مینار تھا جو چار سو سال تک یورپ میں قوت و دبدبہ اور اسلام کی حفاظتی تلوار بنا ہوا تھا۔ مغربی سامراج کی پھیلائی ہوئی سازشوں کے نتیجہ میں وہ فلک بوس مینار زمین پر آرہا ۔ ملت اسلامیہ کے کسی فرد کے خواب و خیال میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ وہ خلافت جس کی بنیادیں اسلام کی نہ ہلنے والی مستحکم چٹان پر قائم ، جس کی سربلندی ہمالیہ اور کوہ سے زیادہ اونچی، طاق کسریٰ سے زیادہ مضبوط و مستحکم سمجھا جاتا تھا چودھویں صدی اس کے لئے غیروں کے نہیں خود اپنوں کے ہاتھوں خاتمہ کا اعلان لے کر آئے گی۔

تاریخ اسلامی کا دوسرا عظیم سانحہ ۱۹۲۴ء

یقیناً تاریخ اسلامی کا سب سے زبردست سانحہ چھٹی صدی ہجری ہلاکو خاں کے ظالمانہ وجابرانہ ہاتھ سے خلافت عباسیہ کا خاتمہ تھا۔ جس پر "بقول سعدی" آسمان اگر خون کی بارش برساتا تو بجا تھا۔ لیکن یہ دوسرا سانحہ جو دراصل خلافت کا خاتمہ ترکوں کے ہاتھوں پورے عالم اسلام کے لئے بلکہ پوری انسانیت کے لئے

سانحۂ عظیم ہے۔ جس نے نہ صرف اسلامی حکومتوں کو تہس نہس کر دیا بلکہ ہندوستان، برما اور جاپان تا مشرق وسطیٰ سے مشرقِ اقصیٰ تک رہنے والے مسلمانوں کی قسمت پر مہر غلامی کو ثبت کر دیا۔ اسلامی خلافت کے ختم ہو جانے پر مغربی سامراج نے جغرافیائی حد بندیوں کے ذریعہ قومیت و وطنیت کے تازہ فتنہ کو برپا کر کے مشرق کو قومی و وطنی اور لسانی تنازعات کا آتش کدہ بنا دیا۔ آج پورا ایشیا فرنگی سامراج کی اس بھڑکائی ہوئی آگ میں جل رہا ہے۔ اس وقت عربوں ترکوں کے درمیان کرنل لارنس جیسے شیطان صفت انسان کے ذریعہ بغض و عداوت کی آگ بھڑکائی گئی کہ صدیوں سے ایک دینی رشتہ میں منسلک قومیں ایک دوسرے کی جانی دشمن اور خون کی پیاسی ہو گئیں اس لئے ترکوں کی خلافت کے خاتمے کے اعلان سے کچھ نادانوں کے دلوں میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے اس حقیقت کو نہ پہچانا کہ ملت کا شیرازہ منتشر ہونے کے بعد ہر ایک کی حیثیت بکریوں کے گلہ میں اس تنہا بکری کی ہو جائے گی جو اپنے گلہ سے بچھڑ گئی ہو۔ اور پھر صحرائے حیات میں وہ ہر بھیڑیئے ہر درندہ کا لقمہ تر بن سکتی ہے؟

مولانا برکت اللہ بھوپالی غالباً وہ پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے اپنی اسلامی فکر سے اس حقیقت کو بھانپ لیا اور الخلافۃ لکھ کر پورے عالم اسلام کی طرف سے اس فرض کفایہ کو سرانجام دیا۔ جس کا پہلا ایڈیشن ۴ر اگست ۱۹۲۴ء کو اوزنخ سوئیزرلینڈ میں طبع ہوا۔ جو زبان و بیان کی خوبی اور مضامین کی معنویت اور اپنی خوش اسلوبی کا آئینہ دار ہے۔ مسٹر عبداللہ یوسف علی مترجم قرآن نے پیش لفظ لکھا ہے۔ جس کے اندر مولانا برکت اللہ بھوپالی کا گیارہ سال انگلستان، چھ سال امریکہ، پانچ سال جاپان اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ وسط ایشیا اور یورپ میں رہنا ظاہر کیا ہے۔ بہرحال یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۵ء میں شائع ہو۔ جس کے

ٹائیٹل پر الخلافہ لکھاہے۔ اور

لما صنعت الخلافہ فسد الاسلام وخسر المسلمون واذا قیمت الخلافہ صلح الاسلام وافلح المومنون درج ہے۔

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مولانا برکت اللہ بھوپالی کے نزدیک اسلام کے نظام اجتماعی میں خلافت کا منصب ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے اگر خلافت میں بگاڑ پیدا ہوا تو مسلمانوں میں بگاڑ پیدا ہوگا۔ اور مسلمان گھاٹے میں رہیں گے اور جب خلافت صحیح اصولوں پر قائم ہوگی تو اسلام صلاح و فلاح کا ضامن اور مسلمان کامیاب ہوں گے۔ بہر حال عالم اسلام میں سب سے پہلے مسلمانان ہند نے خلافت کی اہمیت وجلالت کو محسوس کیا اور خلافت کے خاتمہ پر ایک مستقل تحریک ہندوستان میں چلی۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی اس کے قائد اور علی برادران ان کے پُرجوش محرک تھے۔ اس تحریک نے ہندوستان کی قدیم سیاست کے ٹھہرے ہوئے تالاب میں ایک تموج پیدا کر دیا، اور اس کی لہریں ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئیں۔ سب سے زیادہ خوشی ومسرت کی بات یہ تھی کہ گاندھی جی کے ساتھ برادران وطن نے پورا پورا ساتھ دیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایشیا کی دینی روح بیدار ہوکر سارے مشرق میں ایک نئی لہر دوڑانے والی ہے اور قریب ہی میں ہندوستان لیلائے آزادی سے ہم کنار ہوجائے گا لیکن جس طرح فرنگی سیاست خلافت کے ختم کرنے میں اپنی مکارانہ ڈپلومیسی سے کامیاب ہوئی اسی طرح ہندوستان کی اس تازہ لہر کو دبانے میں اپنی شاطرانہ چالوں سے فتح یاب ہوئی خلافت کا خاتمہ دراصل فرنگی سامراج کی صدیوں کی آرزوؤں کی کامیابی کی تکمیل تھی ترکی کے مجلس وطنی کا یہ فیصلہ مغربی طاقتوں کے خصوصاً برطانیہ کے اشارہ پر بلکہ اس کے اصرار پر عمل میں آیا۔ جیساکہ ڈاکٹر علی حسّون تاریخ الدولہ العثمانیہ میں لکھتے ہیں:۔

"انگلستان نے اس اعلان کے فوراً بعد ترکی کو بحیثیت ایک آزاد سلطنت

کے تسلیم کر لیا اور اس کی فوجیں فوراً ترکی کے حدود سے باہر نکل آئیں۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے مجلس عوام (پارلیامنٹ) میں اس کارروائی پر احتجاج کیا، اس کا جواب لارڈ کرزن نے ان الفاظ میں دیا: "مسئلہ یہ ہے کہ ترکی کا ایسا زوال عمل میں آگیا ہے۔ اس کے بعد پھر اس کا عروج نہیں ہوگا۔ اس لئے ہم نے اس کی روحانی و معنوی طاقت (خلافت) کو ختم کر دیا ہے" (تاریخ الدولہ العثمانیہ صفحہ ۲۷۳ مکتبہ اسلامی دمشق بیروت)

مغربی سامراج کا اصل مقصد ترکی خلافت کے ختم کر دینے سے یہ تھا کہ مسلمانان عالم کو ایک رشتہ میں جوڑنے والی کوئی طاقت نہ رہے اور ان کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے۔ یہ امر ایسا نہ تھا کہ اس پر خاموشی اختیار کی جاتی اور صبر کر کے بیٹھا جاتا اس لئے مولانا برکت اللہ بھوپالی نے پیرس کو اپنا مرکز بنانا طے کیا۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی کا پیرس میں قیام و اخراج

لوزان کانفرنس سے فارغ ہو کر مولانا برکت اللہ بھوپالی نے اب اپنا مرکز فرانس کے دارالحکومت پیرس کو بنایا چونکہ فرانس آزادی و حریت اور جمہوریت کے لئے مغربی ممالک میں اپنے انقلاب کی وجہ سے نقیب و سربراہ بن کر سامنے آیا تھا اور روسو جیسے انقلابی مصنفین نے اس کو آزادی عوام کے پیامبر کی حیثیت سے تعارف کرایا تھا چنانچہ پیرس کی جہاں اور خوبیاں بیان کی جاتی ہیں وہیں یہ بھی ہے کہ اس انقلابی شہر میں دنیا بھر کی قومی تحریکیں یہاں آکر پناہ گزیں ہوتی ہیں۔ پیرس کو مولانا برکت اللہ بھوپالی نے اپنا مستقر بنا کر حسب معمول عربی میں ایک ہفتہ وار پرچہ الاصلاح شائع کرنا شروع کیا۔ چونکہ فرانسیسی حکومت ٹیونس، الجزائر، مراکش اور ریف پر اپنا اقتدار اعلیٰ ترکی کے حصے بخرے کرا کے قائم کر چکی تھی۔ اس لئے عربوں کی ایک بڑی تعداد یہاں مستقلاً مقیم تھی۔ الاصلاح کا پرچہ عبدالحفیظ صاحب مونس بھوپالی کے پاس آتا تھا۔ وہ پرچہ

راقم الحروف کو دکھائے تھے۔ شہر پیرس نہ صرف یورپ کے باشندوں کی ایک زیارت گاہ تھا۔ بلکہ ہندوستانی، مصری اور مغرب کے باشندوں کے لئے بھی تفریح گاہ تھا۔ اس لئے مولانا کی وجہ سے وہ ہندوستان کی انقلابی سرگرمیوں کا چھوٹا مرکز بن گیا۔

ریاست بھوپال کے سابق مشیر المہام سر سید لیاقت علی استاد نواب حمید اللہ خاں سے مولانا کی ملاقات پیرس کے ایک سفارتخانہ میں ہوئی تھی۔ جس کا تذکرہ وہ فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ ۲۳/اپریل ۱۹۲۵ء میں حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری پیرس پہونچے اور ایک ماہ تک بسلسلہ علاج ٹھہرے رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سیاسی مشغولیت بھی رہی۔ چونکہ حکیم صاحب سے مولانا برکت اللہ بھوپالی کے گہرے روابط تھے بقول قاضی عبدالغفار ''عروس البلاد پیرس کی بین الاقوامی حیثیت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوگا جب کہ کوئی مسافر اس خطہ میں اقطاع واطراف کے باشندوں کو دیکھتا ہے۔ امریکہ اور ممالک یورپ کے علاوہ۔ شام، نجد، عراق، فلسطین، مصر، ترکی، تیونس، الجزائر، حجاز، مراکش، جاپان، ہندوستان، چین غرض کوئی ایسا ایشیائی ملک نہ تھا جس کے باشندے خواہ بر سبیل تجارت یا سیاسی اغراض لے کر پیرس نہ آتے ہوں۔ وہ شہر کالے گورے، بھورے، سانولے اور زرد انسانوں کا ایک عجائب خانہ ہے۔ جس کے بازاروں میں دنیا کی ہر زبان بولی جاتی ہے۔ اسلامی دنیا کی ایک ایسی شخصیت جیسی حکیم صاحب کی تھی۔ وہاں قدم رکھتے ہی تعلقات اور ملاقاتوں کا ایک وسیع میدان پاسکتی تھی اور ناممکن ہے کہ حکیم صاحب پیرس جاتے اور وہاں کی عمومی زندگی ان کی آمد سے بے خبر رہتی۔ حکومت ہند کے قونصل کے علاوہ جیسے حسن شاہد سہروردی اور خدا غریق رحمت کرے۔ مولانا برکت اللہ (مرحوم)، مسٹر کاکا، مسٹر رائے تھے جو حکیم صاحب کی خبر سن کر پیرس آگئے تھے۔ افغانستان کے جنرل نادر خاں، اسماعیل پاشا، شریف پاشا، مصطفےٰ رستم بک احمد عوفی بک، ڈاکٹر بہجت وہبی، عاکف کمال بک، ضیاء رشید بک، یہ سب وہ لوگ تھے جن کی صحبتوں میں پیرس کا پورا مہینہ ۲۳/مئی ۱۹۲۵ء تک گزرا۔ روسی کمیونسٹ

ایک طرف مصر کے قوم پرست اور سرکاری جاسوس دوسری جانب غرض یہ کہ کوئی رنگ کا آدمی اور سیاسی قبیلہ ایسا نہ تھا جو پیرس کی ان صحبتوں میں حکیم صاحب سے روشناس نہ ہوا ہو۔ مولوی صلاح الدین صاحب برلن سے تشریف لائے تھے کہ ہندوستان کے اس محترم مسافر سے دو باتیں کر لیں۔ ہندی طلبہ، جرمنی اور پیرس اور لندن سے حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عید کی نماز افغانی سفارت خانہ میں حکیم صاحب نے ادا کی۔ اس موقع پر ہندوستانیوں اور افغانیوں کا اچھا خاصا مجمع تھا اس موقع پر ایک فوٹو گروپ بھی لیا گیا (حیات اجمل ص ۴۳۸-۳۳۹)

بہرحال یہی وہ زمانہ تھا کہ خلافت کے خاتمہ نے "ترکی تمام شد" کی حقیقت کو واضح کر دیا تھا۔ خلافت کے خاتمہ سے مولانا برکت اللہ بھوپالیؒ دل گرفتہ اور ملول خاطر تھے۔ چوں کہ مغربی سامراج اپنے اقدام سے مسلمانان عالم کے رشتہ اتحاد کو توڑ کر ان کو تتر بتر کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس حیثیت سے ہندوستان بلکہ ایشیا کی آزادی کے سارے خواب چکنا چور ہو چکے تھے۔ اس لئے مولانا نے اپنی معرکۃ الارا کتاب الخلافتہ شائع کی۔ اس سلسلہ میں مولانا برکت اللہ بھوپالیؒ کا ایک اعلان مسلمانان عالم کے نام ۲۸/دسمبر ۱۹۲۵ء کو پیرس میں شائع ہوا کہ مستقبل قریب میں مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ یا کسی اور مقام پر مسلمانوں کے نمائندے جمع ہوں اور اپنے لئے ایک روحانی پیشوا خلیفۃ المسلمین کے نام سے منتخب کر لیں۔ اس کی ایک کونسل بھی ہو۔ جو دینی امور میں مسلمانوں کی رہبری کر سکے۔ اس سلسلہ میں اخبارات اور کتابچوں کے ذریعہ اور وفود سے عالم اسلام کی رائے عامہ ہموار کی جائے اور کرۂ ارض پر بسنے والے باشعور اور علماء دین کو باقاعدہ دعوت دی جائے اس جلسہ کا انعقاد یکم مارچ ۱۹۲۶ء کو قاہرہ (مصر) میں کیا جائے۔ اگر علماء اسلام اس تجویز پر متفق ہو جائیں تو پھر دینی پیشوا کا بحیثیت خلیفۃ المسلمین انتخاب عمل میں لایا جائے۔ مولانا برکت اللہ کی یہ آواز بھی افسوس ہے کہ مسلمانان عالم کے باہمی اختلافات کی نذر ہو کر صدا بصحرا ثابت ہوئی اور جو مغربی سامراج چاہتا تھا وہی ہوا۔ انا للہ۔

مولانا برکت اللہ کی عالمی تجویز مغربی سامراج کے لئے ایک چیلنج تھا۔ چنانچہ اس نے اس کو قبول کیا اور بقول صدیقی صاحب "فرانسیسی حکومت نے اور کچھ تو نہ کیا لیکن ایک بیرونی حکومت کی دوستانہ شکایت پر ایک دن پولس مولانا کے مکان پر آ گئی انھیں اور ان کے کمرے کی کتابیں اور دوسرے اسباب کو گاڑی میں بھر کر ان کو ریل میں سوار کر دیا۔ اور جب تک کہ سوئیزرلینڈ کی حد میں گاڑی نہیں پہونچی اسوقت تک پولس والوں نے ساتھ نہ چھوڑا۔ ظاہر ہے کہ وہ بیرونی حکومت ہماری سابقہ مہربان گورنمنٹ برطانیہ تھی۔ جو بقول حضرت مدنی رح "سات سمندر پار کرکے ہم غیر مہذبوں کو مہذب بنانے کے لئے آئی تھی" مولانا کو پیرس کے خارج البلد کرنیوالی حکومت فرانس ہی تھا جو ساری دنیا کے عوام کو حریت و آزادی اور جمہوریت کا تحفظ عطا کرنے کی دعوی دار تھی بہرحال مولانا کی زبان حال بقول غالب گویا تھی۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے ایک دن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے اخبار سچ میں ایک شمارہ یکم جنوری ۱۹۲۶ء میں فرانسیسی حکومت کے اس جابرانہ و ظالمانہ طرز عمل کو اس طرح اظہار کیا ہے۔

"الاصلاح کا ذکر ایک سے زیادہ بار ان صفحات میں آچکا ہے ابھی اس کا ایک نمبر ہی شائع ہونے پایا تھا کہ حکومت برطانیہ اس کے فنا کرنے کی ٹھان لی، اس کے ایڈیٹر مولوی برکت اللہ صاحب بھوپالی فرانس میں مقیم تھے۔ برطانوی حکومت نے ان کے خلاف مخبری کی اور اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئی۔ یعنی مولوی صاحب کو فرنچ پولس نے فوراً گھیر لیا اور ان کے ساتھ اس پوری ذلت و رسوائی کے برتاؤ کے بعد جو عموماً صرف مجرموں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ چند گھنٹوں کے اندر انھیں اپنے ملک سے خارج کر دیا۔ الزام یہ لگایا گیا کہ مولوی صاحب فرانس

ہیں رہ کر بالشویک خیالات کی اشاعت کرکے اور فرانس کے خلاف جذبات بھڑکاتے ہیں۔ حالانکہ مولوی صاحب نے اپنے پرچہ میں صرف دو جگہ فرانس کا ذکر کیا تھا اور دونوں جگہ تعریف ہی کی تھی لیکن یہ احتیاط ناکام ثابت ہوئی اور موصوف کو فرانس چھوڑنے کے علاوہ اپنے پرچہ کی اشاعت بھی سردست بند کر دینا پڑی۔ مولوی صاحب کی ساری عمر جلاوطنی میں گزری ہے۔ اپنے وطن کی شکل دیکھے ہوئے انھیں مدتیں گزر چکیں وہ ٹرکی، افغانستان، جاپان، ترکستان، امریکہ، انگلستان فرانس وغیرہ میں سال ہا سال رہے۔ فرانس کے حدود کے باہر نکالا جانا امید ہے کہ زیادہ گراں نہ گزرا ہوگا اللہ پاک اس مجاہد کو صبر دے اور اس کے مراتب روحانی میں ترقی نصیب کرے۔ البتہ فرانس اور دوسری پر ضرر حکومتوں کو بھی انتقام کی گھڑی سے غافل نہ رہنا چاہیئے۔ یہ انتقام برکت اللہ اور ان کے ہم وطن بے شک نہیں لے سکتے لیکن وہ ہستی یقیناً انتقام پر قدرت رکھتی ہے، جو جزائر برطانیہ اور مجلس اقوام سب سے زیادہ قوت رکھتی ہے اس کی گرفت بہت دیر میں ہوتی ہے لیکن بہت سخت بھی ہوتی ہے بے گناہوں کی آہ، بے قصوروں کی فریاد، بیکسوں کا صبر، کبھی بالا بالا نہیں جاتا مظلوموں پر جو گزرتی ہوتی ہے گذر جاتی ہے۔ لیکن جن ہاتھوں سے گذرتی ہے ان کی گردنوں کا بوجھ قیامت تک ہلکا نہیں ہوتا

؎ برگردن او بماند و برما بگذشت

خود مولوی برکت اللہ کی لکھی ہوئی داستانِ غم ۱۸؍ دسمبر کو کامریڈ میں شائع ہوئی اور پڑھنے و سوچنے کے قابل ہے۔

مولانا برکت اللہ کا مکتوب مولانا دریابادی کے نام

مولانا عبدالماجد دریابادی ایڈیٹر "سچ" سے بھی مولانا برکت اللہ بھوپالی کے دینی و سیاسی تعلقات تھے۔ اپنے اخبار "سچ" مولانا کے مکتوب کا ذکر اس عنوان سے فرماتے ہیں، ہندوستان کا ایک غریب الوطن سپوت، مولوی برکت اللہ بھوپالی

جن کی کتاب الخلافۃ اور جن کے ہفتہ وار پرچہ "الاصلاح" پر "سچ" میں اظہار خیال ہو چکا ہے اپنے تازہ مکرمت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں "آں جناب کی تقریظ الاصلاح پر نظر سے گذری ممنون فرمایا۔ افسوس ہے کہ انگریزوں نے شرارت کر کے حکومت فرانس کو، ہمارے فرانس سے اخراج کرنے پر راضی کر لیا یہ اتہام کاذب دے اصل لگایا کہ ہم پیرس میں رہ کر عربوں کو جمہوریت فرانس کے خلاف اغوا کرتے ہیں۔ اور یہ ایسے وقت میں عالم اسلام کی اجتماعی کانفرنس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مراکو، اور موزیا، اور جوزا آن میں جنگ جاری تھی۔ اصل مقصود یہ تھا کہ پیرس جہاں دنیا بھر کے مسلمان آتے ہیں وجہ سے علیحدہ کرائیں۔ اس وجہ سے مالی دقتیں بھی بڑھ گئیں۔ اور الاصلاح کا پہلے عدد کے بعد کا کوئی شمارہ شائع نہ ہو سکا میں نے آپ کے پاس پچاس نسخہ کتاب خلافت کے انگلش زبان میں روانہ کر دیئے ہیں۔ اس کتاب کا اعلان "سچ" میں دوامی طور پر کریں۔ اور اس کی اشاعت میں کوشش فرمائیں۔ اس کو طالب علموں کے ذریعہ کالجوں، یونیورسٹیوں اور بڑی مجلسوں میں فروخت کرانا چاہتے۔ کتاب کا ذرا غور سے مطالعہ فرمائیں۔ آج کل ممالک اسلامیہ کی حالت بحیثیت سیاست مختلف درجوں میں منقسم ہے اور از روئے سیاست عالم اسلام کی وحدت ممکن نہیں — ہاں! عالم اسلام کو مکارم اخلاق پر تربیت کرنے کے لئے نقطۂ وحدت خلافت روحانی کی ضرورت ہے جب ان کے اخلاق درست ہو جائیں گے۔ انکی سب چیزیں درست ہو جائیں گی۔ پس اصل اتباع سنت ہے آپؐ نے تربیت اخلاق کے ذریعہ چند بزرگ پیدا کر دیئے تھے، جنھوں نے تاریخ عالم کو بدل دیا تھا۔

(ہفت روزہ "سچ"، یکم جنوری ۱۹۲۵ء)

مولانا برکت اللہ کی روم میں مسولینی سے ملاقات ۱۹۲۶ء

مولانا برکت اللہ کو فرانسسی پولس نے سوئیزرلینڈ کے ایک گاؤں سینٹ گالن میں چھوڑا وہاں ایک دوست رہتے تھے۔ ان کے یہاں پہونچ گئے۔ سوئیزرلینڈ

کے اس گاؤں میں مولانا پہونچنے کو تو پہونچ گئے لیکن ان کی فطرت کہاں ان کو نچلے بیٹھنے دیتی تھی۔ اس لئے اس پر غور و فکر کرنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ حالانکہ قویٰ میں اضمحلال اور عناصر میں عدم اعتدال آچکا تھا۔ ذیابطیس کا عارضہ کندھے میں اندرونی درد ستانے لگا تھا۔ لیکن ان جیسا متحرک و فعال انسان خاموش کیسے بیٹھ سکتا تھا ان کی قوت عمل کو جنبش میں رکھتی تھی ان دنوں طرابلس الغرب کے چند قوم پرور اپنے ہم وطنوں پر مظالم کی شکایت کرنے روم آئے ہوئے تھے ان کی درخواست پر مولانا روم تشریف لے گئے۔ ان کے آلام و مصائب کی داستان سنی اور سنور مسولینی سے لاقات کر کے نہایت موثر طریقہ پر ان کی وکالت کی اور وعدہ لیا کہ عربوں کو اب نہ ستایا جائے گا۔ مولانا کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر سینور مسولینی نے اپنے سکریٹری سینور کونتارینی کو ان کے پاس بھیجا اور ایک تجارتی تجویز میں ان سے مدد چاہی۔ اطالیہ والوں کی خواہش تھی کہ ہندوستانی تاجروں سے براہ راست تعلق پیدا کر کے جرمنی و آسٹریلیا کی تجارت کو جو جنگ کے بعد بند ہو گئی تھی۔ اطالیہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ مولانا کو یہ تجویز پسند آئی اور امداد کرنے کا وعدہ کیا اطالیہ کے مشہور تجارتی ایوان بنگ نوبیارو نے ایک کروڑ کے سرمایہ سے ایک کمپنی رجسٹر کی جس کا رئیس بادشاہ کا رشتہ دار اور دیوک جرائے مقرر کیا گیا۔ اٹالیا کے بڑے بڑے کارخانہ دار اور تاجر اس میں شریک تھے۔ سیوزانسا اور مسولنی جو پوپ اطالیہ کے مدبر تھے اس کمپنی میں اپنے بھائی کی نمائندگی کرتے تھے روپیہ جمع ہو گیا۔ میلان میں اس کا دفتر کھولا گیا۔ لیکن جس اثر نے انھیں جاپان سے نکالا۔ پیرس سے خارج کیا اسی نے اس تجویز کو بھی ناکام کر دیا۔ اور مولانا مہینوں کی محنت کے بعد ناکام سوئیزرلینڈ واپس ہو گئے (اردو صن ۴۲)

۱۹۲۵ء میں حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بغرض علاج تشریف لے گئے، جینوا میں پھر یہاں ایک ماہ رہے۔ مولانا برکت اللہ بھی تشریف لے آئے، روزانہ صحبت رہتی تھی۔ اور بڑی بڑی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ شیاما جی کرشنا ورما

اور پنڈت جواہرلال نہرو اس زمانہ میں وہیں تھے۔ ایک روز حکیم صاحب نے چائے پر بلایا۔ دریافت کیا کہ ورما جی آپ کی کیا عمر ہے فرمایا، ٹھیک تاریخ و برس تو بتلا نہیں سکتا۔ لیکن یوں سمجھئے کہ جب میں ننگا پھرتا تھا تو آپ کے مہاتما کی ماں انھیں دودھ پلاتی تھیں۔ حکیم صاحب کو یہ بیان اس قدر پسند آیا کہ اکثر یاد کر کے ہنسا کرتے تھے حکیم صاحب نے مولانا کا علاج کیا اور ہندوستان پہونچکر بھی دوا بھیجی عبدالرحمن صدیقی کے عرض کرنے پر حکیم صاحب نے مولانا کو ہندوستان واپس آنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ حکومت سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ خیال تھا کہ مولانا کو ہندوستان لا کر علی گڈھ میں سیاست کا پروفیسر بنا دیا جائے مولانا نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور فرمایا کہ جس وقت تک ہندوستان آزاد نہیں ہوگا میں واپس نہیں جاؤں گا۔ کچھ عرصہ بعد صدیقی صاحب کے اصرار پر مولانا اس پر راضی ہو گئے کہ یورپ کے کسی مقام کو پسند فرما کر اپنے حالات زندگی تحریر فرما دیں۔ چنانچہ اطالیہ کے ساحلی مقام سان ریجو کو پسند کیا اور یہ شرائط طے ہو گئیں کہ میں اخراجات کا ذمہ نہ لوں بلکہ ایک سکریٹری کی تنخواہ بھی جسے مولانا حالات لکھوا دیا کریں۔ اور ٹائپ کر کے ان کو دے دیں۔ مولانا مسودہ کو صاف کر کے مجھے بھیجدیا کریں۔ اور میں اس کو چھپوانے کا انتظام کروں۔ ادھر صدیقی صاحب نے ہندوستان پہونچ کر مذکورہ اخراجات کا انتظام کیا ادھر ان کی داستان حیات کا آخری ورق الٹ گیا (اردو ص۴۰)

مولانا برکت اللہ اور دیار وطن (بھوپال)

ایک یادگار مکتوب

مولانا برکت اللہ بھوپالی کی زندگی کا روشن عنوان ہندوستان بلکہ براعظم ایشیا کے غلام ملکوں کی حریت و آزادی، ملک و ملت کی سربلندی و سرفرازی رہا۔ وہ اس لیلائے مقصد کے حاصل کرنے کیلئے دیوانہ وار ملکوں، ملکوں

گھومتے اور ہر دشت وادی میں بھٹکتے پھرے۔ اس جہادِ حق کے لئے تیغ و سنان، زبان و بیان غرض ہر حربہ کو استعمال کیا۔ لیکن ان کا خصوصی ہتھیار قلم کی تلوار رہا وہ میدان صحافت کے زبردست شہسوار اور میدانِ تقریر کے ایک جوش گفتار فاضل تھے۔ مشرق و مغرب کی سولہ، سترہ زبانوں میں اظہارِ خیال پر قدرت رکھتے تھے۔ اردو فارسی، عربی تو گویا ان کی مادری زبانیں تھیں۔ لیکن انگریزی، فرنچ روسی و جرمنی وغیرہ پر پوری طرح قادر تھے۔ میدانِ صحافت میں ان کے موضوعات زیادہ تر سیاسی و معاشی و انقلابی مضامین تھے۔ جو فکری خشک اور سپاٹ موضوعات ہیں۔ لیکن بھوپال کی آب و ہوا کی اثرات شاعرانہ ذوق رکھتے تھے۔ اردو، فارسی زبانوں میں بے تکان شعر کہتے تھے۔ جیسا کہ صدیقی صاحب نے لکھا ہے۔ وہ بلند پایہ شاعر تھے۔ زیادہ کلام فارسی میں تھا۔ انگریزی ملک الشعرا۔ لارڈ ٹنی سی کی سالگرہ کے موقع پر ایک قصیدہ لکھا تھا۔ جو اس نے بے حد پسند کیا۔

یادداشت غضب کی تھی روم سے فلارنس کی طرف گاڑی "آپ نے نین" کی پہاڑیوں سے گذرتی ہے، صبح کا وقت تھا اور منظر نہایت خوبصورت میں دغازی عبدالرحمٰن صدیقی) اوپر کے بستر پر سو رہا تھا کہ گنگنانے کی آواز آئی آنکھ کھل گئی دیکھتا کیا ہوں کہ ہاتھ ہلا ہلا کر فارسی اشعار پڑھ رہے ہیں۔ سلام کیا فرمایا نیچے اتر آؤ۔ منظر دیکھو اور نظم سنو۔ شاہ ایران ۱۹۰۰ء پیرس کی نمائش دیکھنے یورپ گیا تھا۔ کچھ دن کے لئے لندن میں شاہی مہمان رہا مولانا نے قصیدہ پیش کرنے کی اجازت چاہی، لندن میں وقت نہ ملا۔ پر کھیل بلجیم کے پایہ تخت میں مولانا کو بلایا۔ قصیدہ سنا، آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اشعار تو یاد نہیں، لیکن مضمون یہ تھا کہ، عالم اسلام اور ایران کی حالت تباہ ہے۔ تو نے جو کچھ پیرس میں دیکھا اسے اپنے وطن میں لوٹ کر وہاں بھی قائم کر ترقی کے سامان جمع کر اور ایران کی شان کو دوبالا کر مولانا اشعار پڑھتے گئے اور میں گنتا گیا اشعار سنانے کے بعد فرمایا۔

بھائی زمانہ گزر گیا اب یادداشت پہلے کی سی نہیں رہی۔ سوال کرنے پر جواب ملا کہ قصیدہ میں کل اشعار ایک سو بیس (۱۲۰) تھے دار دو صد ۴۰۳)

مولانا کا ایک معاشی و سیاسی مضمون ہم ہدیہ ناظرین کر چکے ہیں۔ اب ان کی ایک یادگار تحریر پر اس فصل کو ختم کرتے ہیں۔ جو ان کے دل کے سرچشمہ سے اُبلنے والی حب الوطنی اور جذبات کی رنگارنگی سے بھری ہوئی تحریر ہے یہ ان کے بچپن کے شناسا شاکر حسین نکہت کے خط کا جواب ہے۔ جو مولانا نے جذباتی انداز میں لکھا ہے۔

۱۷/۵/۱۹۲۵ء

عزیز الکریم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا محبت نامہ چوالیس سال کے بعد زرتیخ میں ملا۔ چونکہ خارق العادۃ واقعہ تھا۔ بیحد و اندازہ خوشی حاصل ہوئی۔ آپ کی بے زوال مہربانی کا شکریہ۔ جو اتنے برسوں تک اس دور افتادہ از وطن کو فراموش نہ کرے کوئی آسان کام نہیں جس زمانہ کی آپ نے یادآوری فرمائی ہماری زندگی کے مراحل میں خوش وخرم مرحلہ تھا۔ اور اس کا تصور عمر کی شام میں سہانے خیال سلک حضور میں پیش کرتا ہے اور دل کو جوش، روح کو وجد، اور دماغ کو تازگی بخشتا ہے گویا باسی کڑھی میں ابال آیا ہے، ان چوالیس سال میں دنیا نے عجیب و غریب نیرنگیاں دکھلائیں۔ جو چیزیں وہم و خیال میں نہ آتی تھیں۔ منقَّہ نفس الامری پر جلوہ نما ہیں، تحت البحر کشتیاں، ہوائی طیارے، لاسلکی کا قیام اور دوسری حیرت انگیز ایجادیں اسی مقدار زمانہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ ؎

ابلیك مثل بکاء تو ھك ناسیا محدادھم ابدا أعلیك حداد
وودادھم للّٰہ فی وفای مثلہ وودادھم متواصل بفواد
ھاکنت تفعل عند ایار طوقت ھٰذ البلاد وانھالا یاد

اور اس مدت دراز میں ہم کرۃ الارض کے پیراموں ہم دو بار گردش کر چکے اور دنیا کے بڑے بڑے لوگ دیکھے مگر بھوپال کے سیدھے سادھے لوگ، چھوٹے چھوٹے مکان اور تنگ گلیاں اب تک محبوب و مرغوب خاطر ہے۔ آپ نے ان کو یاد دلا کر شاد فرمایا۔ والد مرحوم مولوی شجاعت اللہ شاید نہیفہ ۱۸۵۷ء کے زمانہ والدہ مرحومہ کے ساتھ بھوپال تشریف لاتے تھے۔ ہماری پیدائش بھوپال میں ہوئی۔ وہیں درس علوم معقولہ، منقولہ میں ابتدائے عمر صرف ہوئی۔ چار سال بمبئی میں رہ کر انگلش تحصیل کی اور پھر لندن چلے گئے۔ بنا بریں نہ بدایوں دیکھا اور نہ بانس بریلی جس کا والد ماجد ذکر کیا کرتے تھے۔

یہ نامہ میں جنیوا سے لکھ رہا ہوں اور پرسوں یہاں سے برلین عاصمۃ المانیہ چلا جاؤں گا۔ کتاب الخلافت بزبان انگلشی اور ایک رسالہ بزبان عربی مع تصویر اس مخلص خلد خدمت میں ارسال کروں گا۔ ہاں! اس منشی سید جمیل احمد کو نہیں بھولا ہوں۔ مگر آپ کے والد مرحوم کی تصویر اب ذہن میں نہیں ہے اور نہ آپ کی شکل یاد پڑتی ہے۔ بیس برس کے قبل میں نیویارک ممالک متحدہ امریکہ میں تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ آں مہربان کا عنایت نامہ منشی فتح محمد کے توسط سے ملا ہو۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس روز آپ یہ محبت نامہ لکھ رہے تھے۔ اسی روز ابو نصیر سید احمد بھوپالی قاہرہ میں مصر میں مجھے عنایت نامہ لکھ رہے تھے۔ انھوں نے بھوپال کے اکثر بزرگوں کے احوال تحریر فرماتے تھے۔ منجملہ ان کے پیر ابو احمد مرحوم کی وفات کا ذکر کیا تھا۔ اور لکھا تھا کہ سو برس سے زائد عمر پائی تھی۔ اور آپ نے نور میاں مرحوم کے حلقہ ذکر و تسبیح کا ذکر کیا ہے۔ ایک عربی ماہانہ جریدہ اب برلن میں زیر طبع ہے۔ امید ہے کہ آپ اس کو اہل علم میں پھیلانے کی کوشش کریں گے — اور کتاب الخلافت کو بھی شائع کرائیں گے۔ زیادہ خیریت ہے۔ واالسلام

کتبہ محمد برکت اللہ۔ بنام منشی شاکر حسین، سہسوان دانڈیا)

یہاں مولانا برکت اللہ کے ایک مخلص، ہم وطن قدر دان بھوپال — کے

قابل فخر فرزند مولانا ابوالنصیر سید احمد بھوپالی کے مکتوب تعزیت کا ذکر مناسب ہوگا۔

مولانا سید احمد بھوپال میں پیدا ہوئے اور مولوی سلطان علی کے نام سے بھوپال کے جامعہ احمدیہ میں تحصیل علوم کیا۔ قاضی محمد یحیٰ صاحب کے خصوصی شاگردوں میں سے تھے پھر مزید دورہ تکمیل کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد سے ربط وضبط قائم کر کے جامعہ ازہر پہونچے انھوں نے جامعہ ازہر میں درجہ تخصیص میں امتیاز حاصل کیا۔ اور ازہر میں درس وتدریس کی عزت حاصل کی پھر مصر کے علمی وادبی حلقوں میں اپنے مضامین سے نفس عظمت قائم کیا اور پھر وہیں کے ہو رہے۔

باسمہٖ تعالیٰ

قفا بنک من ذکری حبیب منزل

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

شاید جناب کو اس کا علم ہوگیا ہو اگر نہ ہوا ہو تو میں جناب کو اطلاع دیتا ہوں اور رنج والم میں غرق ہوں کہ آپ کے ہمارے معزز ہم وطن اور ہندوستان کے نامور لیڈر اسلام کے سچے مخلص مولانا برکت اللہ بھوپالی نے گذشتہ ماہ ستمبر ۱۹۲۷ء میں امریکہ میں اس دار فانی سے رحلت فرمائی انا للہ وانا الیہ راجعون ولیغفرہ اللہ بواسع رحمۃ ورضوانہ آمین۔

آہ! مولانا مرحوم کی وفات سے ہندوستان سے باہر سچی وطنیت واخلاص کا ایک بہت بڑا رکن منہدم ہوگیا۔ اور شاید اس عزم وحمیت کے لوگ بہت کم پیدا ہوئے کہ جنھوں نے چین، جاپان، بخارا، خیورا، سمرقند وتاشقند، افغانستان وایران، یورپ وامریکہ، خدمت وطن واسلام کے ایک ہی عشق اور دھن میں چھانا ہو اور دور دراز کے سفر کے مصائب وآلام کو خوشی خوشی محض اپنے اس عشق کی خاطر برداشت کیا ہو۔ ـــ

الحر حر فی الشعوب جمیعها　　　فی حجرۃ قد کا بدا دبلاد
والمجد لیس مقیدا بمعاشر　　　والعز لیس هوطنا ببلاد
جاهدت فی اعلاء هند لجاهدا　　　حتی تضیت لها شهید جهاد

فاذهب کما ذهب الربیع وقد کا　　　خضر الربیع هوشیة الاداد
ان ینفذ الحزن الاهوع فان لی　　　قلبا کثیر هوارد الاکماد

اگرچہ عاجز کو جناب کی خدمت میں شخصاً نیاز حاصل نہیں ہے۔ لیکن جناب کی سچی وطنیت کے عواطف و جذبات سے تعارف کے باعث مولانا مرحوم ہی ہوتے تھے اس لئے آج یہ خط جناب کی خدمت میں اس دردناک خبر کی اطلاع میں ارسال کر رہا ہوں اور غم اندوہ سے میری آنکھیں اشک ریز ہیں آہ ؎

لیتك عون العلے هلما　　　وکل بکاء علیه قلیل
اذا رقأت بعده ادمع　　　فان دموع الاخاء قلیل
خلیل نأی عن اخلائه　　　فقل للاخاء اددی الخلیل
لقد غالنا الموت فیه برزء　　　ولا غرو فالموت غول یغول
فما للعزاء الجمیل محب　　　وما للمحب عزاء جمیل
الا ان بین القلوب لحزنا　　　تزول الجبال ولیس یزول
لک الله عن نازل هزنا　　　ید وم به للنزیل النزول
تبدلت منه موطن موطنا　　　ولا غلبن هش الفصن المطول
رحلت لا رغبة انما　　　قضاء البریة هذا الرحیل
وقد عشت شهما وقد مت شهما　　　وهذی المعالی شهود عدیل

میں نے ارادہ کیا کہ مرحوم کے کارناموں کی ایک مختصر خاکہ ہندوستان کے جرائد میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ "زمیندار" "ہمدم" اور خلافت کو خطوط استفادًا لکھے کہ آیا وہ اس کے لئے تیار ہیں لیکن صدائے برنخواست جن ابنائے وطن کی حریت و آزادی کی کوشش میں مرحوم نے سارے عیش و آرام کو بالائے طاق رکھ کر اپنی عمر وقف کر دی ان کی بے وفائی کے مرحوم کے ساتھ یہ حال ہے۔

مخلص ابوالنصیر سید احمد بھوپالی

بروسیلز کانفرنس میں پنڈت نہرو سے ملاقات ۱۹۲۷ء

جب سامراج دشمنی عالمی کانفرنس کا پہلا اجلاس فروری ۱۹۲۷ء میں بروسیلز (بلجیم) میں منعقد ہوا۔ تو مولانا برکت اللہ بھوپالی غدر پارٹی کے سرکاری نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ مولانا دنیا کی مظلوم و غلام اقوام کی آزادی کے لئے بیحد موثر اور دل ہلا دینے والی تقریر کی اور اس مقصد کے لئے انھوں نے خود اور اپنی پارٹی کی جانب سے بھرپور تعاون دینے کا وعدہ کیا اس اجلاس میں مولانا کی نہرو سے پہلی اور آخری ملاقات ہوئی۔ جو انڈین نیشنل کانگریس کی طرف سے شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ راجہ صاحب میری کہانی میں اس ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ غلام ہندوستان کی حکومت کی متوازی حریت پرست ہندوستان کے پہلے اور آزاد ہندوستان کے پہلے وزیراعظموں کی پہلی آخری ملاقات تھی۔ اور وہ بھی سامراج دشمن عالمی کانفرنس کے پہلے اجلاس میں اس کانفرنس جرمن واپس ہو گئے۔ ان کے ساتھیوں نے سانس فرانسکو میں غدر پارٹی کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے کی دعوت دی جو نومبر ۱۹۲۷ء میں ہونے والا تھا۔ لیکن مولانا برلن پہونچتے ہی پھر اپنی پرانی بیماری ذیابطیش (شکر) کا شکار ہو گئے۔ اس بیماری

ہیں اپنے رفیق راجہ مہندر پرتاب کے ساتھ امریکہ روانہ ہوئے۔ جو ان کا آخری سفر تھا، اور یہی سفرِ آخرت ثابت ہوا۔ مولانا کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز یورپ میں جرمنی و فرانس اور سوئیزرلینڈ رہا۔ برلن میں ان کی یادگار وونڈروف کی وہ مشہور ہے۔ جو ولیم دوم قیصر جرمنی نے اتحادیوں کی مسلمان قیدیوں کے لئے تعمیر کرائی تھی۔

راجہ صاحب لکھتے ہیں کہ ۲۸/اپریل ۱۹۲۵ء کو امریکہ کے محبانِ وطن سے غدر پارٹی کے لئے جو چندہ جمع کر کے دو ہزار ڈالر دیئے تھے۔ جن میں سے ایک ہزار مولانا برکت اللہ کے لئے پالمیوا راشن بہاری بوس کے لئے اور بقیہ دیگر کارکنوں کے لئے۔ میں ٹوکیو میں رامیش بہاری بوس سے مل کر جرمنی پہونچا اور مولانا کے پاس ٹھہرا۔ اور وہ رقم ان کو دی آگے لکھتے ہیں کہ ۱۹۲۷ء میں مجھے ماسکو میں مولانا برکت اللہ بھوپالی کا خط تھرڈ انٹرنیشنل کے توسط سے ملا کہ میں جرمنی آکر ان سے ملوں۔ جب میں جرمنی پہونچا تو مولانا بیمار اور بہت کمزور تھے۔ میں ان کے قریب ایک کمرہ میں ٹھہرا۔ جب ہم ملے تو باتیں ہی باتیں کرتے چلے گئے۔ رات رات بھر کچھ بیتے ہوئے دنوں، اور گذرے واقعات کی یادیں اور اس قدر کمزوری اور علالت کے باوجود، پھر وہی عزم و جواب کے ساتھ آئندہ پروگرام کا ایک طولانی سلسلہ جاری۔

(میری کہانی ص ۔ ترجمہ)

مولانا آخری بار امریکہ میں

اور مختلف استقبالیہ جلسے

مولانا برکت اللہ بھوپالی ماسکو کو الوداع کہہ کر ۱۹۲۲ء سے لے کر وسط ۱۹۲۷ء تک یورپ میں جرمنی، سوئزرلینڈ اور فرانس میں رہ کر اپنی انقلابی سرگرمیوں میں لگے رہے اور انتھک ذوق و شوق کے ساتھ اپنے محبوب مقصد کے لئے تن من دھن کی بازی لگاتے رہے۔ جرمنی میں ان کی خاص یادگار وہ مسجد ہے جو وانڈروس کے مقام پر ۱۹۱۵ء میں جنگی قیدیوں کا کیمپ بنایا گیا تھا جو انگریزوں کے کرایہ دار ٹٹو بن کر جرمنی و ترکی کے خلاف لڑے تھے اور مولانا نے ان سپاہیوں کے دلوں میں برطانوی سامراج کے خلاف اپنی آتشیں تقریروں کے ذریعہ نفرت کے جذبات کو بیدار کیا تھا۔ ولیم دوم قیصر جرمنی نے ان مسلمان قیدیوں کے لئے لکڑی کی ایک مسجد تعمیر کرادی تھی جس کو بعد میں مولانا نے باقاعدہ شاندار مسجد کی شکل دی تھی راجہ صاحب نے اپنی کہانی میں لکھا ہے کہ ۲۸ اپریل ۱۹۱۵ء کو جب میں سان فرانسسکو سے چلا تو غدر پارٹی نے امریکہ کے وطن دوست ہندوستانیوں کے دو ہزار ڈالر چندہ دیا جن میں سے ایک ہزار مولانا کے لئے اور پانچ سو راش بہاری بوس اور بقیہ پانچ سو دوسرے کارکنوں کے لئے بھیجا۔ میں ٹوکیو میں راش بہاری بوس سے مل کر جرمنی پہنچا اور مولانا کے پاس ٹھہرا اور وہ رقم ان کو دی۔ پھر آگے لکھا ہے کہ ۱۹۲۷ء میں مجھے ماسکو مولانا برکت اللہ بھوپالی کا ایک خط تھرڈ انٹر نیشنل کے ذریعہ ملا کہ میں جرمنی آکر مولانا سے ملوں۔ جب جرمنی پہنچا تو مولانا بیمار

تھے اور بہت کمزور ہو گئے تھے۔ میں ان کے قریب ایک کمرے میں ٹھہرا جب ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب ہونے کا زریں موقع ملا تو بیتے ہوئے لمحات اور گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے اور رات رات بھر ان پرانی یادوں کو تازہ کرتے رہے۔ مولانا پر آثار پیری عیاں تھے۔ بڑھاپے نے ان کے سر کو سفید کر دیا تھا لیکن ان کا عزم و حوصلہ اب بھی جواں تھا اور اسی عزم جواں کے ساتھ وہ مستقبل کے لئے طولانی پروگرام تجویز کرتے رہے پھر مولانا نے یہ تجویز رکھی کہ ایک بار پھر ہم لوگوں کو امریکہ چلنا چاہیئے اور پرانے دوستوں اور ساتھیوں سے مل کر کوئی پروگرام بنانا چاہیئے۔ چنانچہ جون ۱۹۲۷ء میں مولانا نے جرمن فارین آفس سے تین ہزار مارک دو ہزار اپنے لئے اور ایک ہزار میرے لئے حاصل کر کے جرمن سے امریکہ کے لئے دو ہزار حاصل کیا ایک خوب صورت جرمنی جہاز پر ہم سوار ہو کر امریکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ سفر (جو مولانا کا سفر آخرت تھا) بیحد دلفریب اور دلچسپ تھا۔ اگرچہ مولانا ذیابیطس کی تکلیف سے سخت بیچین تھے اور صحت گرتی جا رہی تھی لیکن وہ ہنسی خوشی خدمت وطن کی خاطر اس مرحلہ سے گزر گئے۔ نیویارک پہنچ کر ہم اپنے پرانے جانے پہچانے ہوٹل ٹائمز اسکوائر میں ٹھہرے۔ مولانا کے ہندوستانی دوستوں نے پندرہ جولائی ۱۹۲۷ء کو ان کے اور راجہ صاحب کے اعزاز میں ایک شاندار و زبردست عصرانہ سیلون انڈیا سرائے ویسٹ نمبر ۴۹ اسٹریٹ میں دیا گیا۔ اور بھی متعدد استقبالیہ جلسے منعقد کئے گئے۔ ایک جلسہ میں مولانا برکت اللہ بھوپالی، ڈاکٹر سید حسین اور راجہ صاحب خصوصی مقرروں میں تھے۔ اس موقع پر شعلہ صفت ڈاکٹر بسنت کمار رائے ہمارے مخلص رہبر و دوست بن کر ہم سے ملے جنھوں نے امریکی حبشیوں کے سب سے بڑے لیڈر آنریبل مرقس گارڈی سے ملایا اور ان کے جلسہ میں مولانا نے اور راجہ صاحب نے تقریریں کیں پھر مولانا نے راجہ صاحب کو اپنے آئرستانی انقلابی دوستوں سے بھی ملاقات کرائی پھر ڈرائی وٹ کے ہندوستانیوں نے انٹرنیشنل ہاوس میں

ہم کو مدعو کیا۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں ہندوستان طلبہ کے فرائض کے موضوع پر اظہار خیال کی درخواست کی۔ ڈیولائٹ اور گاری میں مقیم ہندوستانیوں نے ہمارا پر جوش استقبال کیا۔ مولانا کے ایک قدیم دوست انقلابی آئرستانی لیڈر کیپٹن مونی تینتھ بڑے خلوص سے پیش آئے۔ جب ہم کیلوفورنیا کے لئے روانہ ہونے لگے تو وہاں کے مقیم ہندوستانیوں نے ایک معقول رقم کی تھیلی مولانا کو پیش کی جس کی وجہ سے ہم آرام دہ سفر کر سکے۔

گاری میں ہماری میزبان سیز زلوبیہ ایچ باکبی ایڈیٹر سنتھی جو اب مسز تھامسن ہیں یہاں بھی تقاریر کا سلسلہ جاری رہا اور پھر جب یہاں سے شکاگو پہنچے تو ہندوستانی دوستوں نے ہمارا پر جوش استقبال کیا۔ آخر میں کیلوفورنیا پہنچا ہوا تو غدر پارٹی کے ارکان نے زبردست شاندار استقبال کیا اور مولانا کی خواہش کے مطابق غدر پارٹی کے یگانتر آشرم وڈ اسٹریٹ نمبر ۵ سان فرانسسکو اسٹیشن پر پہنچے تو میں نے عرض کیا کہ آپ ہسپتال تشریف لے چلیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا میں سیدھا یگانتر آشرم جاؤں گا۔ ہم نے مولوی صاحب کو ایک اعلیٰ موٹر میں بٹھا کر آشرم پہنچا دیا۔ چودھری مہدی خاں کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ وہ مولوی صاحب کے لئے کھانا تیار کریں۔ ایک ہفتہ تک وہ مولوی صاحب کی خدمت کرتے رہے مولانا کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ اس وقت ڈاکٹر سید حسین لاس اینجلز میں لکچر دے رہے تھے۔ میں نے ان کو تار دے دیا تھا کہ مولوی صاحب سخت بیمار ہیں فوراً سان فرانسسکو چلے آئیے۔ وہ تیسرے روز آ گئے۔ اب مولوی صاحب کا مکمل چارج سید حسین نے لے لیا۔

مولانا برکت اللہ کے لئے آخری اعزازی جلسہ ۱۹۲۷ء

مولانا برکت اللہ بھوپالی کے اعزاز میں ریاست کیلوفورنیا کے شہر مرزیل میں

ایک زبردست جلسہ منعقد ہوا جس کے آٹھ سو ہندوستانی مولانا کے سننے کے لئے جمع ہوئے تھے جو مولانا کے استقبال کا آخری جلسہ ثابت ہوا۔ مولانا کی پرمشقت زندگی جو انقلابات عالم کے مرحلوں کے پیچ وخم سے گزر کر خود نذر انقلاب ہو گئی تھی۔ آزادئ ہند کی پینتالیس سالہ مسلسل جد وجہد، محنت وصعوبت نے ان کی ہڈیوں کو گھلا دیا تھا۔ خدمت وملک وملت کے تپتے ہوئے صحراؤں اور خشک چٹیل پھیلے ہوئے میدانوں پر چلنے والے مسافر کی اب منزل قریب آ چکی تھی۔ جان وتن کا رشتہ ابھی تک ضرور قائم تھا لیکن روح افلاکی اب جسم خاکی کو چھوڑنے کے لئے بیقرار تھی۔ ضعف وکمزوری انتہا کو پہنچ چکی تھی وہ گوشت پوست کا مجموعہ بے حد نحیف وضعیف اور حد درجہ لاغر ہو چکے تھے فلک شگاف نعروں کے درمیان اور تالیوں کی گونج میں وہ شجاعت وہمت کا مجسمہ، حریت وآزادی کا دلدادہ، عزم وحوصلہ کا سہارا لے کر کھڑا ہوا اور اپنے وطنی بھائیوں کی پذیرائی میں کانپتے ہوئے ہونٹوں سے شکریہ کے الفاظ نکلے اور ہواؤں کی لہروں میں بکھر گئے۔ مولانا کا چہرہ کھل گیا مجمع مسرت وخوشی جھوم اٹھا لیکن وفور جذبات نے زبان پر مہر لگا دی۔ وہ تیز وطرار زبان جو برطانوی سامراج کے خلاف چلتی ہوئی تلوار کی طرح کاٹ کرتی تھی اس کو چپ سی لگ گئی اب زبان کا کام آنکھوں نے انجام دینا شروع کیا۔ مولانا کی پلکوں میں مچلتے ہوئے آنسو ستارہ سحری بن کر لرزنے لگے اور غم وحسرت کے شبنمی قطرے آنکھوں سے ٹپک کر اور رخساروں پر ڈھلک کر چمکدار موتی بنے اور زمین پر بکھر گئے جن کی آب وتاب میں ہندوستان کا سنہری مستقبل دمک رہا تھا۔ مولانا کا پژمردہ چہرہ اہل وطن کی پذیرائی سے گلاب کی طرح کھل اٹھا وہ روشن چہرہ ایک آسمانی فرشتہ کی طرح معصوم وتاباں نظر آ رہا تھا ان کی آئینہ پیشانی کے درخشاں خطوط پچھلے مجاہدانہ کارناموں اور عظیم سرگرمیوں کی عکاسی کر رہے تھے سارے مجمع پر اپنے اس پرانے خادم بوڑھے انقلابی کی اس حالت کو دیکھ کر جو اس وقت اضطراب وحسرت کا مجسمہ بنا ہوا کھڑا تھا غمگینی کے بادل چھا گئے

بے اختیارانہ آہ وفغاں کی صدائیں بلند ہوئیں اور پورا منظر غم انگیز سسکیوں اور دلخراش ہچکیوں سے پرشور و معمور ہوگیا۔ مولانا نے اپنے مخلصوں، دوستوں، محبوں اور جاں نثاروں کے اس خلوص و محبت کو دیکھ کر اپنے آپ کو سنبھالا اور مکرر شکریہ کے جاں فزا نغمہ سے غمگین فضا کے اندر مسرت و شادمانی کی لہر دوڑا دی لیکن اب یارائے گفتگو نہ رہا اب صبر و شکیب کا دامن اس مردِ پُر وقار کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ مولانا نے راجہ صاحب کو تقریر کرنے کے لئے اشارہ کیا اور خود کرسی پر بیٹھ گئے یہ اس بزرگ انقلابی کا زندگی میں آخری دیدار تھا۔ وہاں سے مولانا کو ہسپتال لے جایا گیا۔ ایک روسی نسل یہودی مولانا کا معالج بنا اور سارے اخراجات پارٹی نے اپنے ذمہ لئے۔ علاج ہوتا رہا اور مرض بڑھتا گیا۔ ضعف و کمزوری آنکھیں دکھانے لگے۔ ایک ایک کرکے پرانے ساتھی (قویٰ) جواب دینے لگے۔ اب ہاتھوں میں وہ طاقت و جنبش نہ رہی تھی مگر آنکھوں میں دم باقی تھا۔ انھوں نے آخری الفاظ جو بسترِ مرگ کے ساتھیوں کے سامنے ادا کئے وہ یہ تھے:

"میں زندگی بھر پوری ایمانداری کے ساتھ اپنے وطن کی آزادی کے لئے جدوجہد کرتا رہا۔ یہ میری زبردست خوش قسمتی تھی کہ میری یہ ناچیز زندگی میرے پیارے وطن کے کام آئی۔ اس زندگی کو الوداع کہتے ہوئے جہاں مجھے افسوس ہے کہ میری زندگی میں میری یہ کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں وہاں مجھے اس بات کا بھی اطمینان ہے کہ میرے بعد میرے ملک کو آزاد کرنے کے لئے لاکھوں آدمی آگے بڑھ رہے ہیں جو سچے ہیں بہادر ہیں اور جانباز ہیں۔ میں اطمینان کے ساتھ اپنے پیارے وطن کی قسمت ان کے ہاتھوں میں سونپ کر جا رہا ہوں۔"

سانحۂ وفات

بالآخر وہ ایک غریب سپاہی زادہ جو بھوپال کی خاکِ پاک سے اٹھا اسی

سرزمین امن وآئین میں اس نے فکر وشعور کی آنکھیں کھولیں بھوپال کے سیدھے سچے مگر اخلاص کے پتلے اور فکر وشعور کے اندر گہرے استادوں کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا اور ان بزرگوں سے علم وعمل کا سبق سیکھا اور یہیں عقل وادراک کا پہلا غنچہ کھلا اور اس کے وطن کے باشندوں نے اس غنچہ نو شگفتہ کی پہلی بہار بھی دیکھی پھر اپنے وطن عزیز کی پیشانی پر لگے ہوئے کلنگ کو مٹانے اور محکومی وغلامی کے سیاہ داغ کو دھونے کے لئے آزادی ہند کا سنہرا خواب دیکھتے ہوئے لندن وبرلن، کابل وماسکو، ٹوکیو وسان فرانسسکو کی دیواروں سے ٹکراتا رہا۔ برطانوی شہنشاہیت کے قصر عظمت کو عمر بھر ڈائنامیٹ لگاتا رہا۔ اس نے وطن میں رہ کر ظالم کے مظالم کے اظہار میں کبھی جھجک محسوس نہ کی جبکہ انگریز سامراج کے خلاف کچھ کہنے سے بڑے بڑے بہادروں کے پتے پانی ہو جاتے تھے اور نہ وطن سے باہر اپنی آتشیں تحریروں سے خرمن ظلم کو خاکستر کر دیتے ہیں دریغ کیا۔ وہ عظیم دلاور بہادر جس نے برطانوی شہنشاہیت کے دل (لندن) میں بیٹھ کر بھی مخالفانہ ماحول کے اندر اپنے ملک کی پوری پوری وکالت کی اور فرنگی سامراج کے قلعہ میں معاشی استحصال اور اقتصادی غارت گری پر کھلے بندوں گولہ باری کی جس نے دیار غیر میں آزادئ ہند کے لئے آواز کو اونچی سروں میں اٹھایا اور ہر برطانیہ دوست حکومت سے ٹکر لی عیش وراحت سے محرومی وجلاوطنی کو ہنسی خوشی گوارا کیا لیکن حق بات کہنے میں کبھی نہ چوکا وہ میدان سیاست کا زبردست شہسوار بنا لیکن سیاست کی گندگیوں سے اس کا دامن پاک صاف رہا وہ جس کی سیاست نمود وشہرت، حصول اقتدار ودولت کی خواہش سے بلند وبالا رہی جس نے سیاست فاضلہ کو اپنا مشن بنایا اور سیاست فاسدہ کو ٹھکرایا۔ مشہور عالم فلسفی ابونصر فارابی نے اپنی کتاب "آراء المدینۃ الفاضلہ" کیا خوب لکھا ہے:

"سیاست فاضلہ سیاست برائے عوامی خدمت اور سیاست فاسقہ سیاست برائے حصولِ اقتدار وشہرت کا نام ہے"

پہلی سیاست انسانیت کو امن و امان اور خوشحالی سے ہمکنار اور دوسری سیاست فتنہ و فساد اور پریشان حالی و مفلسی سے ملکوں کو دوچار کرتی ہے۔ اس زمانہ میں جبکہ عام سیاست داں مؤخرالذکر سیاست کے چاکر بن کر اقتدار پرستی کی رسہ کشی میں گرفتار تھے اس بے غرض انسان اور بے لوث خادم خلق نے معیاری سیاست داں کا نمونہ بن کر تمام ہندوستان کی عموماً اور طبقہ علماء کی خصوصاً لاج رکھ لی اپنے وطن کے نام کو بے غرض سیاست کے افق پر چمکایا اور اخلاص مندی و انسانیت دوستی کا پرچم لہرایا۔ وہ مرد صحافی جس کے قلم کی یورش و روانی نے ذوالفقار حیدری کی یاد کو تازہ کیا اور جس کی آتشیں خطابت نے سحبان وائل کی خطابت کو زندہ کیا۔ گو خود اہل وطن نے اس کو کبھی یاد نہیں کیا لیکن اس مرد گرامی قدر نے وطن کی یاد کو کبھی نہیں بھلایا۔ وہ غربت کی جھونپڑی میں پیدا ہوا لیکن اس نے محلوں کے خواب نہیں دیکھے گو خود ان کے محلوں نے اپنے دروازے اس کے لئے کھول دیئے لیکن وہ خدمت کی کٹیا میں ہی رہ کر مگن رہا۔

بہرحال اس غریب پرور سرزمین (بھوپال) وہ مرد قلندر جو حکومت موقتہ ہند کا پہلا وزیر اعظم، غدر پارٹی کا ایک بانی، برلن کمیٹی کا سرگرم رکن، تحریک شیخ الہند کا جانباز سپاہی، ہفت زبان و اہل قلم جس نے انگلستان میں دین حق کی تبلیغ کی لیورپول میں عربی کی اور ٹوکیو میں اردو کی پروفیسری کی خدمت انجام دی اور مختلف اخبارات کو اپنے رنگارنگ مضامین سے مالا مال کیا اس مرد غیور کی غیرت نے اپنے ملک ہندوستان کے آزاد ہونے سے پہلے اپنے ملک میں واپسی کو گوارا نہ کیا۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی جو بین الاقوامی مشاہیر عالم میں علامہ جمال الدین افغانی کے دیکھنے والے نواب صدیق الحسن خاں بھوپالی کی صحبت میں بیٹھنے والے، مولانا عبیداللہ سندھی کی معیت میں ہندوستان کے لئے کام کرنے

تھے جو مشہور ہندوستانی انقلابی لالہ ہردیال، شیاما جی کرشن ورما، راجہ مہندر پرتاپ کے رفیق کار اور دمساز دہمراز تھے اور قیصر جرمنی ولیم ثانی، سلطان المعظم محمد خامس، غازی انور پاشا، امیر حبیب اللہ خاں، سردار نصر اللہ خاں اور شہرۂ آفاق روسی رہنما کامریڈ لینن، کامریڈ ترا طسکی، خان ہیڈن برگ جیسے سربراہان عالم سے جن کو ملاقات کا شرف حاصل تھا آخر اس مرد انقلاب و حریت کے لئے ستائیس ستمبر ۱۹۲۷ء کی رات آخری رات اور منگل کا دن ان کی زندگی کا آخری دن تھا جب انھوں نے اپنے ہندوستانی ساتھیوں کی موجودگی میں اپنا فرض انجام دیتے ہوئے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کی انا للہ۔

چار یا پانچ روز تک ان کی نعش کو رکھ کر کے دکھ دیا گیا پھر دفن کا مرحلہ آیا نعش کو سٹر کر کے چار دن رکھنے کے بعد دفن کرنے کے واقعہ کو منجملہ اور واقعات کے راجہ مہندر پرتاپ نے اپنی زبانی راقم السطور کو بھوپال تشریف آوری ۵۸-۵-۹ء میں بتایا تھا۔ بہر حال مولانا کے انتقال کی خبر بجلی کی طرح امریکہ میں پھیل گئی اور امریکہ کے مقیم ہندوستانیوں کے دلوں پر رنج وغم کے بادل چھا گئے۔ چند گھنٹوں کے اندر ایسوایشن اینڈ پریس آف امریکہ نے اس خبر کو یورپ ایشیا میں پہنچا دیا۔ جہاں جہاں ہندوستانیوں کو یہ غم انگیز خبر پہنچی انہوں نے مولانا کے ماتم میں اپنے کاروبار کو بند کر دیا۔ راجہ صاحب اپنی کہانی میں لکھتے ہیں کہ:

"اس جگر سوز و دلخراش نازک موقع پر میں نے مولانا صاحب کے بحیثیت قریب قریب دوست اور وارث ہونے کے تجہیز و تکفین کے فرائض انجام دیئے ان آخری رسوم میں ہندو مسلمان اور سکھ برابر کے شریک تھے۔ ہر ایک نے اپنے مذہبی عقیدہ کے مطابق رسومات ادا کیں۔ یہ بڑا یادگار دن تھا۔ ڈاکٹر سید حسین، ڈاکٹر رحمت علی، مسٹر پوری سنگھ مسٹر گودرام سنگھ سینکڑوں ہندوستانی اپنے اس عظیم انقلابی رہنما

کو خراج عقیدت پیش کرنے جمع ہوئے تھے۔ چہرہ نمائی کے ختم ہونے پر سینکڑوں سسکیوں اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ ان کی نعش کو ایک قیمتی صندوق میں بند کر کے سیکران ٹو سے میز وبل پہنچایا گیا اور وہاں کے مسلم قبرستان میں یہ کہہ کر دفن کر دیا کہ ہندوستان آزاد ہو جانے پر تمہاری خاک کو ہندوستان پہنچا دیا جائے گا۔ آخری رسوم مولوی رحمت علی، ڈاکٹر سید حسین، ڈاکٹر اورنگ شاہ اور راجہ صاحب نے مل کر ادا کیں اور اس جوہر گراں مایہ کو امریکہ کی سرزمین میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

مولانا کا بین الاقوامی اظہار غم و ماتم

مولانا کے انتقال کی خبر ہندوستان ایسوسی ایشن آف سینٹرل یورپ کے دفتر برلن میں جب پہنچی تو فوراً ایک تعزیتی جلسہ کیا گیا۔ چونکہ ایسوسی ایشن کے اکثر ارکان مولانا مرحوم کے ساتھی تھے اس جلسہ میں تقریر کرنے والوں میں نہ صرف ہندوستانی ہی تھے بلکہ روسی، افغانی، ایرانی، ترک و جرمن بھی تھے۔

ڈاکٹر منگل مورتی لکھتے ہیں:

"چھ ممالک کے جن نمائندوں نے اس جلسہ میں حصہ لیا سبھی نے مولانا مرحوم ایثار مجسم اور شہید انقلاب کہہ کر خراج عقیدت پیش کیا اور آزادی کے نام پر ہندوستان کے اس بہادر سپوت کی بے حد تعریف و توصیف کی۔"

سوویت روس کے نمائندہ نے اپنی تقریر میں کہا:

ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑنے والوں کے ساتھ سوویت یونین کو پوری ہمدردی ہے۔ جنگ آزادی میں کام آنے والے سبھی شہیدوں کی سوویت روس عزت کرتا ہے اور سوویت

نمائندہ کی حیثیت سے میں مولانا برکت اللہ کی یاد میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہوں۔"

ایرانی نمائندہ نے اپنی نذر عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا:

"برکت اللہ کا انتقال ہو گیا لیکن ان کا یہ جذبۂ آزادی لافانی ہے وہ ہمیشہ لافانی رہے گا۔ سبھی انقلابات کی بین الاقوامی شکل ہوتی ہے۔ کوئی انقلاب ایک ملک یا ایک جغرافیائی خطہ میں محدود نہیں رہتا بلکہ وہ تمام ملک کو متاثر کرتا ہے اس لئے کسی بھی ملک انقلابی شہید کو ساری دنیا کے آزادی پسند لوگ اپنا شہید مانتے ہیں اور اسی لئے اس سے محبت کرتے ہیں اس کی عزت کرتے ہیں اور عقیدت مندی کے ساتھ اس کو یاد کرتے ہیں۔ یہ شہید آزادی کے اس راستہ کی تخلیق کرتے ہیں جس پر جلد یا بدیر دنیا کی ساری قوموں کو چلنا ہے۔ اگر یہ شہید نہ ہوتے تو دنیا ایک اندھیری جگہ بن جاتی۔"

ایک ہندوستانی مقرر نے جلسہ کی کارروائی ختم ہونے سے پہلے یہ اعلان کیا کہ:

"مولانا برکت اللہ کی قربانی بیکار نہیں گئی یہ صحیح ہے کہ ان کی زندگی میں ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ پھر بھی ان کی زندگی ایک زریں روشنی پھیلانے والے چراغ کی طرح رہے گی جس کی روشنی میں ہندوستان کے لاکھوں نوجوان آزادی کے راستہ پر آگے بڑھیں گے جب کہ کروڑوں کاروباری اور صاحب ثروت آدمیوں کی یاد جو بڑی بڑی رقمیں کما کر کوٹھیاں کھڑی کرتے رہے اور اپنے پیٹ اور خزانہ بھرتے رہے خاک میں مل جائیں گے۔ برکت اللہ مرحوم ہمیشہ

غیر فانی رہیں گے۔ بغیر اس طرح کی ایثار کی روشنی کے دنیا بربریت کی تاریکی میں پڑی رہتی۔"

ایسوسی ایشن کے صدر کے آخری الفاظ تھے:

"یہ سچ ہے کہ ایک عظیم المرتبت انقلابی کی وفات ہوگئی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انقلاب زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔"

(برکت اللہ صفحہ ۸۷-۲۸۶)

شہیدانِ حریت اور مجاہدینِ آزادی کی یاد

خدا جانے شمع آزادی کے لئے کتنے جانباز پروانے تھے جنھوں نے اپنی قیمتی جانوں کو آزادی کے شعلوں کے نذر کیا اور کتنے متوالے اور جیالے ملک و ملت کے سپاہی تھے جنھوں نے اپنی زندگیوں کو جان جوکھم میں ڈال کر برطانوی تسلط کو بیخ بن سے اکھاڑنا چاہا۔ فرنگی سامراج کے قصر مستحکم کو اپنی زلزلہ افگن قربانیوں سے ہلا دیا اور اس کو کمزور بنا دیا۔ آج جو لوگ حصول آزادی پر فخر و مسرت کے نعروں سے فضا کو ہنگامہ زار بنائے ہوئے ہیں کیا ان کو بھولے سے بھی ان کا خیال آتا ہے کہ ان جوانمردوں کی یادوں کو تازہ کریں۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

اے مرغِ سحر چوں ایں شب تار — بگذاشت زسر سیاہی
واز نغمۂ روح بخش اسحار — رفت از سر خفتگاں خماری
بکشود گراز زلفِ زرتار — محبوبۂ نیلگوں عماری
یزداں بکماں شد نمودار — واز اہرمن زیست خواری

یاد آر زشمع مردہ یاد آر

یعنی جب غلامی کی شب تاریک ختم ہو جائے صبح کے روح پرور نغمہ سونے والے کی آنکھوں سے نیند کا خمار زائل کردیں آزادی کا سورج اپنی سنہری زلفوں کی گرہ کھول دے اور خدا کی مہربانی کے جلوے نمودار ہو کر افق عالم کو ضیا بار بنا

دیں اور شیطان اپنے شر انگیز ہتھکنڈوں سے قید و بند میں ڈال دیا جائے تو ان شمعوں کی یادوں کو فراموش نہ کرنا چاہئے جو جل جل کر رات کی تاریکی میں روشنی کا سامان بہم پہنچاتی رہیں اور اسی جانفشانی میں بجھ کر رہ گئیں۔

مولانا کی شخصیت

مولانا برکت اللہ مرحوم کا بیشتر زندگی کا حصہ انقلابی مساعی میں اس طرح بسر ہوا کہ وہ خود نذرِ انقلاب ہو گئے۔

خود ان کے بیان کے مطابق چھتیس سالہ حیاتِ سیاسی کا عرصہ لندن، امریکہ، ترکی فرانس، جرمنی، ڈنمارک اور یورپ کے دیگر مقامات، جاپان اور عرب ممالک افغانستان و روس میں گذارا ان کی قسمت کی طرح ان کے پاؤں میں بھی چکّر رہا۔ ان ممالک میں کہیں بھی مستقل طرح اقامت نہ ڈالی، انھوں نے زندگی کو مستقل سفر اور عمل کو حاصلِ حیات قرار دیا۔ اپنے مقصد سے پیار اور اس کی راہ میں ہر طرح کی صعوبتوں اور مشقتوں کو سرمایہ سکون و راحت سمجھا۔

نام و نمود، جاہ پسندی سے طبعی نفرت رہی اپنے ساتھیوں کو آگے بڑھانا اور خود کو ہمیشہ پیچھے رکھنا ان کا شیوہ خصوصی تھا۔ دنیا کے عام سیاست دانوں کی روشِ قیادت سے دلی بیر تھا اور اس عمومی رسم و راہ سے آپ ہمیشہ بیزار رہے ؎

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پر نازاں　　پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

اپنے ہم مقصد و ہم خیال ساتھیوں کے ساتھ گھل مل کر رہنا خصوصی شعار تھا۔ مولانا مرحوم کی جلاوطنی کی زندگی کا یہ مطمحِ نظر رہا کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے بیرونی بین الاقوامی طاقتوں کی ہمدردیاں حاصل کی جائیں اور ضرورت ہو تو فوجی طاقت سے برٹش گورنمنٹ کا تختہ الٹ دیا جائے۔

وہ اپنی شعلہ بار تحریروں کے ذریعہ اہلِ ملک کے انگریز دشمنی کے جذبات کو بھڑکاتے

رہتے تھے۔ وہ جہاں کہیں پہنچے خود چاہے خاموش زندگی گذارتے رہے ہوں مگر قلم شرر افشانیاں کرتا رہا اگرچہ خاموشی خصوصاً سیاسی مسائل میں ان کے بس سے باہر تھی مولانا مرحوم کی قوتِ گویائی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ مسلسل گھنٹوں گفتگو بات میں بات، تاریخی تمثیلات مورخانہ حوالہ جات سے لبریز ہوتی تھی عام نوجوان ان کی طولانی تقریر سے گھبرا گھبرا جاتے۔ فوق العادت حافظہ، بے مثال طرزِ استدلال کے مالک قوتِ اجتہاد سے بھرپور پیکرِ عمل اور مردِ انقلاب تھے۔

اخلاق و عادات

مزاج سادہ عموماً خاموش و کم گو، مستقل مزاج، صابر و شاکر، فطری سادگی کے حامل، کبھی عنفوانِ شباب میں بھی لباسِ فاخرہ استعمال نہ کیا۔ ظاہری زیب و زینت سے نفور اور جفاکشی و محنت پسندی کے خوگر تھے۔ سگریٹ و تمباکو اور دیگر منشی اشیا سے سخت پرہیز تھا۔ اخلاق کا یہ عالم تھا کہ مولانا موصوف ہر شخص سے خوش اخلاقی خندہ پیشانی سے ملتے، چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو بھی مسٹر، صاحب، ٹوارش (روسی لفظ معنی رفیق کے) مخاطب کرتے، کبھی کسی کی بدگوئی نہ کرتے، مذہبی تعصب سے بالاتر تھے۔ مذہبی پیشواؤں کا نام ادب و احترام سے لیتے، سیاسی نقطۂ نظر کے اختلاف کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے اس لئے ان کے رفقا میں آپ کے متعلق کبھی اختلاف نہ ہوا، باتیں رک رک کر فرماتے۔ باتیں کرنے میں تمام اعضا متحرک رہتے کبھی کسی کی بات دوسرے کے سامنے نہ دُہراتے۔

ذاتی وجاہت

مولانا مرحوم کی عظیم شخصیت سیاسی بصیرت جانفروشانہ جذبات اور زہرہ گداز قربانیوں کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص اُن کا ادب و احترام کرتا بڑے بڑے ترکی و روسی و ہندوستانی اور ایرانی و افغانی لیڈر اس طرح ان کے سامنے بیٹھتے جس طرح ایک

بزرگ کے سامنے بیٹھا جاتا ہے۔ بڑی بڑی مہمات اور عظیم تحریکات و معاملات کی عقدہ کشائی کے لئے بین الاقوامی زعما و قائدین (لیڈر) آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کی اصابتِ رائے کے قائل ہوکر جاتے اور اس مشورہ کی روشنی میں اپنے لئے راہِ عمل متعین کرتے۔ سوویت روس میں مولانا کی سیاست دانی کا لوہا مانا جاتا تھا۔ بڑے بڑے انقلابی آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے اور آپ ایک مشفق دوست کی طرح بڑے بڑے مشکل مسئلوں کو چٹکی میں حل کر دیتے تھے۔

مسز رائے (ایم این رائے کی بیوی) جنکو پروپیگنڈہ کا زعم باطل تھا ان سے ایک ساتھی نے کہا کہ مولوی صاحب پر بھی تو کچھ پروپیگنڈہ کیجئے، کہنے لگیں۔

یہ وہ چڑیا نہیں جو کسی کے جال میں پھنسے ان کے جال سے نکل آنا ہی بڑا کمال ہے۔ مسز رائے مولانا کو انقلابیوں کا دادا کہتی تھی اور چٹو پادھیائے عبدالوحید پارٹی میں مولانا کا کوئی نام نہیں لیتا تھا بلکہ ان کو دادا ابا سے ہر ایک یاد کرتا تھا۔ قیام ماسکو کے زمانہ میں روسی لیڈروں اور قونصل قانون کے علاوہ کبھی کسی کی قیام گاہ پر تشریف نہیں لے گئے بلکہ مختلف ممالک کے لیڈر خود ان سے ملنے آئے تھے مولانا کی خودداری نے یہ ننگ کبھی گوارا نہ کیا کہ وہ کاسۂ گدائی لیکر کہیں پہنچے ہوں۔

سیاسی و مذہبی خیالات

مولانا موصوف عوام کی بیداری کو ہر انقلاب کی بنیاد قرار دیتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء میں عوام بیدار نہ تھے وہ اس تحریک کو سمجھ ہی نہ سکے اس کے بجائے کہ وہ آزادی کی اس تحریک میں دوش بدوش کھڑے ہوتے اور تن من دھن کی بازی لگاتے اس کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہے۔

ان کی انقلابی فطرت کا تقاضا تھا اور وہ اس پر زور دیتے تھے کہ فوج و پولس میں انقلابی پروپیگنڈہ کی شدید ضرورت ہے تاکہ وقت آنے پر وہ بھی عوام کا ساتھ دے سکیں۔ مولانا کا سیاسی نقطۂ نظر یہ تھا کہ تمام سیاسی پارٹیوں کا مرکزی نقطہ ایک ہے

وہ انگریزی تسلط کو ہندوستان سے استیصال وخاتمہ، لیکن کچھ پارٹیاں آگے بڑھ گئیں اور کچھ مصالح میں پھنس کے پیچھے رہ گئیں۔

تحریک ترکِ موالات وغیرہ کے متعلق فرماتے۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جہاں مختلف الخیالات ومختلف المفاد افراد اور مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں کامیابی مشکل ہے اس کے ذریعہ نفرت و بیزاری کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں لیکن کامیابی نہیں ہو سکتی۔

اُن کا ذاتی خیال تھا کہ ملک کے نوجوان ملکی تحریک کو ہاتھ میں لیں اور تعلیم یافتہ طبقہ زائد سے زائد فوج اور دیگر محکمات میں گھس جائے اور ان پر قبضہ کر کے بیک وقت انقلاب برپا کر دیا جائے عوام کے علاوہ پروپیگنڈہ کا رُخ فوج و پولیس کے جانب کر دیا جائے اگر عوام اور فوج مل کر بغاوت کرے گی اس کے نتیجہ میں انقلاب یقینی ہے۔

مولانا کا دماغ پر غدر پارٹی کے نظریات کے جو نقوش عنفوان شباب میں مرتسم ہوئے وہ آخر تک مدھم نہ پڑے اور ان پر آخر دم تک ثبات واستقلال سے قائم رہے مولانا سے جب دریافت کیا جاتا کہ ہندوستان میں آپ کیسی حکومت چاہتے ہیں؟ تو فرماتے کہ انگریز سے آزاد ہونے کے بعد ملک کے باشندے اپنے لئے جس طرح کی حکومت مناسب سمجھیں گے، اختیار کریں گے بہرحال حکومت جمہوری ہوگی برکت اللہ کا یہ منصب نہیں کہ وہ طرزِ حکومت کا تعین کرے۔

شہنشاہی کے متعلق فرماتے ابتدا میں لوگوں نے اس کو اپنایا لیکن جب اپنے لئے سودمند نہ دیکھا تو اس کو زیر زمین دفن کر دیا۔

جب ان سے سوال کیا جاتا کہ کمیونزم کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ تو فرماتے کہ دنیا کا سب سے بڑا ملک اس کا تجربہ کر رہا ہے اس لئے ابھی اس پر رائے قائم کرنا مناسب نہیں۔ یہ چپقلش جو اس وقت دیکھ رہے ہو یہ ہر نظام کی تبدیلی کے وقت رونما ہوتی رہتی ہے اور اس کے لئے فرانس وانگلستان کے انقلابوں کے حوالہ جات دیتے۔

ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں جب دریافت کیا جاتا تو ہنس کر فرماتے کہ کیا روسی ریاستوں کا حشر تمہارے سامنے نہیں ہے؟ ہندوستانی ریاستوں کے جمود پر فرماتے اگر میں انگریزوں کا مشیر ہوتا توان کو مشورہ دیتا کہ برٹش امپائر کو ریاستوں میں تبدیل کر دیں اور مزے سے چین کی بنسی بجائیں کیونکہ دیسی رئیس لوگوں کو بدھو بنائے رکھنے کا گر خوب جانتے ہیں البتہ صدیق حسن خاں جیسا رئیس اس سے مستثنیٰ ہے۔

گاندھی جی کے متعلق ان کا نظریہ یہ تھا کہ وہ حالات کے مطابق آگے بڑھ رہے ہیں لیکن جو راستہ انھوں نے اختیار کیا ہے اس کے ذریعہ آزادی حاصل کرنے میں زیادہ عرصہ لگ جائے گا اور اس وقت کے حالات میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا۔

پین اسلامزم کے متعلق فرماتے کہ تاریخ شاہد ہے کہ یہ نظریہ کبھی شرمندۂ عمل نہ ہوا جس وقت اسلام کا دنیا کے بڑے حصہ پر تسلط تھا اور سب کچھ ممکن تھا لیکن فطرت انسانی نے اس نظریہ کو سرسبز نہ ہونے دیا۔

مولانا مرحوم کا مذہبی عقیدہ یہ تھا کہ تمام مذاہب کے بنیادی اصول حق وصداقت پر مبنی تھے لیکن بعد کی تحریفات سے اصل روح غائب ہو گئی۔

ذاتی خصوصیات

قرآن حکیم کی تلاوت مولانا مرحوم کا معمول تھا، آپ کے تعلقات تاتاری و ترکمانی علماء سے بہت گہرے تھے کوئی ہفتہ ایسا نہ ہوتا جس میں ایک دو بار مولانا ان کے یہاں نہ جاتے ہوں۔

مولانا کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ ان کو اپنے مضامین تیار کرنے میں کبھی حوالہ جات تلاش کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہوتی تھی کوٹ کرنے کی عبارتیں ازبر تھیں۔ اگر کسی واقعہ پر قلم اٹھاتے تو مورخ کا نام، کتاب کا نام، سنہ اور تاریخ کا حوالہ ضرور دیتے یہ بھی نوٹ کر دیتے کہ فلاں مؤرخ اس واقعہ کے اس قدر بعد گذرا ہے اور فلاں مؤرخ کا زمانہ قریب کا ہے اور اس لئے تاریخی مواد فلاں جگہ سے لیا ہے اس لئے فلاں معتبر ہے اور فلاں

غیر معتبر۔ تاریخی مذاق اسقدر غالب تھا کہ اپنی زندگی کے واقعات کو بھی بقید تاریخ بیان کرتے تھے۔

مولانا اردو، انگریزی، فارسی، عربی، مضامین قلم برداشتہ لکھدیتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی رٹا ہوا مضمون ہے جس کو قلمبند کرایا جارہا ہے نظر ثانی کرتے وقت خود کانٹ چھانٹ کرتے۔

عربی کے مضامین خود صاف کرتے تھے اور انگریزی کے مضامین حبیب احمد شاہجہاں پوری (جنھوں نے تھرڈ ایر سے کالج چھوڑا تھا) صاف کراتے تھے اور اردو فارسی کے مضامین جو نسبتاً کم ہوتے تھے ان کو بھائی رفیق احمد بھوپالی صاف کرتے تھے یہ مولانا مرحوم کے رازوں میں سے ایک سربستہ راز تھا کہ مولانا ان مضامین کو کہاں اور کس طرح بھیجتے تھے؟

اردو ان کی مادری زبان تھی فارسی و عربی میں مہارت بھوپال کی طالب علمی کے زمانہ ہی سے حاصل کر چکے تھے انگریزی میں لیاقت لندن و امریکہ میں بہم پہنچائی۔ ترکی و جرمنی و فرانسیسی میں بھی عمدہ استعداد حاصل کی روسی زبان بھی روس میں سیکھی غرض بے شمار مشرقی و مغربی زبانوں سے بخوبی آشنا اور علم الالسنہ سے طبعی مناسبت رکھتے تھے۔

حلیہ و شکل و شمائل

مولانا برکت اللہ ابتداءً چھریرے اور گٹھیلے جسم کے متوسط قامت انسان تھے چہرہ گول، آنکھیں قدرے چھوٹے، ابرو کشادہ، بلند پیشانی، چہرہ پر قدرے چیچک کے نشان شروع میں تھے، رنگ گورا شربتی، سر قدرے بڑا، ریش و بروت ندارد، سر کے بال سفید ہو گئے تھے۔ یورپ میں وہیں کا لباس استعمال کرتے تھے آخر عمر ۱۹۲۶ء کی تصویر سے معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں جسم کچھ بھاری اور رخسار ابھر آئے تھے۔

گھوڑے کی سواری اور تالاب میں نہانے اور تیرنے کے سوا اور کوئی شوق نہ تھا۔

ترکستانی بغاوت کے دروان میں دس دس میل دیہات میں سوار ہو کر جاتے اور امن و امان کی تلقین کرتے۔ ضعفِ بصارت اور پیرانہ سالی کی وجہ سے پیدل چلنے پھرنے میں تکلف ہوتا تھا خصوصاً ماسکو کی سڑکیں جو برف کی وجہ سے چکنی ہو جاتی تھیں ان پر بغیر سہارے کے نہیں چل سکتے تھے۔

اچھے جوتے پہننے کا خاص شوق تھا بہت قیمتی جوتے آپ کو پہنے ہوئے دیکھا گیا ہے یورپ کی زندگی میں یہاں کے بہت کم افراد سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہ سکا ایک تو اس وقت آپ کے ساتھ ادنیٰ تعلق بھی ریاستی زندگی کے لئے وبال جان اور حکومت کی نگاہ میں مشکوک بنانے کے لئے کافی ہوتا۔

دوسرے واقعتاً مولانا کی ہم خیالی و ہم مشربی یہاں عنقا کی طرح نایاب تھی۔ نواب علی حسن خاں (خلف اصغر نواب صدیق الحسن خاں) سے گاہے ماہے خط و کتابت ہو جاتی۔ ایک مرتبہ نواب صاحب موصوف کو تحریر فرمایا تھا۔

"اگر میں وہاں رہتا اور ظاہری جاہ و مناصب سے بھی مالامال ہوتا تو اس سے زیادہ تنخواہ نہ ہوتی جتنی رقم کا میرے پاؤں کا جوتا ہے۔"

مذاقِ شعر و شاعری

مولانا مرحوم جیسے انقلابی و سیاسی انسان کے لئے ذوقِ سخن ان کے مقام سے فروتر اور ان کے مشاغلِ حیات کی ضد ہے مگر فطرت کی طرف شعر و شاعری کی چاشنی بھی آپ کی طبیعت میں گھلی ملی تھی۔ اوقاتِ فرصت میں اپنے جذباتِ قلبی کو جو قومی و ملی زندگی کا آئینہ دار ہوتا۔ اشعار کے قالب میں موزوں کر کے پیش کرتے آج سے نصف صدی پیشتر کا نمونہ کلام ان کی طباعی و روشن خیالی کی عکاسی کر رہا ہے۔ تبرکاً چند ابیات درج کر کے ہم اس عظیم داستانِ انقلاب کو ختم کرتے ہیں جس کے آوازۂ شہرت سے ایک عالم گونج اٹھا تھا اور آج اہلِ ملک کی ناقدری و ناحق شناسی کی بدولت وہ ایک بھولی بسری داستان بن کر رہ گئی ہے۔

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

نمونۂ کلام

ایں گوئے گیتی را بہ بیں از امرکا تا حدِ چیں
از تار برقی برزمیں با حسن و جاں شد چوں بدن
روزانہ خواں صبح و مسا، اخبار را از ہر کجا
از قطب و خط استوا از ناروے تا کینٹن
ایں بحرِ اعظم را نگر در زیر فرمانِ بشر
با شہر ہائے در سفر مثل بروج و کہکشن
از برقِ شد قوت عیاں در کار ما خدمت کہاں
در نقل از ہر بر مکان در کار ضع و در کار فن

اب ہم اپنی اس حقیر تحریری کوشش جو مولانا کی عظیم شخصیت کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ غازی عبدالرحمٰن صدیقی کے مضمون کے آخری الفاظ پر ختم کرتے ہیں۔ اس لئے مولانا کی حیاتِ سیاسی ایک کھلی کتاب ہے جس کے اندر مقصد سے عشق اور اس کے حصول کی راہ میں اخلاص مندی کے ساتھ ہر طرح کی قربانی و جاں نثاری جس کے ہر ہر صفحہ اور ہر ہر سطر سے نمایاں ہے۔

صدیقی صاحب لکھتے ہیں۔

"مولانا اور ان کے ساتھیوں کا مطمحِ نظر اور اس کے حصول کا طریقہ اور اس پر عمل درست تھا یا نہیں اس سے بحث نہیں، دھن کے پکے تھے جو بات دل میں ٹھان لی اس پر اڑے رہے اور اس کے لئے جان تک قربان کر دی ۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے

مولانا نے اس پر عمل کیا زندگی بھر شاید کسی سے غصہ میں بات کی ہو گی ناراضگی کے اظہار کا سب سے سخت جملہ بڑا ہی خبیث ہے ہوتا تھا۔ خوشحالی کبھی نصیب نہ ہوئی لیکن ہر حال میں قانع و صابر رہا کرتے۔ بات چیت کرتے وقت ہاتھ بہت ہلاتے تھے، سڑک پر چلتے ہوئے کوئی اہم نکتہ ذہن میں آ جاتا تو فوراً رک جاتے چھڑی کو کہنی کے پاس لٹکا لیتے

دونوں ہاتھوں سے اپنا مطلب پورے جوش وخروش سے ادا کرتے مذہبی مسائل کا سمجھانا مولانا کا حق تھا، نہ صرف قرآن وحدیث بلکہ افلاطون ارسطو اور موجودہ زمانے کے فلاسفہ کے اقوال کی روشنی میں اس خوبی سے سمجھاتے کہ سُننے والا حیران رہ جاتا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا بہ رہا ہے جو چاہے فیض حاصل کرے۔ اگر مذہبی رجحان والے انھیں فرشتہ کہتے تو سیاسی احباب سچا قوم پرست قابلِ اعتماد شریک کار اور پکا دوست سمجھتے تھے۔ انگریزی زبان میں ایسے شخص کو انسانوں کا بادشاہ اور ترکی میں تاتلی یعنی میٹھا شیریں آدمی کہتے ہیں ایسے آدمیوں کا وجود باعثِ شرف وبرکت ہوا کرتا ہے۔

تحریک ہجرت اور اس کی داستان

ہجرت ترک وطنی کا دوسرا نام ہے اپنے مسکن یا وطن کو طلب معاش کے لیے یا دشمن کے غلبہ و تسلط کی وجہ سے چھوڑ دینا نوع انسان کی ہی خصوصیت نہیں بلکہ حیوانات خصوصاً پرندے بھی نقل مکانی کرتے چلے آرہے ہیں پرانے زمانے سے انسانوں کی جماعت اپنے وطن میں معاشی مشکلات میں پھنس جانے یا غنیم دشمن کے غالب آجانے پر اس قسم کا اقدام کرتی رہی ہے لیکن انسانی قدروں آزادی رائے آزادیٔ خیال یا دوسرے لفظوں میں آزادیٔ مذہب کی خاطر اپنے وطن اپنی آل واولاد اپنی مال وجائیداد کو ہنسی خوشی سے چھوڑ دینا ایک اعلیٰ انسانی نصب العین ہے۔ ہجرت کی تحریک اصلاً مذہبی تحریک ہے لیکن اس کا بنیادی مقصد حریت فکر ورائے آزادیٔ تحریر و تقریر یا اپنے مذہبی حقوق کا تحفظ ہے۔ جب کسی مقام پر جابر حکومت یا کوئی ظالم گروہ مذہبی آزادی پر پابندی عاید کردے تو دینی فرائض کی ادائیگی میں رخنہ اندازی پیدا کرے تو اوّلاً اس کا طاقت کے ساتھ مقابلہ (جہاد) ضروری ہے۔ لیکن اگر مقابلہ کی طاقت نہ ہو تو اس مقام واس ملک کو اس اعلیٰ مقصد کے لیے چھوڑ دینا، ہجرت کہلاتا ہے تاریخ مذہب میں سب سے پہلے دین حنیف کے بانی حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اس دشوار گذار اور کٹھن راستہ پر قدم رکھا اور اپنے وطن شہر اُر (حران) کو چھوڑ کر خدا کی وسیع زمین کنعان (فلسطین کی طرف) کوچ فرمایا انھیں کی سنت پر ان کے بھتیجے

حضرت لوطؑ نے معہ اہل وعیال کے اپنے وطن سے، ہجرت کی پھر اس ابراہیمی سنت کی تکمیل پیغمبر السلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے وطن مالوف مکہ معظمہ کو خیر باد کہہ کر فرمائی اگرچہ پیغمبر السلامؑ نے لا ھجرۃ بعد الفتح کہہ کر مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت ختم کرنے کا اعلان فرمایا لیکن اب بھی مذہبی فرائض کی ادائے گی میں کسی جگہ رخنہ اندازی پیدا ہو جائے تو ہجرت کا حکم اب بھی باقی ہے۔

دلی اللہی تحریک کے سلسلہ میں جب شاہ عبدالعزیز دہلوی ۱۸۰۳ء میں فرنگی سامراج کے خلاف ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دیا تو اس تحریک کے علمبرداروں نے فرنگی سامراج کو ہندوستان کی سرزمین سے اکھاڑ پھینکنے اور صالح حکومت قائم کرنے کا بوجھ تنہا اپنے کاندھوں پر اٹھایا اور سید احمد شہید کی سالاری میں ہنگامہ جہاد برپا ہو کر بالاکوٹ کی خونی شہادت پر ۱۸۳۸ء میں اختتام پر پہونچا جب کہ انگریزوں کے خلاف منصوبہ بند طریقہ پر عوامی محاذ آرائی کا تصور بھی برادرانِ وطن کے صفحہ خیال میں نہ ابھر سکا تھا اس پہلے مرحلے پر جب یہ تحریک شکست سے دوچار ہوئی تو امام ثالث شاہ محمد اسحٰق دہلوی معہ اپنے بھائی شاہ محمد یعقوب دہلوی کے حجاز کی طرف ہجرت فرما گئے۔

پھر دوبارہ ہندوستان کی عوامی جنگ جس کو غدر ۱۸۵۷ء کے رسوا کن نام سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ جہاد آزادی مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر منصوبہ بندی کے بغیر بھڑک اٹھنے اور فرنگی طاقت کے دبا دینے کی وجہ سے شکست کھا گئی تو چوتھے امام حاجی امداد اللہ صاحب جنھوں نے تھانہ بھون سے شاملی کے میدان تک معرکہ کارزار کو گرم کیا تھا مکہ معظمہ کی طرف ہجرت فرما ہوتے۔

یہ ہجرت ارباب عزیمت اشخاص کی انفرادی ہجرت تھی فرنگی سامراج کے تسلط کے بعد جنگ عظیم ۱۹۱۴ء اسلامیان ہند کے لئے قیامت صغریٰ بن کر آیا۔ تیرہ سو سال خلافت اسلامیہ جس کی آخری نشانی حکومت ترکیہ تھی نوجوان ترکوں نے مغربی سامراج کی سازش سے مسحور ہو کر اس مقدس قبا کو چاک کر کے عالم اسلام

میں ایک عظیم ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس وقت مسلمانانِ ہند نے جوش و خروش کا گویا دریا ابل پڑا تھا۔ ایک طرف علی برادران کی قیادت میں تحریک خلافت کے ملک کے طول و عرض میں ایک طوفان کھڑا کر دیا یہی پہلا موقع ہے کہ گاندھی جی کو خلافتی تحریک کے سلسلہ میں ملک کے کونے کونے کا دورہ کرا کے ملک میں روشناس کرایا دوسری طرف علی برادران کے پیر و مرشد مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے ہجرت کا فتویٰ دے کر جوشیلے نوجوانوں کے قافلے کو ایک خطرناک راستہ کی طرف موڑ دیا یہ وہ زمانہ تھا کہ امیر حبیب اللہ کے شہید ہو جانے پر غازی امان اللہ خاں افغانستان کے تخت پر بیٹھ چکے تھے اور فرنگی سامراج کے خلاف جہاد کے لئے موقع کے منتظر تھے۔ جب تحریک ہجرت کا غلغلہ برپا ہوا تو امیر موصوف نے اعلان کر دیا کہ افغانستان ہندوستانی مہاجروں کو خوش آمدید کہے گا اور ان کو پناہ دے گا امیر افغانستان کا یہ خوش آیندا علان ان کے ملّی جذبے کا آئینہ دار ضرور تھا لیکن ہزار ہا نادار و غریب الوطن مہاجرین کے قیام و طعام اور ان کی ضروریات کی ہمہ جہتی انتظام کے لئے جس منصوبہ بندی کی ضرورت تھی نہ امیر کے ذہن میں ان کا نقشہ تھا اور نہ افغانی حکومت اس مقدس بوجھ کو اٹھانے کی اہلیت رکھتی تھی۔ بہر حال ہجرت کی یہ ہنگامی تحریک ایک متوازن ہوش کے مقابلہ میں غیر معتدل جوش کی پیداوار تھی جس کا انجام وہی ہوا جو اس قسم کی تحریکوں کا ہوا کرتا ہے۔

ان مہاجرین کی صفحہ اول میں ۱؎ مولانا احمد علی مفسر لاہوری جو مولانا سندھی کے بھتیجے اور داماد تھے ۲؎ خان عبد الغفار خان جو بعد میں سرحدی گاندھی کہلائے ۳؎ سردار محمد اسلم بلوچستانی ۴؎ عزیز امرتسری ہندی اور لاہور کے چند گریجویٹ عبد الباری ایم۔اے، مولوی محمد یعقوب سیالکوٹی۔ جنہوں نے شیخ الہند کے ترجمہ قرآن کو فارسی میں منتقل کیا۔ جن کا اصلی نام احمد علی تھا ڈاکٹر رحمت علی ڈاکٹر شجاعت اللہ۔ میر ظفر حسن ایبک جن کے والد ریاست بھوپال میں ملازم تھے۔ ڈاکٹر خوشی محمد جالندھری جو مرزا محمد علی سے مشہور ہوئے۔

عبدالقادر آزاد، عبدالرشید، عبداللہ، عبدالرحمن، ماسٹر عبدالمجید، اور شیخ ابراہیم سندھی نومسلم وغیرہ تھے۔ ابتداءً طلباء کا یہ قافلہ گیارہ نفر پر مشتمل تھا بعد میں کوہاٹ وغیرہ کے مہاجرین اس قافلہ میں شامل ہو گئے لاہور کے یہ نوجوان طلباء خوش حال گھرانوں کے چشم و چراغ تھے ان کی داستان ہجرت اس طرح ہے کہ یہ پُرجوش طلباء۔ ترکی خلافت کے خاتمہ پر برطانوی سامراج کی چیرہ دستیوں کو دیکھ کر میدان عزیمت میں مردانہ وار کود پڑے اور ان کے جذبۂ آزادی اور جوش ملی نے اس راہ کی ہر مصیبت برداشت کرنے پر ان کو آمادہ کر دیا تھا۔ چنانچہ گھر کے عیش و راحت اعزاء و اقرباء کے تعلقات پر اپنے وطنوں سے نکل کر اولاگہری پور (ضلع ہزارہ) پہونچے وہاں کا اسٹیشن ماسٹر جوان ہجرت کرنے والوں کا ہمدرد مددگار تھا اس نے ان طلباء کو خوش آمدید کہا اور اپنے تعلقات سے مقام دربند پہونچا دیا جو رئیس امب کا مرکز تھا وہاں کے رئیس نے ان کو رات ہی میں دریائے اٹک کے اس پار کشتیوں کے ذریعہ اتار دیا حدود برطانیہ سے نکلنے پر اس قافلہ نے سجدہ شکر ادا کیا اور آپس میں عہد و پیمان کیا کہ جب تک سرزمین ہند سے وہ انگریزوں کو نکال نہ دیں گے اپنے وطن واپس نہ ہوں گے۔ دربند سے چل کر یہ قافلہ مجاہدین کے مرکز اسمست پہونچا جس کو سید احمد شہیدؒ کے ساتھیوں نے معرکہ بالاکوٹ کے بعد مرکز جہاد بنا رکھا تھا۔ لیکن ان کی درویشانہ شان اور بے سروسامانی کے ماحول کو دیکھ کر ان کی معیت و ہمراہی میں رہ کر اس عظیم مقصد میں کامیابی کی صورت دکھائی نہ دی ان غریب الوطن مجاہدین کے اخلاص و ایثار سے کس کو انکار ہو سکتا تھا۔ وہ عصری جنگی تقاضوں سے بے خبر اور جدید سامان حرب سے خالی ہاتھ تھے اس لئے ان مہاجرین کی نظر افغانستان کی طرف گئی جہاں غازی امان اللہ خاں کے اعلان پذیرائی سے کچھ امید کی جھلک آئی مگر جوں ہی ان شیدائیان آزادی کا یہ قافلہ جلال آباد پہونچا اس کو فوراً حراست میں لے کر کابل پہونچا دیا گیا۔ کیونکہ اس عرصہ میں امیر کابل اور برطانیہ میں سمجھوتہ ہو گیا تھا اس لئے افغانستان ان برطانوی

باشندوں کو کیوں کر پناہ دے سکتا ہے شہر کوتوال نے ان مہاجرین کو ہندوستان واپس جانے اور اس کے لئے سہولتیں دینے کی پیش کش کی جس کو سن کر یہ سب آتش زیر پا ہوگئے حکومت کے اس طرز عمل کو سے ان کو دلی صدمہ ہوا۔ اور انھوں نے ترکیہ بھیجدینے کی خواہش کی لیکن افغانستانی حکومت نے اپنے سیاسی مصالح پر ان طلباء کو بھینٹ چڑھا کر سب کو نظر بند کر دیا۔ جب کابل میں ہندوستانی ترکی وجرمنی وفد کابل پہونچا تو مولانا برکت اللہ اور راجہ صاحب کی سفارش سے یہ بیچارے آزاد ہوئے بعد میں جب کابل حکومت موقتہ قائم ہوئی تو ان میں کچھ لوگ اس کے عہدیدار بنائے گئے لیکن، ہجرت کی یہ تحریک جیسا کہ عام خیال ہے پنجاب و سرحد تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ اس آگ کے شعلے بلند ہو کر ملک کے ہر گوشے میں پھیلے چنانچہ ریاست بھوپال جو برطانوی ہند کی سیاست سے الگ تھلگ رہی تھی وہاں بھی اس کی چنگاریاں اڑ کر پہونچ گئیں۔ راقم الحروف کے مخلص ارادتمند بھائی رفیق احمد مرحوم ہجرت کا یہ مختصر سفر نامہ سب سے پہلی بار پیش کرنے کی سعادت اس کو حاصل ہوتی ہے۔

اس سفر کا آغاز اس وقت ہوا جب تحریک خلافت شباب پر تھی اپریل ۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی دہلی کی طرف سے اعلان شائع ہوا کہ ۱۸/ اپریل ۱۹۲۰ء کی ہونیوالی کانفرنس میں آزادی پسند حضرات سر سے کفن باندھ کر آئیں اور جہاد آزادی میں حصہ لینے کے لئے کانفرنس میں شرکت کریں بھوپال کے سیدھے سادھے سچے مسلمان عوام نے اس اعلان سے یہ سمجھا کہ اس کانفرنس میں برطانیہ کے خلاف اعلان جہاد کر دیا جائے گا لہذا بھوپال کے سر پھرے جوشیلے نوجوانوں کا ایک قافلہ پرانے ہتھیاروں سے مسلح دہلی روانہ ہوگیا جس کے اندر مشہور پٹھان آفتاب علی خاں، بھائی رفیق احمد، محمد علی وکیل، عبدالحی عرف بدو میاں ماسٹر مشکور، محمد خاں وکیل، احمد کبیر احمد محمد شفیع محمد اختر صاحبان تھے۔ خلافت ترکیہ کے خاتمہ کے اعلان پر اسلامیان ہند میں عجیب وغریب بے پناہ

جوش ابل پڑا تھا۔ اس لئے حکومت نے خفیہ پولس کا جال تمام ملک میں بچھا دیا تھا اور کانفرنس میں جبہ و دستار پہنے ہوئے سی آئی ڈی کے آدمی آتے جاتے رہتے تھے بھوپالی وفد جہاں ٹھہرا ہوا تھا وہاں ایک رضا کار نے ایک شخص کی بابت سی آئی ڈی کا آدمی ہونا بتایا۔ اس پر آفتاب علی خاں نے کبیر احمد کی طرف اشارہ کیا انھوں نے کان پکڑ کر نکالنا چاہا جس پر اس نے مزاحمت کی۔ آفتاب علی خاں نے لات مار کر اس کو زینہ سے نیچے ڈھکیل دیا جس جرأت رندانہ کو دیکھ کر خلافت والوں نے اس بھوپالی وفد سے اور کام لینا چاہا چنانچہ امام صاحب جامع مسجد دہلی کے متعلق ان کو بتایا کہ وہ سرکار پرست اور پکے لوڈی ہیں۔ آفتاب علی خان نے مشورہ کر کے طے کیا کہ آج مغرب کی نماز امام صاحب کو نہیں پڑھانے دی جائے جب امام صاحب آگے بڑھے تو انھوں نے کہا آپ ہٹ جایئے ہم آپ کے پیچھے نماز نہیں پڑھیں گے انھوں نے کچھ کہنا چاہا تو کبیر احمد نے ان کے دھول رسید کی کہ دستار گر پڑی آفتاب علی خاں نے لات ماری جس سے وہ بیچارے ضعیف خود گر پڑے بھائی کبیر اور شفیع احمد نے ان کو اٹھا کر حوض پر لا کر چھوڑ دیا۔ دوسرے دن کانفرنس کا آغاز ہوا۔ جو تجاویز پاس ہوئیں وہ بھوپالی قافلے کے خیالات کے اعتبار سے بالکل ٹھنڈی تھیں۔ کہاں جہاد کی شورا شوری اور کہاں تجاویز کی یہ بے نمکی آفتاب علی خاں یہ کہہ کر اور ناراض ہو کر کہ یہ لوگ صرف زبانی جمع خرچ کرنا جانتے ہیں بھوپال واپس ہو گئے اب دہلی میں عبدالحیٔ شکور، محمد خاں، محمد شفیع، محمد اختر کبیر احمد اور بھائی رفیق رہ گئے کانفرنس کے دوسرے دن ہجرت کی تجویز اس قدر زور و شور سے پیش ہوئی کہ خلافت کی تحریک تو دب گئی اور ایک جم غفیر ہجرت کے لئے اٹھ کھڑا ہوا ادھر امیر امان اللہ خاں کے اعلان میں پہلے سے جوشیلے لوگوں میں ہیجان پیدا کر رکھا تھا اس لئے کچھ ہوش مند اور سمجھدار لوگ بھی اس دھارے میں بہہ گئے جو لوگ اس تحریک میں پیش پیش تھے وہ خالص جذباتی لوگ تھے بھوپال کے باقی ماندہ قافلے نے کہا کہ جب ہم اللہ کے راستہ میں نکل آئے ہیں تو اب وطن کیوں واپس ہوں ملک لال محمد جو گجرانوالہ کے باشندے تھے انھوں نے اس قافلے کو سرحد پار کرانے کا وعدہ کیا

اور گجرانوالہ پہونچنے پر راولپنڈی قطب الدین صاحب کے نام خط دیکر بھیجدیا کہ وہ انتظام کردیں گے انھوں نے قافلے کو پشاور روانہ کردیا اسٹیشن پر پہونچتے ہی پولس نے روک لیا قافلہ کے لوگ منتشر ہو گئے۔ جو ہجرت کا پختہ ارادہ کر کے نکلے تھے وہ ایک رہبر کے ساتھ راتوں رات چل کر سرحد پار روانہ ہوئے۔

وہاں پولٹیکل ایجنٹ عبدالقیوم صاحب ملے قافلے کے ساتھی عبدالحی ملے اور اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ انھوں نے سپاہیوں کے ذریعہ گرفتار کر کے بھائی کبیر احمد رفیق بھائی اور عبدالحی صاحب کو ہتھکڑی ڈال کر پشاور بھیجدیا۔ انسپکٹر جنرل ایڈن کے ساتھ جب ان کو پیش کیا گیا تو اس نے چھوڑ دیا اور کہا کہ درۂ خیبر کے راستے سے جا سکتے ہیں عبدالحی صاحب تو پشاور ہی رہ کر عملیات میں لگ گئے اور یہ دونوں بھوپالی مہاجر حاجی خان محمد پشاوری سے ملے جو تحریک ہند کے سرگرم رکن تھے۔ انھوں نے جمروت کے راستے سے جانے کا مشورہ دیا اسی اثناء میں لاہور مردان اور پشاور کے دو دو تین تین آدمی اسی مقصد کے لئے اکٹھے ہو گئے بارہ آدمیوں کا قافلہ تربیت پا کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ قلعہ جمروت پہونچ کر نام سکونت پیشہ وغیرہ قلم بند کیا گیا اور کبیر احمد صاحب کو روک لیا گیا۔ انھوں نے اشارے سے قافلے سے آملنے کو کہا بقیہ لوگ مجبوراً سرحد پار پہونچ گئے۔

جب افغانستان کی سرحد میں قدم رکھا تو دو افغان سپاہی خستہ و شکستہ حالت میں نظر آئے اور آگے خام راستہ دکھائی دیا ایک طرف انگریزی علاقہ میں دو منزلہ پختہ چوکیاں تین تین پختہ سڑکیں باقاعدہ وردی پہنے ہوئے سپاہی سینکڑوں موٹریں اور سامان رسد کے ذخیرے دیکھ کر آئے تھے اب دوسری طرف کچی سڑک پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے فوجی ایک چھولداری میں دکھائی دیئے اس منظر کو دیکھکر ہندوستانی قافلہ کے سامنے کابلیوں کی لنترانیوں کی قلعی کھل گئی۔ اور جو کچھ فرضی امیدیں امیر کابل سے باندھی گئی تھیں وہ سب کافور ہو گئیں جہاں درہ خیبر ختم ہوتا ہے وہاں پانی کا انتظام تک نہیں تھا۔ افغانی سپاہی ہندوستانی

سرحد سے پانی لے جاتے تھے۔ سرحد سے چل کر قافلہ سیدھے ڈکا پہونچا جو افغانی چھاونی تھی بریگیڈیر جنرل عبدالقیوم خاں نے استقبال کیا نہایت خوش اخلاقی سے ملے۔ کھانا کھلایا گیا اور پاسپورٹ سب کو دے دیا گیا غلام نبی خاں بریگیڈیر پرتپاک طور پر ملے۔ مہمان خانے میں اتارا گیا۔ جرنل صاحب نے دیدہ طور پر افغانوں کی شکست کا ذکر کیا۔ شام کو جرنل نادر خاں نے کھانے پر مدعو کیا ہر ایک سے مصافحہ کیا وہاں سے جلال آباد پہونچ کر قافلہ اترا۔ کابل تک کا وہ کوہستانی راستہ بہت خراب تھا۔ ٹٹوؤں پر سوار ہو کر جب بسجاک قافلہ پہونچا تو کابل کی زمستانی ہوا نے قافلہ کا استقبال کیا جس سے ہندوستانیوں کے ہاتھ پاؤں پھٹ گئے خون جھلک آیا آگ کے تاپنے سے جان میں جان آئی۔ یہاں سے کابل تک کا راستہ میدان تھا اس لئے بآسانی کابل پہونچے کابل پہونچنے سے پہلے بابر کا مقبرہ اور بلند حصار دکھائی دینے لگتا ہے۔ دارالسلطنت داخل ہو کر سردی کے جھونکوں نے قافلہ کا خیر مقدم کیا۔ اور یہ قافلہ وزارت خارجہ میں پہونچایا گیا جہاں امیر صاحب کا اجلاس لگتا تھا۔ مستشار اللہ صاحب نے آداب شاہی کی تعلیم دی جب امیر صاحب کے اجلاس میں قافلہ پہونچا تو انھوں نے ہر ایک سے مصافحہ کر کے فرمایا کہ آپ لوگوں کی آمد غیر متوقع تھی اس لئے سفر کی سہولتوں کا انتظام نہ ہو سکا۔ جو کچھ ہندوستان میں ہو رہا ہے اس کا مجھے علم ہے اس کی خوشی ہے کہ دنیا کو معلوم ہو گیا ہے کہ افغانستان تنہا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ آٹھ کروڑ ہندوستانی مسلمان ہیں۔ ہمارے مخالف اپنی من مانی نہیں کر سکیں گے۔ دولت افغانستان صرف افغان قوم کی نہیں ہے بلکہ ہر مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں رہتا ہو برابر کا شریک ہے۔ اس قافلہ کے پہونچنے پر ٹیلیفون سے ہندوستان کے دوسرے قافلہ کے داخل ہونے کی اطلاع ملی اور کہا گیا کہ جو تکالیف آپ کو پہونچی ہیں اب آنے والوں کو نہیں ہونگی سردست جبل السراج میں آپ کے قیام کا انتظام کیا گیا ہے امیر نے کہا کہ ہر شخص کو اس کی قابلیت کے لحاظ سے کام

دیا جائے گا افغانستان معدنیات کے لحاظ سے اور ملکوں سے پیچھے نہیں ہے جہاں انجینیروں اور میکانک قسم کے لوگوں کی ضرورت ہے ملک مفلس اور قلاش خزانہ تہی اور فوج ناتربیت یافتہ اسلحہ اور ہتھیار برائے نام، آمد ورفت کے ذرائع مفقود اور قوم جوشِ جہاد سے خالی ہے۔ ان حالات میں جنگ کا ارادہ ملک کو بربادی کی دعوت دینا ہے۔ امیر کی تقریر کے اختتام پر ان کے ہمدردانہ جذبات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا گیا کہ مہاجرین یہاں نہ ملازمت کے لئے آئے ہیں نہ کاشت کاری کے لئے ان کو سرفروشی کا جذبہ کشاں کشاں یہاں لایا ہے اس لئے ہم کو آزاد قبائل جانے کی اجازت دیدی جائے امیر نے جواب دیا کہ ہمارا وفد شملہ گیا ہوا ہے ہم برطانوی حکومت سے گفتگو کے بعد ہی کچھ کر سکیں گے۔ یہ سن کر اور لوگ تو خاموش ہو گئے لیکن خان محمد نے کہا ہم تو جہاد کے لئے آئے ہیں۔ جہاں جہاد ہوگا وہاں چلے جائیں گے جبل السراج نہیں جائیں گے۔ امیر نے پھر کہا کہ تم سب وہیں چلے جاؤ اس پر خان محمد نے للکار کر کہا کہ اگر توپ سے باندھ دو تب بھی ہم وہاں نہیں جائیں گے امیر نے کہا دیکھا جائے گا اس وقت امیر صاحب کی مونچھوں کے بال غصّہ کی وجہ سے کھڑے ہو گئے تھے جب وہاں سے باہر آئے تو دیکھا کچھ ہندوستانی ہمارے انتظار میں دروازے کے باہر کھڑے ہیں اور ہم سب کو بلا رہے ہیں جب ان کے پاس پہونچے تو انھوں نے معانقہ کر کے کہا مولوی عبدالرب صاحب نے آپ سب کو چائے پر مدعو کیا ہے اور وہ آپ کے منتظر ہیں۔ وسیع میدانوں چمن زاروں کو طے کرتے ہوئے جب روسی قونصل خانہ پہونچے تو ایک کمرے میں ان سے ملاقات ہوئی وہ ایک معمر سفید ریش ذی علم آدمی تھے۔ ایک تکیہ سے ٹکے ہوئے بیٹھے تھے اور اچار یہ ان کے بازو میں تھے انھوں نے چائے نوشی سے فراغت کے بعد فرمایا کہ اس وقت ترک یونانیوں سے برسرِ جنگ نہایت ابتر حالت میں ہیں انگریز یونانیوں کی مدد کر رہے ہیں۔ مجھے اناطولیہ میں امیر امان اللہ خاں کی انگریزوں کے اعلان جنگ کی اطلاع ملی اس

لئے مجھے یہاں بھیجا گیا ہے کہ آزاد قبائل کے ذریعہ افغانستان کو طاقت پہونچا کر انگریزوں کے خلاف نیا محاذ قائم کریں۔ لیکن یہاں آکر اندازہ ہوا کہ امیر صاحب کی پالیسی یہ ہے کہ صرف لڑائی کی دھمکی کے ذریعہ انگریزوں سے مراعات حاصل کرکے ہر قیمت پر صلح کرلی جائے۔ اس لئے میں نے واپس جانے کا فیصلہ کیا ہے جو میرے ساتھ جانا چاہے اس کو حکومت ترکیہ کے مصارف پر لے جاؤں گا اور کل امیر صاحب سے ملاقات کرکے اس کی اجازت حاصل کرلوں گا۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے اپنے نام لکھائے پانچ پانچ پونڈ (۱۸ / روپے) ان کو دے دیئے گئے لیکن ہمارے قافلہ نے اس کی حامی نہیں بھری۔ اور وہ وزارت خارجہ کی طرف لوٹ آئے۔ یہاں پہونچکر عبدالولی خاں سے (پشاوری جن کو حکومت نے لولے خاں کا خطاب دیا تھا ملاقات ہوئی جو بھوپال رہ چکے تھے۔ رفیق بھائی کو دیکھ کر انھوں نے پہچان لیا اور بغل گیر ہوئے ان کے ذریعہ سے یہ بات معلوم ہوئیں کہ ہندوستانیوں کے یہاں تین گروپ ہیں مولانا عبیداللہ سندھی کا، دوسرا عبدالرب صاحب کا اور تیسرا خود عبدالولی خاں کا تھا۔ اور ہر گروپ دوسرے کو انگریزوں کا جاسوس کہتا تھا۔ عبدالولی خاں نے اپنا قصہ بیان کیا کہ وہ امیر کے حکم سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ یاغستان گئے تھے تاکہ قبائلیوں کو جہاد پر آمادہ کرکے انگریزوں کی پیش قدمی کو روک دیں امیر نے ان قبائلیوں کیلئے رسد پہونچانے کا وعدہ کیا تھا لیکن جب قبائلیوں نے حملہ کرکے انگریزوں کی پیش قدمی کو روک دیا تو اس وقت جرنل صلاح الدین مقام ڈکا میں اپنی افواج کو چھوڑ کر بھاگ نکلا اور فوج بھی بھاگ گئی نہ رسد پہونچی نہ کوئی مدد اس لئے مجھے بھی وہاں سے بھاگ کر جلال آباد میں پناہ لینی پڑی۔ جس کا قلعہ خالی پڑا ہوا تھا اور میگزین لوٹ لیا گیا تھا چنانچہ ہم نے وہاں پہونچ کر قلعہ کو قبضہ میں لیا اور قلعہ کی حفاظت کے لئے توپیں چلائیں انگریزی فوج بھاگ کھڑی ہوئی جس کی وجہ سے مجھ کو لولے خاں کا خطاب ملا۔ عام پروانگی بھی

دے دی گئی اسی گفتگو کے دوران میں ہندوستانی مہاجرین میں اکبر خان، اکبر شاہ گوہر رحمن اور سلطان محمد بھی ہندوستان سے آ پہونچے یہ لوگ ابھی پہونچے ہی تھے کہ مولانا عبیداللہ سندھی اور اور مولوی بشیر صاحب بھی تشریف لے آئے جن کو لولے خاں نے دور سے دیکھتے ہی کہا کہ یہ حضرات امیر سے تنخواہ بھی لیتے ہیں اور انگریزوں سے مخبری بھی کرتے ہیں مولوی محمد بشیر صاحب کیونکہ بھوپال مفتی عبدالہادی صاحب اور مولوی فاروق صاحب کے یہاں تشریف لاکر کئی کئی دن مہمان رہتے تھے موصوف نے بھائی رفیق کو پہچان لیا اور ان کو اپنے پاس رکھنا چاہا اس وقت یہ عقدہ کھلا کہ مولوی بشیر صاحب مجاہدین سمرقند کی امداد کے لئے بھوپال آئے تھے لیکن چوں کہ کابل میں رہ کر امیر صاحب کے حکم کی سرتابی یا ان کے لئے کسی قسم کی لب کشائی نہیں ہو سکتی تھی اس لئے سب کو پریشانی تھی رات کو یہ طے کیا گیا کہ رفیق بھائی اور محمد خاں سمرقند چلے جائیں جب رات ہوئی تو مولوی صاحب غائب ہو گئے خدا جانے امیر صاحب نے گرفتار کیا یا روپوش ہو گئے غرض دو تین روز میں جبل السراج پہونچا دئے گئے کچھ ہندوستانی اخبار اس وقت ہاتھ لگے جن کے اندر سردار نصراللہ خاں کے انتقال کی خبر ملی۔ حالانکہ خود کابل کے لوگوں کو اس کا کچھ علم نہیں تھا وہاں تمام امور پردہ راز میں رہتے تھے۔ اسی اثناء میں عبدالقادر مجاہد سے ملاقات ہوئی ان کا مشورہ بھی کابل کے بجائے سمرقند جانے کا ہوا۔ لیکن وہ بھی امیر کے خوف سے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ پھر ۱۹۲۳ء میں رفیق بھائی کی پشاور جیل میں ملاقات ہوئی جہاں بیس سال کی سزا بھگت رہے تھے۔ پھر ناگپور جیل منتقل ہوئے اور ۱۹۳۹ء میں رہا ہو کر بھوپال آئے اور چند ماہ قیام کے بعد جب عالم گیر جنگ کا آغاز ہوا تو بھوپال سے یہ کہہ کر غائب ہو گئے کہ اب کام کا وقت آ گیا ہے پھر ان کا پتہ نہ چل سکا۔

جبل السراج جہاں ہندوستانیوں کو نظر بند کیا گیا تھا وہاں کابل

کا بجلی گھر تھا۔ جس کو انگریز امریکن انجینیر دو ہزار روپئے کی بڑی تنخواہ پر بلائے گئے تھے لیکن کچھ پرزوں کی کمی کا غدر کر کے بجلی گھر چالو نہیں کرتے تھے۔ پھر چند روز بعد عبدالعزیز اس بجلی گھر کے انچارج ہو کر آئے امیر نے ان کو معائنہ کی دعوت دی۔ انھوں نے اس کو دیکھ کر رپورٹ دی کہ ان پرزوں کے بغیر بھی بجلی گھر چالو کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ کسی کو مزاحمت کی اجازت نہ دی جائے امیر نے اس شرط کو منظور کر لیا تو ہفتہ ہی کے اندر پاور ہاؤس چالو کر دیا گیا اور کابل شہر جگمگا اٹھا تب امیر صاحب نے ان انجینیروں کو رخصت کیا۔ ۱۱/ سو روپئے مشاہرہ مقرر ہوا۔ اور ایک کابلی وزیر کے ماتحت کر دیا گیا۔ جب کہ ان انگریز انجینیروں کو آزاد کر رکھا تھا۔ اسی دوران ترکی جرنل جمال پاشا کابل آئے افغانی فوجوں کی عسکری تربیت کی انھوں نے پیش کش کی تو ان کو بھی جرنل نادر خاں کے ماتحت کر دیا گیا ایسے ہی عبدالحفیظ ہندوستانی نے جرمنی سے کابل پہونچ کر ایک بم فیکٹری کھولنے کی خواہش کی لیکن یہ شرط لگائی کہ وہ کسی وزیر کی ماتحتی قبول نہیں کریگا۔ یہ شرط نامقبول ہوئی وہ جرمنی چلا گیا۔ بم فیکٹری کا منصوبہ ٹھپ ہو گیا۔ اسی طرح جمال پاشا کابل کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر ترکی واپس ہو گئے۔ عبدالعزیز بنگالی جب پاور ہاؤس دیکھنے آتے تو ہندوستانیوں سے ملتے ان کے ذریعہ صیغہ راز روسی قونصل خانہ سے گفتگو ہو کر تمام معاملات طے ہو گئے۔ اس دوران عبدالرحیم میرٹھ ملیٹری کالج کے اسٹوڈنٹ ہمارے ساتھ تھے ان سے صبح شام پریڈ کا کام سیکھنا شروع کر دیا جبل السراج جو وہاں مہاجرین کا قیدخانہ بنا تھا۔ وہ نہایت پرفضا مقام تھا۔ پہاڑی قلعہ کے نیچے سرکاری باغ دامن کوہ میں درختوں کی قطار لیکن پورا علاقہ سرد ترین تھا۔ جس کا موسم ہندوستانیوں کے لئے ناقابل برداشت تھا مقامی باشندوں کے کپڑے مہاجرین کو چھین کر دے دیئے گئے جوؤں سے بھرے ہوئے تھے۔ فرصت میں جوؤں کا مارنا ایک مستقل ہمارا مشغلہ تھا۔ بہرحال اس تھوڑی سی مدت میں محسوس ہوا کہ افغانستان سے جو توقعات باندھی گئی تھیں

وہ سب موہوم ہیں اخوت اسلامی کا کوسوں پتہ نہیں تھا مطلق العنان حکومت بے روزگاری عام افلاس و تنگ دستی ڈیرہ ڈالے پڑی تھی کابل کے بازاروں کو پوری تجارت سندھی ہندوؤں اور پشاوری مسلمانوں کے قبضہ میں تھی اصلی جنگ کے تقاضوں سے پورا افغانستان بے خبر تھا اس لئے روسی قونسل خانے سے معاملات طے کرکے اناطولیہ کا پروگرام بنایا گیا۔ اسی آمیوں کے دستخط سے ایک درخواست امین اللہ قلعہ دار کے ذریعہ امیر صاحب کی خدمت میں بھیجدی گئی کہ ہم لوگ جہاد کی نیت سے اپنے گھروں سے نکلے ہیں۔ اس لئے اناطولیہ جانے کی اجازت دی جائے اور جمعہ کے دن روانگی ہے امیر نے جواب دیا کہ ابھی ہمارا وفد شملہ گیا ہوا ہے نہیں کہا جاسکتا کہ انگریزوں سے صلح ہوگی یا جنگ اگر جنگ ہوئی تو آپ لوگوں کا مقصد یہیں پورا ہو جائے گا بصورت دیگر حکومت کے مصارف سے اس قافلہ سے اناطولیہ بھیجدیا جائے گا۔ کیونکہ افغانی حکومت کی صلح جوئی پالیسی واضح ہو چکی تھی اور مجاہدین کسمپرسی کے عالم میں تھے اہل کابل کا رویہ ان کے ساتھ غیر ہمدردانہ رہا اس لئے دوسری درخواست بھیجدی گئی کہ پچھلی درخواست اطلاع کے طور پر دی گئی تھی جمعہ کے دن ہم ہر قیمت پر روانہ ہو جائیں گے قلعہ دار کو حکم دیدیا گیا کہ ان لوگوں کو ملک سے نکال دیا جائے مگر قلعہ دار کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ امیر کا یہ حکم ہے کہ جو لوگ اس کا حکم نہ مانیں اس کو توپ سے اڑا دیا جائے چنانچہ جمعہ کے دن توپخانہ قلعہ کے باہر رکھ دیا گیا۔ خطیب نے مسجد میں اعلان کیا کہ امیر امان اللہ خاں بادشاہ اسلام ہیں جو اس کا حکم نہ مانے وہ کافر لیکن ان مہاجرین پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ نماز جمعہ سے فارغ ہو کر یہ قافلہ اپنا سامان اٹھاتے ہوئے اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ ایک سرحدی پٹھان کے ساتھ روانہ ہوا جو ایک جھنڈا لئے ہوئے اور جو توپیں رکھی ہوئی تھیں ان پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چل رہے مہاجرین کی اس جرأت پر توپچی ہنس رہے تھے یہ قافلہ وہاں سے روانہ ہو کر گل بہار جو جبل السراج سے

دو میل کے فاصلہ پر تھا وہاں پڑاؤ ڈالا۔ دریا دونوں جانب کی فلک بوس پہاڑیوں سے ٹکراتا ہوا تیزی سے بہتا ہے پہاڑ پر ایک پگڈنڈی تھی جس کی چٹانوں کے گر جانے کی وجہ سے راستہ رک گیا تھا ان تمام باتوں کا علم سرائے میں ہو گیا صبح ہونے سے قبل ایک سپاہی آیا اور کہا داروغہ صاحب نے قافلہ کو بلایا ہے اکبر خاں نے کہا کہ وہ خود کیوں نہیں آیا اس پر جواب ملا کہ وہ دربار کر رہے ہیں سب کو اس جملہ پر ہنسی آگئی غرض اکبر خاں نے ایک شخص کو بھیجدیا اس نے جا کر دیکھا کہ ایک بوریہ پر داروغہ صاحب بیٹھے ہوئے اور سامنے دو شخص داروغہ صاحب نے کہا جبل السراج سے چند لوگ اس قافلے میں بھاگ کر شامل ہو گئے ہیں ان کو واپس کرنے کا حکم آیا ہے اس لئے جب تک شمار نہ ہو جائے آپ لوگ نہیں جا سکتے اس شخص نے یہ ماجرا بیان کیا کیوں کہ اکبر خاں ہی رات کی تاریکیوں میں بھاگ کر آئے تھے ان کو روانہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد سب لوگ روانہ ہو گئے۔ تھانیدار نے اکبر خاں کو روکنا چاہا لیکن آدھا قافلہ جا چکا تھا لطیفہ یہ ہوا کہ تھانیدار فارسی میں لوگوں کی گنتی کرتا تھا اکبر خاں فارسی جاننے کے باوجود پنجابی میں کہتے میں تمھاری بکواس نہیں سمجھتا۔ مجبور ہو کر تھانیدار واپس ہوا۔ جب لوگ آگے بڑھے تو دیکھا کہ دریا تیزی سے بہہ رہا ہے ”گل بہار“ اسم بامسمیٰ آبادی ہے جہاں شہتوت کے درختوں کی قطار دور تک چلی گئی ہے جن کو وہ سکھا کر کوٹ کر سال بھر کی روزی کماتے ہیں نہ ریشم پالنا جانتے ہیں اور نہ کسی دست کاری سے واقف یہ قافلہ دریا کے کنارے پہونچکر پہاڑ کے سہارے آگے بڑھتا ہوا اس جگہ جا پہونچا جہاں پہاڑ پر چڑھنے کا راستہ تھا۔ اس قافلہ کے ساتھ ایک درزی بھی اپنی مشین کو گھوڑے پر رکھے ہوئے ساتھ چل رہا تھا پانی کی تیز روانی میں گھوڑا بہہ گیا اور مشین گہرے پانی میں گر گئی۔ پہاڑ اس قدر ڈھلوان تھا کہ ہاتھوں کا سہارا لئے بغیر چڑھنا ممکن نہ تھا چنانچہ چاروں ہاتھ پاؤں سے چل کر راستے پر لگے جو ایک پگڈنڈی کی شکل میں تھا اور اسقدر

تنگ ڈھلواں کہ ذرا سی لغزش زندگی کو ختم کرنے کے لئے کافی تھی۔ دریائے پنج شیر اس پہاڑ کی بلندی سے ایک چھوٹی سی ندی اور معمولی بہتے ہوئے جھرنے کی طرح نظر آتا تھا آدھے دن کی چڑھائی کے بعد مغرب کے قریب اسی دریا کی معاون ندیوں کے کنارے پہونچے جہاں پہاڑ کی بلندی سے یہ ندیاں آبشار بن کر گرتی تھیں تینوں طرف بلند پہاڑ اور سامنے درہ اور مختصر میدان تھا جہاں قافلہ نے پڑاؤ ڈالا کیوں کہ اس مقام پر خطرہ تھا اس لئے آدھے آدمیوں کو پہرے پر آدھی رات تک کے لئے مقرر کیا کہ ان کے سونے والے جاگ کر آدھی رات پہرہ دیں۔ اسی دوران چند مقامی آدمی نظر آئے پہرے داروں نے سیٹی بجائی اور سب لوگ لٹھ تان کر کھڑے ہو گئے۔ جب انھوں نے قافلہ کو تیار دیکھا تو وہ منتشر ہو گئے۔

لطیفہ:۔ راقم الحروف جب سفرنامہ کے اس مقام پر پہونچا تو پنج شیر بے نقط ہونے کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آیا اس لئے اس کی تحقیق کے لئے عیادت کے لئے گیا رفیق بھائی بستر مرگ پر آخری سانس لے رہے تھے تو یہ دیکھ کر جھٹکا لگا کہ مرحوم کی حالت غیر ہے آنکھیں بند کئے لیٹے ہیں فقیر کے پہونچتے ہی آنکھیں کھول دیں اور نہایت کمزور مردہ آواز میں سلام کا جواب دیا جب اس لفظ کی بابت پوچھا گیا تو بہت دھیمی آواز میں جس کو سننے کے لئے کانوں کو ہونٹوں سے لگانا پڑا فرمایا یہ لفظ پنج شیر ہے پنج میں پانچ اور شیر کے معنی روس جاکر کھلے روسی زبان میں شیر دریا کو کہتے ہیں اس جگہ مشہور عاشق فرہاد کا فولادی مجسمہ نصب تھا ہم نے دیکھا پھر آنکھیں بند کر لیں پھر فرمایا یہ دریا وہاں ابتدائی سرچشمہ کی طرح تھا آگے بڑھ کر پانچ دریاؤں کو اپنے آغوش میں شامل کر لیتا ہے۔ پنجاب کے دریاؤں کی طرح ہے جب وہ مرد مجاہد اس کی تشریح کر رہا تھا اس کی آنکھیں اس یادگار سفر کی یادوں سے روشن ہو گئی تھیں اور لوح حافظہ میں وہ منظر تازہ ہو گیا تھا۔

۲۹/ جولائی ۱۹۸۲ء میں یہ آخری ملاقات تھی۔ ۵/ اگست ۱۹۸۲ء کو تحریک ہجرت کا آخری مسافر اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگیا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

آمدم بر سر مطلب غرض صبح ہوئی قافلہ اس مقام سے آگے کے لئے روانہ ہوگیا داہنی جانب برف سے ڈھکا ہوا ایک بلند پہاڑ سنتری بن کر کھڑا ہوا تھا اور کچھ فاصلے پر دوسرا پہاڑ تھا جس پر برف ڈھکی ہوئی نہ تھی راستہ سخت ناہموار اور پتھریلا۔ نہ کوئی رہبر تھا نہ کوئی راہ گیر نظر آتا تھا نہ مقام کا نام معلوم نہ راستے کا پتہ نہ منزل کا نشان لیکن اہل قافلہ پر آگے بڑھنے کی ایک دھن سوار تھی سب سے بڑی خوبی ان مقامات کی یہ تھی کہ ان دریاؤں اور پہاڑوں کے نام بھی کچھ نہ تھے جب کوئی راہ گیر نظر آتا اور اس سے پوچھا جاتا تو وہ حیرت سے ہمارا منھ تکتا تھا اور یہی جواب دیتا کہ یہ ایک پہاڑ ہے یہ ایک دریا آگے خدا کا نام غرض اس طرح دشت نوردی کرتا ہوا اور کوہ پیمائی کرتا ہوا یہ قافلہ کوہ ہندوکش کے دامن میں پہونچا جو افغانستان اور مشرقی ترکستان کے درمیان حد فاصل بنا ہوا تھا اس پہاڑ کی چوٹیاں ہی نہیں بلکہ پہاڑ کے سارے حصے بھی برف سے ڈھکے ہوئے تھے اور حد نظر تک اس کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا ایک بلند چوٹی سامنے تھی جس کے دامن میں ایک تیز رو نالہ بہہ رہا تھا اس کو عبور کرنے کے لئے ایک بڑی لکڑی پل کا کام دیتی تھی۔ اس مصنوعی پل کے سہارے قافلے کے ایک ایک آدمی نے نالہ عبور کر کے جب آگے قدم رکھا تو دونوں طرف پھولوں کا قدرتی چمنستان کھلا ہوا نظر آیا جو دامن نظر کو اپنی طرف کھینچتا اور یہاں دم لینے کی دعوت دیتا لیکن قافلہ کو تو نہ معلوم منزل کی طرف کوچ کرنا تھا اس نالے سے ایک فرلانگ پر کوہ ہندوکش کی چڑھائی شروع ہو رہی تھی جو نہایت حوصلہ فرسا اور کٹھن تھی قافلہ نے جب پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا تو ہر ایک کا دم پھول گیا جوں جوں آگے بڑھتے جاتے سانس پھول جاتی لکڑی کا سہارا لے کر سو قدم چلتے اور ٹھہر جاتے اور پھر تازہ دم ہو کر آگے بڑھتے یہ کوہستانی سلسلہ دم گھوٹنے والا

اور تھکا دینے والا تھا جب پہاڑ کی چوٹی دکھائی دیتی تو دل فرطِ مسرت سے مطمئن
ہو جاتا کہ چلو چڑھائی ختم ہوئی لیکن سامنے اس سے بھی اونچا پہاڑ نمودار ہوتا
گویا کوہ بالائے کوہ کا منظر تھا۔ البتہ پہاڑوں کی صبح و شام کے نظارے اور برف کے
تودوں کے سپید اور رنگین مناظر نگاہوں میں کھپ جانیوالے ہوئے لیکن ان
نظاروں سے لطف اٹھانے کی فرصت کس کو تھی۔ کیونکہ بعض مواقع پر مویشیوں
کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں سے گھسیٹنا پڑتا تھا۔ تقریباً نصف چڑھائی طے ہوئی
ہوگی کہ جس چاند کی چاندنی میں یہ قافلہ چل رہا تھا وہ غروب ہوگیا اور گھپ اندھیرا
چھا گیا۔ جس کی وجہ سے چلنا مشکل ہوگیا۔ اس لئے قافلے کا ہر فرد جہاں پہونچا تھا
وہیں بیٹھ کر رہ گیا اور اونگھتے سونگھتے رات گذار کر پھر سب چل کھڑے ہوئے
اگرچہ سردی سخت تھی لیکن کمر باندھ کر پہاڑیوں کو طے کرتے رہے مغرب کے قریب
اس جگہ پر پہونچے جہاں سے افغانی ترکستان کی سرحد شروع ہوتی ہے جب قافلہ
وہاں اترا تو ہوا کے خنک و سرد تیز جھونکوں نے استقبال کیا اس برفستانی ہوا
سے ہر شخص تھر تھر کانپنے لگا کیوں کہ یہاں کوئی میدان نہیں تھا اس لئے
سب نیچے اتر کر آٹھ بجے کے قریب ایسی جگہ پر پڑاؤ ڈالا جہاں میدان تھا اس
میدان میں ایک کوٹھا بیس فٹ لمبا آٹھ فٹ چوڑا نظر آیا جب اس کے چھوٹے
سے دروازے سے اندر داخل ہوئے تو مچھروں نے یلغار کردی اس قدر پسوؤں
اور مچھروں کی بھرمار تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ سارے افغانستان کے مچھر یہاں
سمٹ آئے ہیں۔ رات جوں توں گذاری صبح ہوتے ہی ڈھلوان ہونے کی وجہ
سے بہ تیزی سے اترنا شروع کیا۔ اس پہاڑ پر برف نہیں تھی اور راستہ بھی
زیادہ ناہموار نہیں تھا پانچ بجے دن ایک گاؤں پہونچے لیکن سامان
خورد و نوش دستیاب نہ ہوسکا دو روز کے فاقے سے تھے لیکن مجبوراً آگے
چلنا پڑا مغرب کے قریب میدانی علاقہ شروع ہوگیا اور خربوزوں کا ایک
کھیت دکھائی دیا قافلہ کے لوگ بھوکے بنگالیوں کی طرح لوٹ پڑے اور ہر ایک

نے اپنی پیٹ کی آگ کو تھوڑا بہت بجھایا اب جس علاقہ میں چل رہے تھے یہ ترکستانی علاقہ تھا۔ جہاں سے ترکمانوں اور ازبکوں کی آبادیاں شروع ہوتی تھیں اب راستہ نسبتاً پہلے کے مقابلہ میں ہموار تھا۔ پہاڑ بھی دور دور نظر آرہے تھے۔ البتہ آس پاس مٹی کے بڑے بڑے تودے اونٹ کی کوہانوں کی طرح نمودار ہوتے تھے اسلئے اوقات سفر کو تبدیل کرنا پڑا۔ چار۴ بجے صبح سے بارہ۱۲ بجے تک چلنے اور پانچ بجے شام کو پڑاؤ اس کے بعد چلنا چلنا مدام چلنا اس قافلہ کا وطیرہ بن گیا تھا چنانچہ یہ مجاہدین راہ حریت روزانہ تیس چالیس میل راستہ طے کر لیا کرتے تھے لیکن منزل ہنوز نامعلوم تھی۔ کوہستانی علاقہ کے ختم ہوجانے پر اب مسافروں کے لئے سرائیں ملتی جاتی تھیں جہاں تنوری روٹیاں بغیر شکر کی چائے اور خشک میوے کھانے کو مل جاتے تھے۔ ایک ہراول دستہ قافلے سے آگے دو ایک آدمیوں کا پہونچ جانا اور روٹیاں پکوانے کا کام کرتا تھا ہر شخص اپنے مصارف خود برداشت کرتا تھا۔ اس علاقہ کا سب سے بڑا مقام رباط اور کرنجاں یہاں بڑے بڑے قصبے ہیں۔ جہاں وسیع بازار اور قہوہ خانے تھے۔ یہاں کے عام لوگ خستہ حال مفلسی تنگدستی کا شکار۔

یہاں کی زبان عموماً فارسی تھی اس علاقہ کو عبور کرکے غور پہونچے جو مشہور مقام ہے مگر اب ویران پڑا تھا۔ آدمی قوی ہیکل قد آور دلیر خوب صورت مگر درشت خو جاہل و بد اخلاق سرائے میں قیام کیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد سرائے بر کے دروازے پر ایک شور اٹھا قافلے کے لوگ دروازے پر پہونچے تو دیکھا کہ دو آدمی ایک نعش کو گھوڑے پر لاد کر لائے ہیں لاش کفن میں لپٹی ہوئی ہے احتیاط سے اس کو زمین پر رکھدیا گیا تھانے میں رپورٹ درج کرانے کسی قریبی گاؤں میں پانی پر جھگڑا ہوا ہے ایک شخص نے مرحوم کے سینے پر مکا مارا پسلیاں ٹوٹ گئی اور مر گیا۔ تھانیدار نے سینہ کھلوا کر دیکھا تو واقعتاً پسلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں حالانکہ مرنے والا نہایت قوی و طاقت ور نوجوان تھا

خیال ہوا کہ اس دیو کی جس شخص نے پسلیاں توڑی ہیں وہ کس قد و قامت اور طاقت کا آدمی ہو گا تھوڑی دیر نہ گذری کہ قاتل بھی کشاں کشاں لایا گیا۔ جو سبزہ آغاز جوان اور اسی تن و توش کا آدمی تھا صرف عمر کا معمولی فرق ہو گا کپڑے پھٹے ہوئے اور سر پر بال بکھرے۔ یہ علاقہ بھی افغان حکومت کے ماتحت ہے۔ اس لئے نہ کہیں مدرسہ نہ ہسپتال نہ کوئی کارخانہ حلال و حرام سے بے خبر اخلاق سے عاری۔
سہ پہر کو غور سے روانہ ہو کر ایک دریا کے کنارے پہونچے جس کا پھیلاؤ تو زیادہ تھا لیکن پانی اتھلا تھا۔ پورے افغانستان کے سفر میں ہم کو یہ دوسرا پل ملا۔ ایک جبل السراج میں اور دوسرا غور میں۔ غالباً یہ پل غوریوں کے عروج کے زمانے کا ہو گا جب کہ یہاں شہری آبادی ہو گی۔ یہاں سے جو راستہ شروع ہو رہا تھا وہ ہمارے ملک ہندوستان کے دیہات کے راستہ کی طرح تھا۔ یہ راستہ مزار شریف جاتا تھا تمام علاقہ غیر آباد کوسوں آبادی کا پتہ نہ پانی کا کوئی نشان ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوہ ہندوکش کے چشمے اور اس کی ندیاں افغانستان کے باہر ہی باہر دریائے آموں کی طرف چلے جاتے۔ دریائے آمون سے نہر لانا اس لئے دشوار تھا کہ اس کے درمیان ایک وسیع ریگستان حائل تھا۔ بہرحال غور سے مزار شریف تک کوئی آبادی نظر نہیں آئی مزار شریف کافی بڑا شہر ہے یہاں کے مکانات یوپی و پنجاب کے دیہات کے مکانات کی طرح ہیں تجارتی منڈی ہے بخارا و ترکستان کے علاقوں سے تجارتی سامان قالین کھالیں وغیرہ آتی ہیں۔ اور کابل کے علاقہ سے یہ سامان ہندوستان آتا ہے جس کے تبادلے میں یہاں سے چائے ماچس سوتی کپڑے جاتے ہیں شہر کی گنجان آبادی ترکمان کے باشندے ہیں لیکن سڑک کا یہاں وجود نہیں۔

مزار شریف جیسا کہ راقم الحروف کو نور المشائخ کے صاحب زادے عبد السلام صاحب نے بتایا کہ یہاں عوامی روایت کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا مزار ہے واللہ اعلم۔

یہاں سے بلخ پانچ فرسنگ پر واقع ہے جو افغانی فوجی چھاونی ہے جہاں میووں اور پھلوں کی فراوانی ہے یہاں کی پوری تجارت سندھیوں اور پشاوریوں کے ہاتھ میں ہے جو کافی خوش حال و مالدار ہیں۔ لیکن خود یہاں کے باشندے افلاس کا شکار ہیں وسط بازار میں مزار ہے جس کے متعلق لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ہے۔ ایک نقش قدم ایک سنگ مرمر پر ثبت ہے ایک مراد آبادی کٹورا جس میں ایک خوب صورت کام ہے جس کے اندر دس سیر گیہوں آسکتے ہیں مزار کے ایک طرف آویزاں ہے جس کے متعلق مجاوروں کا کہنا ہے کہ حضرت علیؓ اس میں کھاتے تھے اس کی دیواروں پر چینی کے ٹائل نصب ہیں مزار شریف کے مصارف کے لئے حکومت کی طرف سے اوقات مقرر ہے۔ ایک عجیب نظارہ دیکھنے میں آیا کہ تقریباً پچاس آدمی ایک جلوس کی شکل میں بازار سے گذر رہے تھے جن کے پاؤں میں بیڑیاں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں کمر میں زنجیریں گلے میں طوق بندھے ہوئے تھے ان کو مخیر حضرات روٹیاں اور فروٹ دے رہے تھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں کی جیلوں میں قیدیوں کے کھانے کا انتظام حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ اہل خیر حضرات کی جانب سے ہوتا ہے گویا حکومت افغانستان اس فضول خرچی کو برداشت نہیں کرتی۔ مزار شریف میں تین چار روز تک قیام رہا اس اثناء میں نائب السلطنت کی جانب سے اہل قافلہ کو دعوت دی گئی جو صورت و شکل سے بزرگ معلوم ہوتے تھے لیکن جب ان کے احوال سننے میں آئے تو حیرت ہوئی۔ ایک ہندوستانی تاجر عید الاضحیٰ کے موقع پر کچھ دیر سے پہونچا اس قصور پر حکم دیا گیا کہ اس کو کھمبے سے باندھ کر کان چھید دیئے جائیں اور جب تک نائب السلطنت کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا اسکے کانوں کی چھدائی ہوتی رہی۔ یہیں ایک ترک سے ملاقات ہوئی وہ دوران جنگ روسیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر سائبیریا کی سیر کر آئے تھے وہاں سے کسی طرح بھاگ کر افغانستان میں پناہ لی لیکن حکومت کی طرف سے واپس جانے

کی اجازت نہیں تھی۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ قافلہ اناطولیہ جارہا ہے تو اس نے قافلہ کے ساتھ چلنے کی خواہش کی۔ خوش قسمتی سے قافلے کے ایک ساتھی سرفراز خاں غائب ہوگئے تھے۔ اس لئے اس ترک کو ہندوستانی کپڑے پہنا کر سرفراز خاں نام رکھ کر اپنے ساتھ لے لیا۔ یہ شخص ترکی کے علاوہ فارسی روسی زبانیں بھی جانتا تھا اب یہاں سے ہماری منزل مقصود روسی سرزمین تھی۔ تین چار روز چل کر جب روسی سرحد میں داخل ہوئے تو گرمی بہت سخت تھی اس لئے رات میں سفر کرنے کا منصوبہ بنایا چاندنی راتیں تھیں اس لئے آگے کا ریگستانی علاقہ بآسانی طے ہوگیا۔ راستہ میں ایک شہر کے پھیلے ہوئے آثار نمودار ہوئے۔ لیکن اس کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ صبح کے دس بجے ہم دریائے جیحوں کے ساحل میں پہونچ گئے دریا طغیانی پر آیا ہوا تھا۔ ساحل پر ایک چھولداری نصب تھی جس کے اندر پہرے دار۔ تین چار سپاہی تھے کشتیاں ساحل پر کھڑی تھیں۔ پروانہ راہ داری دکھا کر سب لوگ کشتیوں میں سوار ہوگئے جو تیراک تھے وہ دریا میں کود کر اس کنارے سے اس کنارے پہونچ گئے۔ دریا کی رفتار معمولی تھی یہی وہ مقام ہے جہاں سے فریدوں کے خسرو نے گھوڑوں سے دریا کو عبور کیا تھا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر ایک دوسرے قسم کا گھانس تھا جو کیچڑ میں اگا ہوا تھا۔ دور تک کیچڑ ہی کیچڑ تھی اس کو پار کر کے شہر ترمذ میں داخل ہوئے جس کو امام ترمذی کی ولادت گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ پچاس مکان سے زیادہ کا گاؤں نہ ہوگا۔ اس کی آبادی ترکمانوں کی تھی جو نہایت وحشی جاہل بداخلاق و بدسلیقہ نام کے مسلمان لیکن اسلامی احکام سے نابلد اعمال اسلامی سے کوسوں دور ایرانی لوگوں کی ہوٹل و دوکانیں تھیں۔ جو باسلیقہ خوش خو مسافر نواز متواضع شیعہ مذہب کے پیرو تھے مگر برائے نام اسی راستہ سے افغانستان بخارا کی تجارت پچھلے دور میں ہوا کرتی تھی۔ اس علاقہ کی حالت افغانستان سے بھی زیادہ بدتر تھی۔ لیکن اب یہ علاقہ ترقی کرچکا ہے

اور لوگ متمول ہیں، ہم لوگ سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے تھوڑی دیر بعد دو روسی افسر آئے اور دریافت حال کر کے چلے گئے اور یہ ہدایت دے گئے کہ قافلہ کے جو لوگ بازار میں گھوم رہے ہیں ان کو سرائے میں بلوالیا جائے۔ اس دن ترمذ کا بازار تھا لوگ کھانے کا سامان خریدنے بازار گئے تھے سب کو بلوایا گیا تھوڑی دیر بعد بینڈ کی آواز سنائی دی۔ باہر آکر دیکھا تو ایک فوجی دستہ جس کے اندر کچھ سوار کچھ پیدل سپاہی بینڈ آگے آگے بجتا ہوا سرائے کے دروازے پر دو طرفہ قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے کمانڈر نے کاشن دیا اور بینڈ نے سلامی بجائی فوج کے دونوں دستوں نے سلامی دی، سلامی کے بعد روسی کمانڈر گھوڑے سے اترا۔ اور اس نے روسی زبان میں ایک تقریر کی جس کا ترجمہ ایک بخاری شخص نے فارسی زبان میں کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ روسی عوام نے انقلاب کے ذریعہ جبر و استبداد کی زنجیروں کو توڑ دیا ہے اور دنیا بھر کے مظلوموں محنت کشوں کے لئے اپنے ملک کے دروازے کھول دیئے ہیں یہاں کی دولت یہاں کی زمین یہاں کے مکان دنیا کے محنت کشوں کی ملکیت ہیں آپ لوگوں کو ہم لوگ خوش آمدید کہتے ہیں جب تک آپ چاہیں یہاں رہیں اور اپنے ملک میں آزادی کے لئے جد و جہد کریں روس کے محنت کشوں اور کسانوں کو اپنی جد وجہد آزادی کے اپنے دوش بدوش پائیں گے۔ وہ دن دور نہیں جب ہندوستان آزاد ہوگا روس میں آپ کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہاں کے ہر شہری کو حاصل ہیں۔ آپ لوگوں نے سخت مصیبتیں برداشت کی ہیں اب ان کو بھول جایئے وہ دور ختم ہو چکا ہے آئندہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی آج سے آپ روسی حکومت کے مہمان ہیں اب آپ چھاؤنی میں تشریف لے چلیں اسی وجہ سب سامان فوجی گھوڑا گاڑیوں میں بار کرایا گیا اور پورا قافلہ ایک جلوس کی شکل میں سرائے سے چھاؤنی کی طرف روانہ ہوا جو ایک میل تھی آگے بینڈ اور فوجی افسر درمیان میں یہ خستہ حال قافلہ اور اس کے پیچھے

فوجی دستہ۔ ہمارے قافلہ کی خستگی کا یہ حال تھا کہ کسی کے پیر میں جوتا تھا اور کسی کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا جوتا۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے اور میلے کسی کا پاجامہ بھی غائب یہی حال قمیص اور کرتوں کا تھا غرض نہایت شکستہ حال شرمندگی سے آنکھیں نیچی کئے ہوئے چل رہے تھے۔ عورتیں اور بچے تماشائی بن کر ٹوٹ پڑے تھے۔ ہرطرف خوش آمدید کے نعرے بلند ہو رہے تھے کوئی روسی زبان میں کوئی ترکی میں اپنے خوشی کے جذبات کو ظاہر کر رہے تھے معلوم نہیں یہ ہم کو کیا سمجھ رہے تھے۔ ڈیڑھ میل میں یہ جلوس چل کر فوجی بیرکوں کے پاس پہونچ کر رکا اور سب کو اندر جانے کے لئے کہا گیا جب ہم اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ اسٹی پلنگ بچھے ہوئے ہیں گدے اور قالینوں سے سجے ہوئے کشمش اور تمباکو کے بورے رکھے ہوئے چائے کے سموار اگرم روشنی اور پانی کا پورا پورا انتظام تھا۔ بیرک سے باہر باورچی کھانا پکا رہے تھے تھوڑی دیر بعد ایک افسر آیا اور اس نے کہا کہ یہ سرحدی مقام ہے اس اس لئے ہم آپ کے شایان شان تواضع نہ کر سکے۔ جو کچھ کوتاہی و فروگذاشت ہو معاف فرمائیں۔ پھر دوسرا افسر آیا جو اپنے ساتھ ایک کلرک اور ایک درزی کو لایا تھا اور کہا کہ جن لوگوں کے پاس کپڑے نہ ہوں وہ اپنا ناپ دے دیں تاکہ نئے کپڑے تیار کئے جائیں لیکن کسی نے بھی کپڑوں کی ضرورت کے باوجود اس کا اظہار نہیں کیا صرف جوتوں کی مرمت کرائی گئی روسی کمانڈر نے یہ بھی کہا کہ یہاں سے چارہ جوتک آپ کو دریائی سفر کرنا ہوگا۔ فراخوت کا انتظار کرنا ہوگا فراخوت ایک چھوٹے قسم کا جہاز تھا جو دریائے جیحون میں چلتا ہے۔ چنانچہ قافلہ کو اگست ۱۹۲۰ء تک وہیں قیام کرنا پڑا لیکن وہ جہاز اس وقت تک نہیں آیا۔ ہمارے اصرار پر انھوں نے دو بڑی کشتیاں کرائے کی ساتھ کر دیں ان کشتیوں پر سوار ہو کر یہ قافلہ روانہ ہوا۔ دریا کے دونوں جانب تھوڑے تھوڑے

فاصلے پر گاؤں ملتے رہے۔ ایک شبانہ روز جب مسافت طے کر چکے تو ایک قریبی ساحل سے وسل کی آواز سنائی دی۔ ملاحوں نے ہماری کشتیوں کو کو ساحل کی طرف موڑ دیا اور ہم منزلِ مقصود کو پہونچ گئے۔

بھائی رفیق مرحوم جن کی داستان ہجرت کو ان کی یادداشتوں کی مدد سے ہم نے ان صفحات میں پھیلایا ہے وہ خاندان سادات میں سے تھے۔ ان کا آبائی وطن قندھار تھا۔ ملک افغانستان تھا۔ ان کے والد ماجد نذر احمد مرحوم و مغفور قندھار سے تلاش معاش کے سلسلے میں عہد شاہجہانی میں بھوپال وارد ہوئے اور یہیں رہ پڑے اور اپنے حسن لیاقت سے محکمہ جنگلات کے سب سے پہلے افسر کنزرویٹر مقرر ہوئے وہ اس سرزمین کے فرزند تھے جہاں کے باشندوں کے اندر فرنگی سامراج کے خلاف جذبہ موروثی طور پر رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے تھا۔ اس لئے یہ پدری میراث ان کے پسر بھائی رفیق احمد کے حصہ میں آئی۔ بھائی رفیق نے دعوت ہجرت پر لبیک ہی نہیں کہا بلکہ مردانہ وار ۲۰ر اپریل سنہ ۱۹۲۰ء میں اس پر خطر راستہ پر چل کھڑے ہوئے جیسا کہ گزرا خشک ترمیدانوں، بہتے ہوئے دریاؤں، خطرناک و دشوار گزار گھاٹیوں اونچی نیچی پہاڑیوں کو عبور کرتے ہوئے منزل مقصود سے ہمکناری کے لئے آگے ہی بڑھتے رہے۔ اب ہم مرحوم و مغفور کے ایک انٹرویو پر جو راقم السطور نے ان سے لیا تھا اس داستان کو ختم کرتے ہیں جس کے اندر بعض اہم اشارات بھی ہیں۔ مرحوم نے بتایا جب ہم کابل پہنچے اسی روز مولوی عبدالرب اور اچاریہ جی سے ملاقات ہوئی جب مولوی صاحب کو میرا بھوپالی ہونا معلوم ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ مولوی برکت اللہ بھوپال کے ہیں وہ کابل آئے تھے کچھ عرصہ قیام کے بعد تاشقند چلے گئے ہیں اگر تمہارا میرے ساتھ چلنے کا قصد ہو تو میں امیر سے تمہارے لئے اجازت مانگ لوں، میں نے

اس پر آمادگی ظاہر کی۔ دوسری شام کو مولوی عبد الرب نے بتایا کہ امیر صاحب نے تم کو جانے کی اجازت نہیں دی۔ اس کے بعد ہم حکومت کو ایک نوٹس دے کر کابل سے چل کھڑے ہوئے کیونکہ ہم کو گرمی یہ تھی کہ ہندوستان کے چالیس کروڑ انسانوں کی نظریں ہم پر لگی ہوئی ہیں اس لئے حکومت کابل ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ قید و بند لڑائی بھڑائی کے بعد جب ہم اکتوبر ۱۹۲۰ء میں تاشقند پہونچے تو تو معلوم ہوا مولوی برکت اللہ صاحب جمال پاشا کو ہمراہ لے کر (جو ترکی کے باغی جرنیل تھے) ہمراہ ہرات کابل چلے گئے ہیں۔ ۹ ماہ ہم نے تاشقند میں گزارے۔ لیکن مولوی صاحب واپس نہیں ہوئے۔ انگریزی حکومت کی بدمعاشی یہ تھی کہ اس نے معاہدہ جنیوا کی گفتگو کے لئے یہ شرط لگا دی تھی کہ جب تک تاشقند سے ہندوستانیوں کو نکال نہ دیا جائے صلح کی گفتگو نہ ہوگی۔ چنانچہ اس شرط کی وجہ سے ہم کو یورپ بھیج دیا گیا۔ اس طرح ہم ماسکو پہنچ گئے۔

ایک روز مسز رائے نے اطلاع دی کہ فادر آف انڈین نیشن ماسکو آگئے ہیں میں نے پوچھا وہ کون تو بتایا پروفیسر برکت اللہ بھوپالی۔ میں نے پتہ پوچھا اور پتہ معلوم کر کے حبیب احمد شاہجہاں پوری اور میں مولانا سے ملنے روانہ ہوئے جب مولانا کی قیام گاہ پر پہونچے تو دروازے پر وارث ملے جو ہمارے ہی قافلہ کے ساتھ تاشقند آئے پھر کابل چلے گئے تھے۔ اب وہ مولانا کی ہمراہی میں ماسکو آگئے وارث نے مولانا سے میرا تعارف کرایا بیحد مسرور ہوئے اور فرمایا ۳۰ سال بعد آج میں اپنے ہم وطن کی صورت دیکھ رہا ہوں۔ پھر میرے خاندان کی بابت پوچھا خاندانی سلسلہ کے بتانے پر دیر تک مجھ پر نظر ڈالتے رہے اور دونوں کو زانو پر دبا کر کہا کہ تم میرے استادوں کی اولاد میں ہو خوب۔ غلام احمد فروغی اور مولوی عبد القادر کی بابت دریافت کیا اور فرمایا یہ دونوں میرے ہم جماعت تھے۔ فروغی صاحب کے انتقال کے عبد القادر صاحب کے پنشن یاب ہونے پر افسوس ظاہر کیا۔ نواب صدیق الحسن خاں کی اولاد کے متعلق پوچھنے پر میں نے بتایا کہ وہ لکھنؤ میں رہتے

ہیں۔ یہ میری مولانا سے پہلی ملاقات تھی۔ گویا ایک مہاجر بھوپالی کی دوسرے عظیم انقلابی بھوپالی کی ملاقات نے اس مسافر ہجرت کے راستہ کی ساری کلفتوں کو اور ذہنی پریشانیوں کو کافور کر دیا۔ اس ملاقات سے جس طرح رفیق بھائی کے دل کی کلیاں کھل اٹھیں اسی طرح خود مولانا کا چہرہ بھی خوشی سے کھل اٹھا۔ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ بھوپال کے پچھلے دور کا نقشہ مولانا کی نظروں میں پھر گیا۔ چنانچہ دوسرے دن مولانا برکت اللہ نے رفیق بھائی کو اپنا معتمد بنالیا اور اپنے مسودات اردو کے صاف کرنے کے لئے ان کو دیئے۔ یہ آرٹیکل تھے جو خدا جانے کس طرح ہندوستان بھیجے جاتے تھے۔ رفیق بھائی نے فرمایا کہ جب میں نے کابل سے تاشقند آنے کا مقصد صرف ان کی ملاقات کو بتایا تو فرمانے لگے کہ میں قندھار کے راستہ سے کابل گیا تھا اور جمال پاشا کو افغانی فوج کی ٹریننگ کے لئے گیا تھا لیکن امیر کابل کا اصرار تھا کہ جمال پاشا امیر کی ماتحتی میں کام کریں اور وہ اس کے خلاف تھے۔ جمال پاشا اس کے قائل تھے کہ بحیثیت کمانڈر انچیف کے وہ افسروں کی تربیت اور فوج کی تنظیم کریں گے۔ درباری سازشوں سے یہ ساری اسکیم فیل ہو گئی پھر جب امیر سے افغانی قبائل میں جانے کی اجازت مانگی گئی تو ان کو فوجی ٹریننگ دے کر برطانوی افواج کے مقابلہ کرنے کے قابل بنایا جائے تو اس سے بھی انکار کر دیا۔ امیر نے اس کو افغانی سیاست کے خلاف بتایا۔ حبیب احمد نے پوچھا وہ کس طرح تو حسب عادت شانہ جھکا کر اور ہاتھوں کو حرکت دے کر مولانا نے فرمایا کہ امیر کو اندیشہ ہے کہ کہیں انگریز اس سے خفا نہ ہو جائیں یہ آگے چل کر قبائل افغانستان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ جب ترک جرمنی وفد کے بارے میں پوچھا گیا تو مولانا نے فرمایا کہ امیر حبیب اللہ کو ہر چند ہم نے اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ اس وقت ہندوستان فوجی لحاظ سے کمزور ہے۔ آپ پر ہندوستان پر حملہ کرنے کی شکل میں ترکی و جرمنی حکومتیں پوری پوری مدد کریں گی۔ لیکن سردار نصر اللہ خاں نے یہ بیل منڈھے نہ چڑھنے دی کیونکہ وہ انگریزوں کے طرفدار تھے۔ امیر امان اللہ سردار عنایت اللہ خاں ہماری ہمنوائی کرتے لیکن نصر اللہ خاں خلاف جاتے۔ اسی اثنا میں راجہ صاحب نے یہ شوشہ چھوڑا کہ اس

محاذ میں مہاراجہ نیپال کو بھی شریک کیا جائے تاکہ ہندوستان کی حمایت حاصل ہو سکے غرض اس رسہ کشی میں امیر حبیب اللہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ اس کے بعد زارِ روس کو اتحادیوں سے کاٹنے کے لئے حکومت موقتہ کے ذریعہ سفارت بھیجی گئی جو ناکام رہی جب حبیب نے یہ پوچھا کہ اگر زارِ روس ہندوستان پر حملہ کر دیتا اور قبضہ جما لیتا تو آزادئ ہند کا خواب پھر بے تعبیر رہ جاتا۔

مولانا اس پر ہنس پڑے فرمایا تم کو یہ نہیں معلوم کہ زار کا باپ بھی اگر قبر سے اٹھ آتا تو یہ منصوبہ پورا نہ ہوتا۔ اس تجویز کا مقصد زار کا اتحادیوں سے علیحدہ کرنا تھا اگر وہ اس جال میں پھنس جاتا تو پھر جرمن انگلستان و فرانس کو نپٹا دیتا۔ دونوں اپنے مقبوضات کھو بیٹھتے اور ہندوستان کے آزاد ہونے میں کچھ دیر نہ لگتی۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ اگر جرمن ترکش مشن کامیاب ہو جاتا تو جو حبیب اللہ خاں اپنی سلطنت کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ ہندوستان کا بادشاہ بن بیٹھتا۔

بھائی انگریزوں کو شکست دینے کے لئے یہ بھی سیاسی چال تھی۔ افغانی فوج ایک ہفتہ بھی ہندوستان نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ چنانچہ رفیق بھائی کا مولانا برکت اللہ کی معیت میں رہنے اور ان کی فیض صحبت سے مستفید ہونے کا زمانہ ماسکو میں جولائی سنہ ۱۹۲۱ء سے اپریل سنہ ۱۹۲۲ء تک آٹھ دس ماہ کا رہا جو ان کی انقلابی زندگی کا حاصل تھا۔ بقول ان کے جب مولانا کی معیت میں گھومنے پھرنے اور فرصت کے اوقات میں مل بیٹھنے کا موقع ملتا تو بھوپال کے پچھلے بزرگوں اور ان کے دوستوں کا تذکرہ چھڑ جاتا اور تھوڑی دیر کے لئے مولانا عہد ماضی کی خوش گوار یادوں میں گم ہو جاتے۔ مولانا کا قیام گراؤنڈ فلور میں تھا جہاں ایرانی ڈیلی گیشن کا دفتر تھا۔ ہم لوگ وہاں حاضر ہو کر مولانا کے خیالات سے مستفید ہوتے۔ ان کی تشریف بری کے بعد ہم نے اپنی خدمات حکومت روس کو پیش کیں اس عرصہ میں دو بار کامریڈ لینن سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ پھر ہم کو روس اور افغانستان کی سرحد پر بھیج دیا گیا جہاں دریائے امون حد فاصل بنا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ تک وہاں چوکیداری کرتے رہے پھر اپنے انقلابی ساتھیوں

کے ساتھ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے افغانستان پہونچے اور مختلف تجاویز بروئے کار لانے میں لگے رہے جن کی تفصیل آگے آئے گی۔ بھائی رفیق کے علاوہ بھوپال کے اور بھی مہاجرین ہمارے علم کے مطابق اس راہ میں اترے جیسے شوکت عثمانی بھوپالی اور مولوی امین اللہ مولوی اسماعیل صاحب وغیرہ جنھوں نے اپنی زندگیوں کی بازی اس راستہ میں لگادی اور اپنے آپ کو کھو بیٹھے۔ بقول غالب ؎

ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا ہی نہیں خود ہی کو کھو آئے

مولانا برکت اللہ بھوپالی

خراجِ عقیدت منظوم

اے زعیمِ ملک وملت پیشوائے انقلاب
تیری جد وجہد سے تاریخِ عالم جلوہ تاب

تو ہے چرخِ حریت کا آفتاب وماہتاب
تیری قربانی سے روشن زندگی کی یہ کتاب

گلشنِ بھوپال کو تیری ولادت پر ہے فخر
ہر کلی جس کی حسیں ہر پھول جس کا لاجواب

سیدھے سادے بات کے سچے تھے سارے اہلِ شہر
شیر وشکر ہو کے رہتے تھے یہاں شیخ وشاب

علم وفن کی تھی دبستاں یہ وطن کی سرزمیں
اسکے عالِم اس کے شاعر علم وفن میں انتخاب

علم کے ماحول میں تیری ہوئی نشو ونما
قطرہ افشاں تھا چمن میں ہر طرف فیضِ سحاب

علم کی تابانیوں سے دل ترا روشن ہوا
ذرہ سورج بن گیا سورج سے کر کے اکتساب

علم عقلی اور نقلی میں کمال حاصل کیا
علم کے حلقوں میں قائم ہو گیا تھا رعب وداب

اس کمالِ علم پر بھی تشنگی تجھ میں رہی
بجھ سکا مشرق کی مینا سے نہ تیرا اضطراب

شوقِ انگریزی کا دل میں کروٹیں لینے لگا
اس زباں کے شوق نے تجھکو کیا پا در رکاب

خود ریاست میں سیاست کی فضا چھانے لگی
آگیا ظالم گریفن شہر میں بن کر عذاب

ہو گئے تھے حکمراں نوابِ صدیق الحسن
جن کے دل میں شعلہ افشاں تھا شرارِ انقلاب

ان کی تحریکات سے ہلچل مچی تھی ملک میں
آگئے جس کی بدولت دفعتہً زیرِ عتاب

یک بیک اپنے وطن کی سرزمیں کو چھوڑ کر
تو نے ٹھکرائے خوشی سے راحت و عیشِ شباب

ذوقِ علمی کیلئے تو دربدر مارا پھرا
چھا گیا ہو جیسے تجھ پر نشۂ صہبائے ناب

بمبئی میں داخلہ اسکول میں تو نے لیا
شوق تیرا دیکھ کر ہر شخص تھا حیرت مآب

راہِ ہجرت پر مسافر ہو گیا پھر گامزن
ارضِ انگلستاں بنی اب منزلِ خانہ خراب

پھر پروفیسر بنا اک مشرقی کالج کا تو!
جس کی تعلیمات میں شامل تھا اسلامی نصاب

شہرِ لندن میں بھی تو نے دیں کی تبلیغ کی
تیرا نصب العین، اجرِ آخرت، کارِ ثواب

مطلعِ چرخِ صحافت پر ہوئی تیری نمود
چھپ رہے تھے تیرے مضموں جابجا با آب و تاب

رہ کے لندن میں عیاں تجھ پہ فرنگی سامراج
آ گئے نظروں میں ان کے دجل و مکر و پیچ و تاب

قلب میں ان کے اتر کر تو نے پہچانا انھیں
ہو گئے برطانوی رازِ سیاست بے نقاب

جب نظر آئی تجھے افرنگیوں کی لوٹ مار
دل ترا بریاں ہوا اس ظلم سے مثلِ کباب

تیری تحریروں کا رخ تھا اب فرنگی سامراج
ان ہی نالوں سے بھرے تھے سب ترے چنگ و رباب

ترکیہ کے حق میں تیری آتشیں تقریر تھی
برتر و بالا گلیڈ اسٹون سے ترا خطاب

اب ہوا دشوار رہنا تیرا انگلستان میں
مائلِ پرواز تھا اب طائرِ سدرہ مآب

چھوڑ کر لندن نئی دنیا روانہ ہو گیا
ہو سکے منصوبہ آزادی کا بسکہ کامیاب

غدر نامی پارٹی قائم ہوئی اس ملک میں
جس کے ہر ہر رکن میں تھی گرمیٔ خونِ شباب

ان کی قربانی سے پودا بار ور ہونے لگا
سرزمینِ غیر میں وہ کھل اٹھا مثلِ گلاب

ناگہاں جھلسا دیا بادِ خزاں نے پھر اسے
ہو گیا ہر رکن اس کا در بدر خانہ خراب

اب مسافر کی تھی منزل سرزمیں جاپان کی
چین پر جو اپنی طاقت سے ہوا تھا فتحیاب

تو ہوا استادِ مشرق کی زبانوں کا وہاں
دلنشیں تھا درس تیرا دلکشا تیرا خطاب

ایک عرصہ تک ہا ہنگامہ پرور تو وہاں
تیری تحریروں میں پنہاں شعلۂ ہائے التہاب

تیرا موضوعِ قلم تھا سامراجی طاقتیں!
ایشیا کو تو نے دکھلائے رہِ درسِ صواب

ساحرِ افرنگ کی شہ پر ہوا اخراج پھر
جرمن و ترکی میں دیکھا تو نے آزادی کا خواب

تو نے باندھا ترکیہ کے واسطے رختِ سفر
اس سفر میں ایک ساتھی بن گیا تھا ہمرکاب

ترکیہ میں تھوڑے عرصہ تک رہا تیرا قیام
تیرے مضموں سے وہاں پیدا ہوا اک اضطراب

ترکیہ کو چھوڑ کر برلن میں تو وارد ہوا
پورا ہوتے واں نظر آیا تھا آزادی کا خواب

ہند کے آزادی خواہوں کا ہوا تھا اجتماع
شہر برلن بن گیا اب ایک مرکز کامیاب

ایک منصوبہ بنا آزاد ہندستاں کا پھر
ارضِ کابل کو کیا تھا جسکے باعث انتخاب

قیصرِ المانیہ نے وفد کی تشکیل کی
جسکے اندر تیری شخصیت بھی تابندہ شہاب

سارے یورپ میں بھڑک اٹھے تھے شعلے جنگ کے
چھا رہا ساری دنیا میں خدا کا اِک عذاب

کھلبلی سی مچ رہی تھی رزم گاہِ دہر میں
اسلحہ ہتھیار فوجیں ہر طرف تھیں بے حساب

اتحادی اک طرف تھے ترک و جرمن اک طرف
ہر طرف شور و شغب تھا ہر طرف تھا اضطراب

جرمنی سے وفد یہ ترکی روانہ ہو گیا
حضرتِ سلطاں کی خدمت میں ہوئے سب باریاب

آستانہ پر دیا سب کو خلیفہ نے پیام
شاہِ کابل کے لئے مخفی و پوشیدہ خطاب

وفد کے ہمراہ پھر کابل ہوا تیرا ورود
وہ امیدوں کا چمن وہ سرزمینِ انقلاب

شیخ سندھی بھی اسی مقصد سے آئے تھے وہاں
کر کے ہجرت ہند سے آئے تھے اربابِ شباب

انقلابِ روس نے روشن امیدوں کو کیا
اب نکلنے کو ہو جیسے حریت کا آفتاب

شاہِ کابل سبز باغ ان سب کو دکھلاتے رہے
ان کا ہر وعدہ تھا دھوکا دشت میں جیسے سراب

تخت پر بیٹھے امان اللہ غازی اسکے بعد
جگمگا اٹھے افق پر جلوہ ہائے انقلاب

ہند کی آزاد پہلی اک حکومت بن گئی
صدر تھے راجہ مہندر قائدِ عالی جناب

ہند کی پہلی حکومت کا وزیر اعظم تھا تو
ہند کی تاریخ میں ہے قابلِ فخر انتساب

یعنی سندھی اس حکومت کے وزیرِ خارجہ
جن کی شخصیت زمانہ میں مجسم انقلاب

اس حکومت کے نمائندے گئے تھے ملکوں ملک
جن کی قربانی سے تابندہ ہے آزادی کا باب

ہو گئی آخر میں لیکن ترک و جرمن کو شکست
سارا منصوبہ ہوا تھا ٹوٹ کر مثلِ حباب

سرزمینِ روس میں طرحِ اقامت ڈال دی
بن گئی سعی و عمل تیری شریکِ انقلاب

تھی دیانت پر تری لینن کو پورا اعتماد
ذات تیری ان کی نظروں میں رہی عزت مآب

روس سے جبتک امیدیں تیری وابستہ رہیں
اپنے مقصد میں رہا دن رات اندر پیچ و تاب

تھک تھکا کر روس کو آخر میں کر کے الوداع
تو ہوا یورپ کے ملکوں میں دوبارہ باریاب

برلن و پیرس میں پر غم ہو کے تو ٹھہرا رہا
چہرہ امید پر تاریکیوں کے تھے نقاب

ترک ناداں نے خلافت کی قبا جب تار تار
تو نے روحانی خلافت پر لکھی تھی اک کتاب

سامراجی طاقتوں سے عمر بھر لڑتا رہا
تو ہے اک مردِ مجاہد تو ہے مردِ انقلاب

کارنامے تیرے روشن اسقدر پھیلے ہوئے
چاہئے اس کے بیاں کو ایک طولانی کتاب

تو نے دنیا کا سفر دوبارہ پورا کر لیا
ہر حقیقت سامنے آئی تھی ہو کر بے حجاب

مسئلہ ہندوستاں کا بین الاقوامی بنا
سچ تو یہ ہے تو رہا اپنے مشن میں کامیاب

تھی مسافر کے لئے درپیش منزل آخری
ہے کتابِ زندگی کا آخری غمگین باب

پھر نئی دنیا نے اپنی سمت میں کھینچا تجھے
ملکِ امریکہ میں ہے تو آخرت تک محوِ خواب

اپنے پیمانِ وفا کو تو نے پورا کر دیا
تو رہا ہے ملک و ملت کیلئے خلنہ خراب

السلام اے ملک و ملت کے نگہباں السلام
تجھ پہ حق کی رحمتیں ہوں جلوہ افشاں السلام

وجدی الحسینی

کتابیات و حوالہ جات

۱۔	التمہید لائمۃ التجدید	عربی	مولانا عبید اللہ سندھی
۲۔	نزہۃ الخواطر	"	مولانا عبدالحیٔ حسنی
۳۔	ذاتی ڈائری	اردو	مولانا عبید اللہ سندھی
۴۔	شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک	اردو	پروفیسر غلام سرور
۵۔	نقشِ حیات	"	مولانا سید حسین احمد مدنی
۶۔	سرگذشت مجاہدین	"	مولانا غلام رسول مہر
۷۔	مشاہداتِ یاغستان	"	مولانا محمد علی قصوری
۸۔	یادِ رفتگاں	"	علامہ سید سلیمان ندوی
۹۔	علمائے ہند کا شاندار ماضی	"	مولانا محمد میاں
۱۰۔	تحریکِ شیخ الہند	"	" " "
۱۱۔	برکت اللہ بھوپالی	"	ایم عرفان
۱۲۔	آئینۂ جاپان	"	پیسہ اخبار لاہور
۱۳۔	انقلابِ روس	"	م یم جوہر مکتبہ برہان دلی
۱۴۔	انقلابِ ترکی	"	عبدالرؤف خاں عزیزی پریس آگرہ
۱۵۔	ترک اور جنگِ عظیم	"	مولوی عبدالرب اسرار کریمی پریس الٰہ آباد
۱۶۔	تاریخ الاسلام	"	احسان اللہ عباسی مطبوعہ لکھنؤ
۱۷۔	سیر حامدی	"	نواب حامد علیخاں والیٔ رامپور
۱۸۔	انقلابِ ہندوستان کا دوسرا رخ	"	مسٹر ٹامسن ترجمہ شیخ حسام الدین
۱۹۔	تاریخ انقلابِ عالم	"	ابوسعید بزمی کتاب منزل لاہور

۲۰ - تاریخ عروج عہدِ انگلیشیہ	اردو	مولوی ذکاءاللہ
۲۱ - تاریخ پاکستان و بھارت	"	سید ہاشمی
۲۲ - دوسری جنگِ عظیم	"	سردار خاں
۲۳ - ہسٹری آف یونائیٹڈ اسٹیٹ	انگلش	یو ایس اے پبلیکیشنز
۲۴ - آؤٹ لائن آف امریکہ	"	" " "
۲۵ - مائی لائف اسٹوری	"	راجہ مہیندر پرتاپ
۲۶ - مجلۂ اردو سنہ ۱۹۲ء	اردو	مضمون عبدالرحمٰن صدیقی
۲۷ - مدینہ بجنور سنہ ۱۹۲۳ء	"	مضمون شاکر حسین نکہت
۲۸ - اردوئے معلّٰی	"	مدیر حسرت موہانی
۲۹ - حیاتِ اجمل	"	قاضی عبدالغفار
۳۰ - تاج الاقبال	"	نواب شاہجہاں بیگم
۳۱ - حیاتِ سکندری	"	" سلطان جہاں بیگم
۳۲ - مآثر صدیقی	"	نواب علی حسن خاں
۳۳ - انقلابِ افغانستان	"	محمد حسین خاں
۳۴ - تاریخ افغانستان	فارسی	عَلّامہ جمال الدین افغانی مترجمہ مولوی محمود علی خاں
۳۵ افغانستان جدید	اردو	ایم - ایم فاضل
۳۶ - ہندی مملکتِ برطانیہ	انگریزی	سر الفرڈ لائل مترجمہ عبدالسلام
۳۷ - تاریخ یورپ	"	الیور تھیچر اور فرڈینڈ - مترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادی و قاضی تلمذ حسین۔
۳۸ - تاریخ انگلستان	"	مسز فشر مترجمہ مولوی ظفر علیخاں
۳۹ - تاریخ جاپان	"	لالہ دینا ناتھ لاہور
۴۰ - جاپان	"	دیوان چمن لال مترجمہ محمود علیخاں جامعی



سیّد عابد علی وجدی الحسینی قاضی شہر بھوپال

मध्य प्रदेश उर्दू अकादमी

مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی